اسلامی ریاست

تقي الدّين النبهاني

حزب التحرير

پہلا ایڈیشن: 1372ھ -- 1953ء
ساتواں ایڈیشن: 1423ھ -- 2002ء

عربی سے اُردو ترجمہ - 2010ء

فہرستِ مضامین

باب	صفحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

((تكون النبوة فيكم ما شاء اللّٰهُ أن تكون ثُمَّ يرفعها اللّٰهُ إذا شاء أن يرفعها ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَا فةً عَلَى منهاج النبوة فتكون ما شاء اللّٰه أن تكون ثُمَّ يرفعها اللّٰه إذا شاء أن يرفعها ثُمَّ تكون ملكاً عاضاً فتكون ما شاء اللّٰه أن تكون ثُمَّ يرفعها اللّٰه إذا شاء أن يرفعها ثُمَّ تكون ملكاً جبرياً فتكون ما شاء اللّٰه أن تكون ثُمَّ يرفعها اللّٰه إذا شاء أن يرفعها ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَا فةً عَلَى منهاجِ النبوة))

''تمہارے اندر عہد نبوت موجود رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم ہوگی، جو (اس وقت تک) رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر موروثی حکومت کا دور ہوگا، جو (اس وقت تک) رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر جابرانہ حکومت کا دور ہوگا، جو (اس وقت تک) رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم ہوگی''

(مسند احمد)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

مُقَدِّمَۃ

موجودہ نسل کو وہ اسلامی ریاست یاد نہیں، جس نے اسلام کا نفاذ کیا تھا۔ اور وہ لوگ جو اسلامی ریاست کے آخری دور (یعنی خلافتِ عثمانیہ) میں موجود تھے، جس کے خلاف مغرب اپنے حملوں کے ذریعے برسرِ پیکار تھا، انہوں نے بھی بس اسلامی ریاست کا بچا کچا ڈھانچہ دیکھا، جس میں بچی کچی اسلامی حکمرانی قائم تھی۔ اس لیے آج مسلمانوں کے لیے یہ مشکل ہو چکا ہے کہ وہ اِن بوسیدہ جمہوری حکومتوں کی بجائے، جو مسلم ممالک پر تھوپ دی گئی ہیں، اِسلامی طرزِ حکومت کا تصور ذہن میں لائیں۔ کیونکہ وہ اسی فاسد جمہوری نظاموں کو پیمانہ بناتے ہوئے حکمرانی کا تصور کرتے ہیں، جو اُن پر مسلط کر دیے گئے ہیں۔ مسئلہ صرف یہی نہیں، بلکہ سب سے زیادہ مشکل کام تو اُن اذہان کی تبدیلی کا ہے جو مغربی تہذیب سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ مغربی ثقافت ہی وہ خنجر تھا کہ جس کے ذریعے اسلامی ریاست پر حملہ کیا گیا اور اسے اس بری طرح مجروح کیا یہاں تک کہ اسلامی ریاست نے دم توڑ دیا۔ پھر مغرب نے یہی خون آلود خنجر اسلامی ریاست کے بیٹوں کو بڑے فخر سے دکھایا اور کہا ہم نے تمہاری بیمار ماں کو ختم کر دیا ہے، جو ایک ماں ہونے کا حق نہیں ادا کر رہی تھی اور اب تمہارے لئے ایک ایسی زندگی ہوگی جس میں تم خوشی اور خوشحالی کے مزے لُوٹو گے۔ پھر انہوں نے مسلمانوں کو اس قاتل سے ہاتھ ملانے کی پیشکش کی جس کے خنجر پر ابھی بھی وہ خون موجود تھا جو کبھی اُن کے ماں کے جسم میں گردش کیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چرخ (ایک شکاری کُتّا جو بھیڑئے سے مشابہت رکھتا ہے) بھی اپنے شکار کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ شکار دم بخود ہو

کر اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے اور اسے اس وقت تک خبر نہیں ہوتی جب تک حملے کے نتیجے میں اس کا خون نہ بہنے لگے، یا پھر چرخ اسے کھانے کے لیے کسی وادی میں نہ لے جائے۔

پس مغربی تہذیب سے مرعوب یہ اذہان، کیسے یہ پہچان پاتے کہ مغربی ثقافت ہی وہ خنجر ہے جس نے ان کی ماں کو ہلاک کیا تھا اور اب وہی خنجر ان کی اپنی زندگی بلکہ پورے وجود کیلئے ہی خطرہ ہے۔ مغربی افکار مثلاً وطن پرستی، دین کی دنیا کے امور سے علیحدگی اور ایسی آراء جن میں اسلام پر تنقید اور حملہ کیا گیا ہے اس زہر کی مثالیں ہیں جو اس ثقافت نے مسلمانوں کے اذہان میں انڈھیل دیا ہے۔ اس کتاب کا ایک باب جو مغربی مشنریوں سے متعلق ہے، ایسے اعداد و شمار اور حقائق سے لبریز ہے۔ یہ باب قاتل کی اصل نیت اور جرم کے محرک کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اُن اسالیب و ذرائع پر بھی روشنی ڈالتا ہے، جو قاتل نے اپنے اس مقاصد کیلئے اپنائے۔ مغرب کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ اسلام کو ختم کر دیں اور اس مقصد کیلئے اُس نے اِس صلیبی معرکے میں مغربی ثقافت کو مؤثر ترین ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

مسلمانوں کو مغربی ثقافت کے سیاسی خطرات کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ ایک طرف تو مسلمان استعماری قوتوں کے تسلط کے خلاف مزاحمت اور لڑائی کر رہے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اُنہی کی مغربی ثقافت کو بھی اپنا لیا تھا، جبکہ یہ ثقافت ہی مسلمانوں کی سرزمین میں استعمار کے جڑ پکڑنے کی اصل وجہ تھی۔ المیہ یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں نے دشمن سے معرکہ آرائی کی لیکن دوسری طرف وہ مغرب سے بغل گیر ہوئے اور اُن کا لایا ہوا زہر اس وقت تک سیر ہو کر پیا جب تک کہ وہ گھائل ہو کر گر نہ پڑے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ میدانِ جنگ میں حملے کا شکار ہوئے ہیں، جبکہ حقیقت میں وہ اپنی گمراہی اور بے خبری کا شکار ہوئے تھے!

وہ حملہ آور کیا چاہتے تھے: ایک ایسا ملک بنانا جس کی بنیاد اسلام نہ ہو یا مسلم علاقے پر کئی مما لک! مغرب نے عملی طور پر مسلمانوں پر حاکم بننے کے بعد اپنی وہ مہم پوری کر دی جس کے تحت اسلام کو حکومت سے بے دخل کر دیا گیا، مسلم علاقوں کے حصے بخرے کر دیے، اور مسلمانوں کو ایسی

حکمرانی کے دھوکے میں مشغول کر دیا جو برائے نام تھی۔ وقت بوقت مغرب مسلمانوں کے مزید ممالک قائم کرتا ہے۔ اور جب تک مسلمان مغربی مفہوم وتصورات اوراصولوں سے چمٹے رہیں گے، وہ مزید ایسا کرنے پر کمر بستہ رہے گا۔

اس وقت مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کئی ریاستیں بنیں، بلکہ یہ ہے کہ تمام مسلم علاقوں پر ایک ہی ریاست قائم ہو۔ نہ کہ کوئی ایسی ریاست جوخود کواسلامی ریاست کہے مگر اسکے قوانین ان احکامات سے مختلف ہوں، جواللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جاری کئے ہیں، نہ ہی ایسی ریاست جوخود کواسلامی ریاست کہے اوراسلامی احکامات نافذ بھی کرے لیکن بغیر اُس اسلامی فکری قیادت کے جس کے مسلمان حامل ہیں۔ یہاں اہم نکتہ یہ ہے کہ محض نام نہاد، برائے نام اور متعدد اسلامی ریاستیں نہیں بلکہ ایک اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی طرزِ زندگی کا احیاء کرے، جسکی بنیاد اسلامی عقیدہ ہو اور جو اسلام کا مکمل نفاذ کرے۔ اور جب یہ عقیدہ لوگوں کے دل ودماغ میں مضبوطی سے پیوست ہوجائے تو یہ ریاست اسلام کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔

اسلامی ریاست محض ایک خواب نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی خیالی تصور ہے، یہ تو تیرہ سو سال سے زائد عرصے تک تاریخ پر اثر انداز اور غالب رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت رہی ہے اور ہمیشہ ایک حقیقت رہے گی۔ اسکے وجود کے عناصر اس قدر قوی ہیں کہ انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان سے معرکہ آرا ہوا جا سکتا ہے۔ روشن فکر لوگ اسے اپنا چکے ہیں اور یہ امت کی خواہش ہے، جو اسلام کے عروج واقبال کی منتظر ہے۔ اسلامی ریاست محض ایک خواب ہی نہیں ہے کہ صرف جسکی تعبیر کیلئے یہ ریاست قائم کی جائے، بلکہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم ہے جو اس نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس فرض کی تکمیل کی جائے۔ اور اللہ ﷻ نے اس فرض سے غفلت برتنے والے لوگوں کو عذاب سے خبردار کیا ہے۔

مسلمان کیسے اللہ ربّ العزت کی خوشنودی حاصل کر پائینگے اگر ان کے ممالک میں اللہ ﷻ کا کلمہ بلند نہیں۔ اور نہ ہی، اللہ ﷻ، اسکے رسول ﷺ اور مومنوں کیلئے عزت ہے؟ وہ کیسے

اسکے عذاب سے بچ پائینگے جب وہ ایسی اسلامی ریاست قائم نہیں کرتے جو جہاد کیلئے افواج کو تیار کرے، اپنی سرحدوں کی حفاظت کرے، اللہ کے قوانین کو نافذ کرے، اسکے نازل کردہ احکامات کو جاری وساری کرے؟ چنانچہ مسلمانوں پر اسلامی ریاست کو قائم کرنا لازم ہے، کیونکہ اس کے بغیر اسلام کا وجود موثر نہیں ہوسکتا، اور اسلامی سرزمین دارالاسلام نہیں بن سکتی ہیں جب تک کہ اس سرزمین پر اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکومت نہ ہو۔

اسلامی ریاست آسانی سے قائم ہونے والی نہیں ہے۔ موقع پرست اس سے کسی قسم کی امید نہ لگائیں کہ وہ اس میں کوئی عہدہ حاصل کرلیں گے۔ یہ راہ بڑی خاردار ہے، اس میں کئی خطرات، رکاوٹیں اور سخت مشقتیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑی رکاوٹ وہ مغرب نواز حکومتیں ہیں جو غیر اسلامی ثقافت اور سطحی سوچ کی حامل ہیں۔ جولوگ اسلامی ریاست کے قائم کرنے کی دعوت کی راہ پر چلیں گے، اُن کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اسلامی علاقوں میں اسلامی طرزِ زندگی کے ازسرِنو آغاز اور پوری دنیا میں اسلام کی دعوت کو پہنچانے کیلئے اتھارٹی حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حکومت کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتے، خواہ یہ پیشکش کتنی ہی دلفریب اور جاذبِ نظر لگے۔ وہ حکومت کو بھی اُس وقت تک قبول نہیں کریں گے اگر وہ اسلام کو مکمل طور پر اور یکبارگی و بلا تاخیر نافذ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔

آخری بات یہ ہے کہ اس کتاب سے مقصود یہ نہیں کہ اسلامی ریاست کی تاریخ بیان کی جائے بلکہ اس کتاب کا مقصد اسلامی ریاست کے قیام کیلئے رسول اللہ ﷺ کے طریقِ کار کو بیان کرنا، اور اس ریاست کو ختم کرنے کیلئے کافر نوآبادیاتی استعمار کے سازشوں پر روشنی ڈالنا ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اب مسلمانوں کو کس طرح اپنی ریاست کا احیاء کرنا ہے تا کہ وہ روشنی جس نے انسانیت کے تاریک ترین دور میں اقوام کی ہدایت کا سامان کیا وہی دوبارہ انسانیت کی ہدایت کا باعث بنے۔

باب نمبر 1

نقطۂ آغاز

جب اللہ کے رسول ﷺ اللہ کی طرف سے تمام انسانیت کیلئے اسلام کا پیغام لیکر آئے تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے اپنی زوجہ خدیجہ الکبریٰؓ کو دعوت دی، وہ ایمان لے آئیں۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے چچازاد بھائی علی رضی اللہ عنہ کو اسلام کی دعوت دی، وہ بھی ایمان لے آئے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے غلام زید رضی اللہ عنہ کو دعوت دی، انہوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اسکے بعد آپ ﷺ نے اپنے رفیق اور دوست ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دعوت دی، انہوں نے بھی یہ دعوت قبول کر لی۔ اسکے بعد آپ ﷺ نے اورلوگوں کو اسلام کی طرف بلایا، بعض نے قبول کیا اور بعض نے انکار کر دیا۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو انہوں نے اپنے ایمان لانے کی خبر اُن لوگوں کو دی جن پر اُنہیں اعتبار تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اپنے لوگوں میں معتبر مقام تھا اور لوگ ان کا ساتھ پسند کرتے تھے اور اپنے معاملات میں اُن سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ اُن کے ذریعے عثمان بن عفان، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم اسلام لانے پر راضی ہوئے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے، ان سب نے اسلام قبول کیا اور اللہ کی عبادت کی۔ پھر عامر بن الجراح (ابوعبیدہ) رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، پھر عبداللہ ابن عبد الأسد (ابو سلمہ)، الارقم بن ابی الارقم، عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم اسلام میں داخل ہوئے۔ لوگ اسلام میں داخل ہوتے رہے یہاں تک کہ مکہ میں ہر جگہ اسلام عام ہو گیا اور یہ قریش کے درمیان گفتگو کا موضوع بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ دعوت کے اس ابتدائی دور میں لوگوں کے گھر جا کر انہیں اللہ کے احکامات بتاتے۔ آپ ﷺ انہیں بتاتے کہ اللہ ہی عبادت کے لائق ہے اور وہ اس کی عبادت میں کسی اور کو

شریک نہ کریں۔ پھر آپ ﷺ نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل میں کھلے طور پر اہلِ مکہ کو اللہ کے دین کی طرف بلایا:

﴿يَاۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَاَنْذِرْ﴾

''اے کپڑا اوڑھنے والے، اٹھو اور لوگوں کو خبردار کردو'' (المدثر:2-1)

آپ ﷺ لوگوں سے خفیہ طور سے ملتے، انہیں دین کی دعوت دیتے اور اسلام پر جمع کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے اصحابِ کرام مکّہ کے باہر پہاڑیوں میں چھپ کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ جب کوئی شخص اسلام میں داخل ہوتا تو آپ ﷺ اس شخص کو کسی اور صحابی کے پاس بھیج دیتے تاکہ وہ اپنے نئے ساتھی کو قرآن سکھائے۔ آپ ﷺ نے خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا کہ وہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر سعید رضی اللہ عنہ کو قرآن سکھائیں۔ عمر رضی اللہ عنہ اسی حلقے میں اسلام میں داخل ہوئے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے وہاں پہنچنے سے آپ کی بہن اور بہنوئی کو بہت حیرت ہوئی تھی۔ پھر آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ کافی نہیں ہے چنانچہ آپ ﷺ نے ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر کو اس نئی دعوت کا مرکز بنایا۔ آپ نے اس جگہ پر مسلمانوں کو قرآن سکھاتے، انہیں اسلام کی تعلیم دیتے اور انہیں قرآن کی تلاوت کرنے اور اسے سمجھنے کی ترغیب دیتے۔ جب کوئی شخص حلقہ بگوشِ اسلام ہوتا تو آپ اسے اسی دارالارقم میں شامل کردیتے۔ مسلمانوں کے حلقوں کو اسلام سکھانا، انہیں نماز پڑھانا، راتوں کو تہجد پڑھنا، نماز اور تلاوت کے ذریعہ روحانیت کو تقویت دینا، ان کے فکر کے طریقہ میں بہتری لانا، اللہ کی آیات اور اس کی مخلوقات پر غور وخوض کرنا، ان میں قرآن کے الفاظ و معانی کا فہم پیدا کرنا اور اُنہیں اسلامی افکار میں ڈھالنا، تین سال تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ آپ ﷺ نے انہیں تربیت دی کہ کس طرح اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے مصیبتوں پر صبر کیا جاتا ہے۔ یہی احوال اس وقت تک رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آ گیا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾

''پس آپ اس حکم کو جو آپ کو دیا جارہا ہے، بے دھڑک سنادیں اور مشرکوں کا ذرا خیال نہ کرو'' (الحجر:94)

باب نمبر 2

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گروہ تیار کرنا

اپنی دعوت کے ابتدائی دور میں آپ ﷺ نے لوگوں کی عمر، حیثیت، جنس، اصل اور نسل سے قطع نظر ہر اُس شخص کو دعوت دی جس میں آپ ﷺ نے اسے قبول کرنے کی استعداد دیکھی۔ آپ ﷺ لوگوں کو چن کر نہیں بلاتے تھے بلکہ ہر ایک کو دعوت دیتے اور اس شخص میں دعوت کی قبولیت کے آثار کو بھانپ لیتے تھے۔ اس طرح کئی لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ اِن لوگوں کی اسلامی تربیت بڑی فکرمندی سے کرتے اور اُنہیں قرآن کی تعلیم دیتے۔ یوں آپ ﷺ نے صحابہ کا ایک گروہ تیار کیا تاکہ وہ دین کی دعوت آگے بڑھائیں۔ یہ تعداد چالیس کے قریب ہوگئی جس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، اگرچہ زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔ ان میں امیر، غریب، کمزور اور طاقت ور سبھی شامل تھے۔ مومنین کی یہ جماعت جس نے اسلام کو قبول کیا اور جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دعوت کی راہ پر چلے، ان افراد پر مشتمل تھی:

1) علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ (عمر 8 سال)
2) زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ (عمر 8 سال)
3) طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ (11 سال)
4) ارقم بن ابی الأرقم رضی اللہ عنہ (عمر 12 سال)

5) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (عمر 14 سال)

6) سعید بن زید رضی اللہ عنہ (20 سال سے کم)

7) سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (17 سال)

8) سعود بن ربیعہ رضی اللہ عنہ (17 سال)

9) جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (18 سال)

10) صہیب الرومی رضی اللہ عنہ (تقریبا 20 سال)

11) زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ (تقریباً 20 سال)

12) عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (تقریباً 20 سال)

13) طلیب بن عمیر رضی اللہ عنہ (تقریباً 20 سال)

14) خباب بن الارت رضی اللہ عنہ (تقریباً 20 سال)

15) عامر بن الفہیر ۃ رضی اللہ عنہ (تقریباً 23 سال)

16) مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ (24 سال)

17) مقداد بن الأ اسود رضی اللہ عنہ (24 سال)

18) عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ (25 سال)

19) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (26 سال)

20) ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ (27 سال)

21) عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ (27 سال)

22) ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ (30 سال)

23) بلال بن رباح رضی اللہ عنہ (30 سال)

24) عیاش بن ربیعہ رضی اللہ عنہ (30 سال)

25) عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ (تقریباً 30 سال)

26) نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (30 سال)
27) عثمان بن مظعون بن حبیب رضی اللہ عنہ (30 سال)
28) عبداللہ بن مظعون بن حبیب رضی اللہ عنہ (17 سال)
29) قدامہ بن مظعون بن حبیب رضی اللہ عنہ (19 سال)
30) السائب بن مظعون بن حبیب رضی اللہ عنہ (20 سال)
31) ابوسلمہ عبداللہ بن الأسد المخزومی رضی اللہ عنہ (تقریباً 30 سال)
32) عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (30 سال)
33) عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ (30 تا 40 سال کے درمیان)
34) ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ (37 سال)
35) حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (42 سال)
36) عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ (50 سال)

اِن کے علاوہ عورتیں بھی تھیں جنہوں نے اسلام کی پکار پر لبیک کہا۔ جب تین سال کی محنت سے صحابہ اسلامی ثقافت میں پختہ ہو گئے، اوران کی عقلیت اسلامی عقلیت بن گئی اوران کی نفسیت اسلامی نفسیت بن گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان حاصل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی فکر کی پختگی اورعمل کی بلندی پر مطمئن تھے اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کوان کے اعمال پر اللہ کے ساتھ تعلق کے ادراک کا اثر نمایاں طور پر نظر آرہا تھا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر مندی کم ہوئی اورآپ کو اطمینان ہوا کہ یہ جماعت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم آتے ہی مکہ کے معاشرے کے سامنے اپنے دین کی دعوت لے کر کھڑی ہو جائیگی۔

باب نمبر 3

دعوت کا معاشرے میں قدم رکھنا

اسلام کی دعوت کو لوگ اس دن سے جانتے تھے جس دن رسول اللہ ﷺ یہ پیغام لے کر اٹھے تھے۔ ملّہ کے لوگ جانتے تھے کہ محمد ﷺ ایک نئے دین کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور کئی لوگ آپ ﷺ کے ساتھ بھی ہو گئے ہیں۔ اہلِ مکہ یہ بھی جانتے تھے کے آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کا گروہ تیار کرر ہے ہیں اور یہ لوگ اس نئے دین کو قبول کرنے کی بات قریش پر ظاہر نہیں کر رہے ہیں۔ اہلِ مکہ اس نئے دین کی دعوت کو تو محسوس کرر ہے تھے اور ان لوگوں کے وجود کو بھی محسوس کرر ہے تھے جو اس پر ایمان لا چکے تھے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کس کس نے اسلام قبول کرلیا ہے اور یہ لوگ کہاں جمع ہو کر دین سیکھتے ہیں۔ اس لئے جب آپ ﷺ نے با قاعدہ دین کی طرف بلایا تو یہ لوگوں کیلئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اہلِ مکہ کو جس چیز نے چونکا دیا وہ مسلمانوں کا ایک نئی جماعت کی شکل میں اُبھر کر سامنے آنا تھا۔ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور ان کے تین دن بعد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو تقویت ملی اور پھر اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا:

﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ○ اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ ○ الَّذِيۡنَ يَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ﴾

''پس آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے اسے واشگاف بیان کر دو اور مشرکین کا ذرا خیال نہ کرو۔ مذاق

اڑانے والوں کیلئے ہم آپ کی طرف سے کافی ہیں، جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ٹھہراتے ہیں، پس عنقریب اُنہیں ان کی باتوں کا انجام معلوم ہو جائے گا'' (الحجر:96-94)

اب اللہ کے حکم کے مطابق آپ ﷺ نے اس جماعت کو اہلِ مکہ کے سامنے ظاہر کیا۔ اس جماعت کو آپ ﷺ نے دو صفوں میں منظّم کیا، ایک صف کی قیادت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور دوسری کی قیادت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کی۔ قریش نے کبھی ایسی صف بندی اور نظم دیکھا نہ تھا۔ آپ ﷺ انہیں لے کر کعبہ تشریف لائے اور سب نے کعبہ کا طواف کیا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب اسلام کھل کر سامنے آیا اور پہلا خفیہ دور ختم ہو گیا، جس میں دعوت صرف اُن لوگوں کو دی جاتی تھی جن سے پہچان تھی اور ان لوگوں میں اس دعوت کو قبول کرنے کی استعداد دیکھائی دی تھی۔ اب وہ دور شروع ہوا جس میں لوگوں سے عام خطاب کیا گیا۔ اس طرح معاشرے میں ایمان اور کفر کے مابین ٹکراؤ کا آغاز ہوا اور صحیح اسلامی افکار اور فاسد کفریہ تصورات کے مابین مقابلہ آرائی پیدا ہو گئی۔ یہاں سے دوسرے دور کا آغاز ہوا یعنی تفاعُل اور جدوجہد کا دور۔ اس دور میں مشرکینِ قریش نے دعوت کی مزاحمت کرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ اکرام کو ایذیتیں دینا شروع کر دیں۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف طریقوں سے اذیتیں دی جاتی تھیں۔ یہ دور مشکل ترین دور تھا۔ آپ ﷺ کے گھر پر پتھراؤ بھی ہوا، ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل آپ ﷺ کے گھر کے سامنے کچرا اور گندگی پھینک دیتی، جبکہ آپ ﷺ نے اس سب کو نظر انداز کرتے رہے۔ ابو جہل نے ایک دفعہ اپنے بتوں پر قربان کی گئی بھیڑ کا رحم آپ ﷺ پر پھینک دیا، آپ ﷺ نے اسے بھی برداشت کیا اور آپ اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے تا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اس نجاست کو آپ سے دور کر دیں۔ اس تمام نے آپ ﷺ کے صبر میں اضافہ کیا اور دعوت کے عزم کو مضبوط تر کر دیا۔ قریش کا ہر قبیلہ مسلمانوں کو دھمکاتا اور ایذائیں پہنچاتا، تا کہ اس قبیلے میں جو کوئی اسلام کی دعوت کو مان چکا ہو وہ اس سے پھر جائے۔ ان میں سے ایک نے اپنے غلام بلال رضی اللہ عنہ کو گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر بھاری پتھر صرف اس وجہ سے رکھا کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ اس حالت میں بھی

''اَحد اَحد ''(ایک ہے، ہاں اللہ ایک ہے) کہتے رہے اورانہوں نے اس تمام تر تکلیف کو اللہ کی خاطر برداشت کیا۔ ایک مسلم خاتون کو اتنی اذیتیں دی گئیں کہ وہ تاب نہ لا سکیں اور موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ یہ اذیتیں انہیں محض اس وجہ سے دیں گئیں کہ انہوں نے اسلام کا دامن چھوڑ کر اپنے باپ دادا کے دین کو اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے ہر قسم کی مصیبتیں، اذیتیں، ذلتیں اور محرومیاں برادشت کیں، ان تمام تکالیف کو برداشت کرنے کا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

باب نمبر 4

اسلامی دعوت کی مخالفت

جب رسول اللہ ﷺ دینِ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو ابتداء میں لوگوں نے آپ ﷺ اوران کے پیغام کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ اور قریش نے اس صورتِ حال کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کہ دانشوروں اور راہبوں کی گفتگو کی طرح یہ دعوت بھی اپنا اثر خود کھو دیگی اور لوگ دوبارہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آئینگے۔ اسی وجہ سے وہ ایک مدت تک اس دعوت کو نظر انداز کرتے رہے بلکہ جب آپ ﷺ قریش کی مجالس کے قریب سے گزرتے تو یہ لوگ کہتے کہ وہ دیکھو عبدالمطلب کا بیٹا جا رہا ہے جس کے ساتھ آسمانوں سے بات ہوتی ہے! لیکن کچھ عرصے بعد بعد جب قریش نے اس دعوت کو اپنے لئے خطرہ محسوس کیا تو انہوں نے مخالفت اور دشمنی ٹھان لی۔ ابتداء میں تو یہ مخالفت رسالت کے دعوے کی تضحیک و تذلیل تک محدود رہی، لیکن پھر انہوں نے آپ ﷺ کو چیلنج کیا کہ اگر آپ ﷺ سچّے ہیں تو اپنے دعوے کی تصدیق کیلئے کوئی معجزہ دکھائیں۔ وہ کہتے کہ یہ صفاء اور مروہ کی پہاڑیوں کو سونے میں کیوں تبدیل نہیں کر دیتے؟ جو کتاب اِن پر نازل ہوئی ہے وہ آسمان سے لکھی ہوئی صورت میں کیوں نہیں اترتی؟ وہ جبریلؑ جن کی یہ بات کرتے ہیں، وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟ یہ مردوں کو زندہ کیوں نہیں کرتے؟ مکّہ کے اطراف سے پہاڑوں کو ہٹا کیوں نہیں دیتے؟ یہ جانتے ہیں کہ ہمیں پانی کی کتنی قلت رہتی ہے تو پھر یہ زمزم کی طرح پانی کا کنواں کیوں

نہیں کھودتے؟ انہیں اللہ اشیاء کی مستقبل کی قیمتیں کیوں نہیں بتاتا، تاکہ ہم بھی اس خبر سے کوئی فائدہ حاصل کرسکیں؟ اس طرح قریش آپ ﷺ کا اور اسلام کی دعوت کا مذاق اُڑایا کرتے، کبھی ہتک آمیز کلمات سے، کبھی جلی ہوئی باتوں سے اور کبھی طنز سے۔ لیکن آپ ﷺ اپنے مقصد سے ذرا بھی نہیں ڈگمگائے اور لوگوں کو برابر اللہ کے دین کی طرف بلاتے رہے۔ آپ ﷺ قریش کے بتوں کو تنقید کا نشانہ بناتے اور ان لوگوں کی سطحی سوچ اور بے وقوفی کو آشکار کرتے جو بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اِن سے امیدیں لگاتے تھے۔ اب یہ قریش کی قوتِ برداشت سے باہر ہو رہا تھا، پس اُنہوں نے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا، کہ آپ ﷺ کو اس دعوت سے باز رکھا جائے، لیکن سب بے سود رہا۔ قریش نے دعوت کی اس مخالفت میں جو حربے استعمال کیے وہ یہ تھے:

1) تشدد

2) اندرونی وبیرونی طور پر دعوت کے خلاف پراپیگنڈہ

3) بائیکاٹ

رسول اللہ ﷺ کو اپنے خاندان کی طرف سے میسر حفاظت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرفداری کے باوجود تشدد جھیلنا پڑا۔ قریشِ مکہ نے ہر طرح کا تشدد آزمایا حتیٰ کہ وہ اس خبیث کام میں ماہر ہو گئے۔ آلِ یاسر کو اسلئے تشدد جھیلنا پڑا کہ قریش چاہتے تھے کہ وہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آئیں۔ لیکن ان مصائب نے ان کے ایمان اور ثابت قدمی میں مزید اضافہ کیا۔ ایک بار جب آپ ﷺ کا آلِ یاسر پر گزر ہوا، ان پر تشدد کیا جا رہا تھا، آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا:

((صبراً آل یاسر فإن موعدكم الجنة اني لا املك لكم من الله شيئاً))

''اے آلِ یاسر! صبر کرو تمہارے لیے جنت ہے اور تمہارا مقدر اللہ کے پاس ہے''

اس پر سمیہؓ نے فرمایا:

(اني اراها ظاهرة يا رسول الله)

''اے اللہ کے رسول ﷺ میں جنت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی ہوں''

اس طرح قریش آپ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ پر تشدد کرتے رہے، تاہم انہیں احساس ہوا کہ اب محض جسمانی ایذائیں کافی نہیں ہیں اور اس دعوت کو روکنے کیلئے کسی اور حربے کا سہارا لینا پڑیگا۔ اب قریش نے باقاعدہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا جس میں آپ ﷺ کی دعوت اور مسلمانوں کو توہین کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ پروپیگنڈہ مکہ کے علاوہ بیرونی علاقوں میں بھی کیا گیا، جیسا کہ حبشہ۔ اس میں بحث وتکرار، دعوت کی تضحیک اور الزام تراشی جیسے حربے شامل تھے۔ یہ الزام تراشی اسلامی عقیدے اور آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک پر کی گئی، اور اس میں جھوٹ کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ مختلف طریقوں سے مکہ اور مکہ سے باہر اسلامی دعوت اور آپ ﷺ کو غیر معتبر ظاہر کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ الزام تراشی خاص طور پر حج کے موسم میں کی جاتی۔ اس حد تک کہ قریش کے لوگ ولید بن مغیرہ کے پاس مشورے کے لیے آئے کہ حج کے موسم میں مکہ آنے والے عرب قبائل سے محمد کے بارے میں کیا کہا جائے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ محمد کے متعلق کہا جائے کہ وہ کاہن ہیں، اس پر ولید بن مغیرہ نے کہا کہ یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ محمد نہ تو کاہنوں کی طرح بڑبڑاتے ہیں اور نہ اُنکی باتیں کاہنوں کے منتر کی سی ہیں چنانچہ ولید نے یہ مشورہ رد کر دیا۔ کچھ نے کہا کہ محمد کو دیوانہ قرار دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ ان پر جنوں کا اثر ہے۔ ولید نے اس مشورے کو بھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ محمد سے ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہے کہ جس کی بنا پر اس الزام کو موزوں سمجھا جائے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ پر جادوگر ہونے کی تہمت لگائی جائے، تو ولید نے اسے بھی رد کر دیا کیونکہ آپ نہ تو گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور نہ ہی اُن کے عمل میں ایسی کوئی بات ہے جسے لوگ جادو ماننے کو تیار ہوں۔

پس لمبی چوڑی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو لفظوں کا جادوگر (ساحر البیان) بتایا جائے۔ پھر یہ لوگ حج کے موقع پر عرب سے آنے والے وفود میں پھیل گئے اور اہل عرب کو خبردار کیا کہ محمد کی بات نہ سنو کیونکہ اُنکے کلام میں جادو ہے، وہ اپنے اس سحر سے لوگوں میں تفرقہ ڈال کر ایک شخص کو اپنے بھائی، اپنے باپ، اپنی بیوی اور خاندان سے جدا کر دیتے ہیں

اورلوگوں کوڈرایا کہ جوکوئی اُنکی بات سنے گا تو وہ اُن کے اثر میں آکر اپنے خاندان سے علیحدہ ہو جائیگا۔ بہرحال یہ پروپیگنڈا بھی اسلام کی دعوت کے لوگوں تک پہنچنے کو نہ روک سکا۔ اب قریش نضر بن الحارث کے پاس گئے اور اسے یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف اس پروپیگنڈے کا محاذ سنبھالے۔ نضر کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ جب کبھی آپ ﷺ کسی مجلس کو مخاطب کرتے اور اللہ کے دین کی دعوت دیتے، تو وہ تاک میں رہتا اور جیسے ہی آپ کی بات ختم ہوتی اور آپ روانہ ہوتے تو وہ ان لوگوں سے مخاطب ہوتا اور اُنہیں اہلِ فارس کے قصّے اور اُنکے مذہب کے بارے میں کہانیاں سنانے لگتا اور پھر کہتا: ''کیا محمد ﷺ مجھ سے بہتر کہانیاں سناتے ہیں؟ کیا وہ بھی میری طرح پرانے قصے نہیں سناتے؟'' قریش نے ان قصوں کہانیوں کو لوگوں میں پھیلایا۔ اسی طرح انہوں نے لوگوں میں یہ بات پھیلائی کہ جو کچھ آپ ﷺ کہتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ نہیں، بلکہ دراصل جبر نامی عیسائی انہیں یہ بتاتا ہے۔ آپ ﷺ کے بارے میں یہ افواہیں عربوں میں کافی عام ہوئیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کیا اور یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ﴾

''ہمیں معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ''اسے تو بس ایک آدمی سکھا تا پڑھاتا ہے حالانکہ جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے، جبکہ یہ قرآن صاف عربی زبان ہے'' (النحل: 103)

عرب میں قریش کی یہ مخالفت جاری رہی، لیکن اہلِ قریش نے بس اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ جب اُنہیں پتہ چلا کہ بعض مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے ہیں تو قریش نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کیلئے اپنے دوسفیر حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجے تاکہ نجاشی مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال دے۔ یہ دوسفیر عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ تحائف لے کر نجاشی لے پاس گئے تاکہ وہ اِن تحائف سے خوش ہو اور مسلمانوں کو مکہ واپس بھیج دے۔ ان سفیروں نے نجاشی سے کہا: ''اے شاہِ حبشہ! ہمارے کچھ دیوانے لوگ آپ کے ملک آ گئے ہیں، وہ ہمارے دین سے

پھر گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی شامل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اُنہوں نے اپنا ایک دین گھڑ لیا ہے جس کے بارے میں نہ ہم کچھ جانتے ہیں اور نہ ہی آپ اس دین سے واقف ہیں۔ ہمیں ہماری قوم کے شریفوں نے اور اُن کے باپوں، چچاؤں اور اہلِ خانہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے تا کہ ہم اُنہیں لے جا کر اُن کے اہل تک لوٹا دیں۔ پس آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں کیونکہ ان کے اپنے لوگ ان کی خرابیوں کے متعلق سب سے زیادہ آگاہ ہیں''۔ نجاشی نے مسلمانوں کو طلب کیا تا کہ خود اُن سے اس معاملے کے بارے میں دریافت کرے۔ اس نے مسلمانوں سے پوچھا: ''یہ کیا دین ہے جس نے تمہیں اپنی قوم سے علیحدہ کر دیا ہے اور نہ تم میرے دین میں داخل ہوئے ہو اور نہ ہی تم موجودہ دینوں میں سے کسی دین پر ہو؟''۔ مسلمانوں میں سے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور بتایا کہ پہلے یعنی دورِ جاہلیت میں وہ کیسے تھے، اُن میں کون کون سی بری صفات تھیں، پھر انہوں نے نجاشی کو بتایا کہ اسلام کیا ہدایات لے کر آیا اور اپنے ماننے والوں کو کیسا بنا دیا ہے۔ پھر آپؓ نے قریش کی ایذا رسانیوں کا ذکر کیا، اُن کے قہر اور ظلم کے بارے میں بتایا جو قریش نے مسلمانوں کو اُن کے دینِ ہدایت سے دور کرنے کیلئے کئے تھے۔ پھر جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کے بعد ہم نے اپنے وطن کو چھوڑ کر آپ کے ملک میں رہنا پسند کیا، اس امید پر کہ یہاں ہمارے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔ نجاشی نے جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا تمہارے پاس وہ کلام ہے جو تمہارے رسول پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، مجھے وہ پڑھ کر سناؤ''۔ جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں۔ اور پھر سورۂ مریم کی پہلی آیت سے تلاوت شروع کی اور اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے اس قول تک پہنچے:

﴿فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ○ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ۭ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ○ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا ○ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ○ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا﴾

''مریم نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ سب کہنے لگے کہ لو بھلا ہم گود کے بچے سے کیسے باتیں کریں؟ بچہ بول اٹھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا

پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ اور اس نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں بھی میں ہوں، اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک بھی میں زندہ ہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا ہے اور مجھے سرکش بدبخت نہیں کیا۔ اور مجھ پر میری پیدائش کے دن اور میری موت کے دن اور جس دن کہ میں دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا، سلام ہی سلام ہے‘‘ (المریم :33- 29)

عیسائی پادریوں نے سورۂ مریم کی یہ آیات سن کر نجاشی سے کہا کہ یہ کلام اور عیسیٰ مسیح جو کلام لائے تھے یہ دونوں ایک ہی چشمے کی دو نہریں ہیں۔ نجاشی نے اعلان کیا: ’’بے شک یہ کلام اور جو عیسیٰ لے کر آئے، دونوں ایک ہی چراغ کے نور ہیں‘‘۔ یہ کہہ کر نجاشی قریش کے سفیروں سے مخاطب ہوئے: ’’تم لوگ واپس جاؤ، اللہ کی قسم میں انہیں تمہارے حوالے نہیں کرونگا‘‘۔ دونوں سفیر دربار سے نکلتے ہوئے اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچتے رہے۔ دوسرے دن عمرو بن العاص پھر نجاشی کے پاس پہنچا اور اُسے ورغلایا کہ ’’یہ مسلمان عیسیٰ ابنِ مریم کے بارے میں نہایت خوفناک اور مکروہ باتیں کرتے ہیں‘‘۔ چنانچہ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو طلب کر کے اُن سے وضاحت چاہی۔ جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ’’ہم عیسیٰؑ کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی پر وحی ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عیسیٰؑ اللہ کے بندے، اسکے رسول ہیں، وہ اسکی روح اور کلام ہیں جو اللہ نے مریمؑ میں پھونکی، جو بے داغ اور پارسا تھیں‘‘۔ اس جواب سے نجاشی متاثر ہوا، اس نے چھڑی اُٹھا کر فرش پر ایک لکیر کھینچی اور جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ’’ہمارے اور تمہارے دین میں اس لکیر سے زیادہ فرق نہیں ہے‘‘۔ اس طرح قریش کے سفیر مایوس اور خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

پس جب قریشِ مکہ کے اس حربے سے بھی خلافِ توقع خاطر خواہ نتائج نہ نکلے اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی سچائی قریش کے تمام تر جھوٹ، پروپیگنڈے اور افواہوں پر حاوی ہوتی گئی، تب قریش نے تیسرا حربہ اپنایا، جو بائیکاٹ کا حربہ تھا۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے عزیز و اقارب کے مقاطعہ پر اتفاق کیا اور ایک دستاویز تیار کی، جس پر یہ معاہدہ لکھا گیا کہ بنو ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے مکمل قطع تعلقی کی جاتی ہے، ان کے ساتھ کسی قسم کی خرید و فروخت نہیں کی جائے

گی، نہ اُنکی عورتوں سے شادی کی جائے گی اور نہ اپنی عورتوں کی شادی اُن میں سے کسی کے ساتھ کی جائے گی۔ اس معاہدے کو لکھ کر کعبہ کی دیوار پر لگا دیا گیا تا کہ ہر ایک اس کی پابندی کرے۔ اس بائیکاٹ کی پالیسی سے انہیں یہ توقع تھی کہ یہ حربہ تشدد اور پروپیگنڈے کے حربے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا۔ قریش کا اندازہ یہ تھا کہ بنو ہاشم رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دینگے اور مسلمان اپنے دین سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ تنہا رہ جائینگے اور ایسی حالت میں یا تو وہ خود ہی اپنی دعوت ترک کر دینگے یا اُنکی دعوت بے اثر ہو جائیگی اور یوں قریش اور اُنکے دین کیلئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن معاملہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ اور مسلمان اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہے اور دین کی دعوت کیلئے اُنکے ارادے قوی تر ہو گئے۔ یہ حربہ اسلام کی دعوت کو پھیلنے سے روکنے میں ناکام رہا اور اس محصوری کی خبریں مکہ کے باہر دیگر قبائل تک پہنچیں اور یوں دعوت کئی قبائل تک پہنچ گئی، اور جزیرہ نما عرب کے ہر علاقے میں اسلام موضوعِ گفتگو بن گیا۔ تاہم محاصرہ جاری رہا اور قریش نے جو دستاویز لکھی تھی وہ نافذ العمل رہی اور رسول اللہ ﷺ اور ان کا خاندان اس محصوری کے تین سال کے دوران سخت عسرتوں اور فاقوں کا شکار رہا، حتیٰ کہ اکثر اوقات زندگی کی رمق بھی مسدود نظر آنے لگتی۔ یہ مسلمان محاصرے کی وجہ سے وادی سے نکل کر لوگوں سے مل بھی نہیں سکتے تھے، سوائے حج کے موسم میں، تب آپ ﷺ نکل کر کعبہ جاتے اور مکہ کے باہر سے آئے عرب قبائل کو اسلام کا پیغام سناتے اور پھر گھاٹی کی طرف لوٹ آتے۔ عرب قبائل مسلمانوں کی حال کی وجہ سے اُن سے متاثر بھی تھے، ان میں سے بعض لوگوں نے اسلام قبول کیا جبکہ بعض لوگ چپکے سے مسلمانوں کیلئے غذاء اور پانی بھی مہیا کرتے۔ ایسا ہی ایک شخص ہشام بن عمرو تھا جو ایک اونٹ پر غذاء اور پانی باندھ کر اُس وادی کے دہانے تک رات کے اندھیرے میں لے جاتا اور وہاں اس کا رخ وادی کی طرف کر کے پیچھے سے ہانک دیتا، وہ اونٹ گھاٹی میں داخل ہو جاتا اور مسلمان اس غذا کا استعمال کرتے اور پھر جب وہ ختم ہو جاتی، تو اسی اونٹ کو ذبح کر لیتے۔ اسی طرح تنگی کے یہ تین سال گزرے اور پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آئی اور یہ مقاطعہ ختم ہوا۔ قریش کے پانچ نوجوان زہیر بن ابی امیہ، ہشام بن عمرو، مطعم بن عدي، ابو

البختری بن ہشام اور زمعہ بن الأسود جمع ہوئے اور اس محصوری اور بائیکاٹ کے متعلق گفتگو کی، اس پر اپنے غصے اور ناراضگی کا اظہار کیا اور یہ طے کیا کہ وہ بائیکاٹ کے اس کے معاہدے کو ہی پھاڑ دینگے۔ اگلے دن یہ لوگ کعبہ پہنچے، پس زہیر بن ابی امیہ نے کعبہ کے گرد سات طواف کیے اور پھر لوگوں سے مخاطب ہوا اور کہا: اے اہلِ مکہ ہم کھانا کھاتے ہیں اور ہمیں لباس میسّر ہے جبکہ بنو ہاشم وہاں ہلاک ہو رہے ہیں، نہ تو کوئی اُن سے خریداری کر سکتا ہے نہ وہ کچھ خرید سکتے ہیں، اللہ کی قسم میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اس بائیکاٹ کی دستاویز کو پھاڑ نہ دوں۔ اس پر ابوجہل، جو اس وقت وہیں تھا، چلاّیا کہ یہ شخص جھوٹ بولتا ہے اور اللہ کی قسم یہ بائیکاٹ ختم نہیں ہوگا۔ باقی کے چار ساتھی جو لوگوں میں منتشر ہو گئے تھے، اپنی اپنی جگہ سے بول پڑے یہ سب غلط ہے اور اُنہوں نے زہیر بن ابی امیہ کی تائید کی۔ اس پر ابوجہل نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ لوگ پہلے ہی سب طے کر کے آئے ہیں اور اگر قوم نے اس سے اتفاق کیا اور اس نے ان کی مخالفت کی تو اس کے حق میں نتیجہ بہت برا نکل سکتا ہے پس ابوجہل نے نکل جانے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔ اب مطعم آگے بڑھا تا کہ کاغذ پر لکھے معاہدے کو اتار کر پھاڑ دے، تو پتہ چلا کہ پہلے ہی دیمک اس کاغذ کو کھا چکی ہے، ماسوائے اس حصے کے جس پر لکھا تھا: (باسمک اللھم) ''اے اللہ تیرے نام کے ساتھ (شروع)''۔ اس طرح آپ ﷺ اور مسلمان دوبارہ مکہ آئے اور یہ محصوری اور بائیکاٹ ختم ہوا۔ واپسی کے بعد آپ ﷺ پھر دعوت میں لگ گئے تا کہ اللہ کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی جائے۔ اور یوں قریش کے تینوں حربے یعنی تشدد، جھوٹا پروپیگنڈہ اور آخر میں یہ بائیکاٹ، ناکام ہو گئے، جن سے وہ نہ تو مسلمانوں کو اسلام سے ہٹا سکے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کو اسلام کی دعوت سے باز رکھ سکے۔

تفاعُلِ دعوت

اسلام کی دعوت کے ساتھ قریش کا ٹکراؤ ایک فطری چیز تھی کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی دعوت اور اپنے گروہ کو نہایت واضح کر کے اور ایک چیلنج کے طور پر قریش کے سامنے رکھا تھا۔ پھر یہ دعوت خود اپنے آپ میں قریش کیلیئے ایک چیلنج تھی کیونکہ یہ دعوت ایک اللہ کی طرف بلاتی تھی اور ایک ہی اللہ کی عبادت کا کہتی تھی، باقی تمام بتوں اور اصنام کی عبادت سے روکتی تھی اور اُس فاسد نظام کو ہٹانے کی بات کرتی تھی جس کے مطابق وہ زندگی بسر کر رہے تھے، چنانچہ یہ قریش کے ساتھ مکمل طور پر متصادم تھی۔ اور کیا یہ ممکن تھا کہ یہ ٹکراؤ وقوع پزیر نہ ہوتا جبکہ آپ ﷺ واضح طور پر اُن کے بتوں کو بے وقعت گردانتے اور جو امیدیں مشرکین نے اِن بتوں سے باندھ رکھی تھیں ان کی کھلی اہانت کرتے، اُنکی طرزِ زندگی کی برائیاں گنواتے اور ان کے ظالمانہ رسوم ورواج اور عادات کو فضول قرار دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن کی آیات نازل ہوئیں جن میں واضح طور پر قریش کو نشانہ بنایا گیا:

﴿اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ﴾

''یقیناً تم اور وہ جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو، سب جہنم کا ایندھن ہیں، تم سب اس میں داخل ہو کر رہو گے'' (الانبیا: 98)

پھر آپ ﷺ نے سود پر وار کیا جس پر مشرکین کا دارومدار تھا، چنانچہ سورۃ روم میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَآ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّيَرۡبُوَاۡ فِيۡٓ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرۡبُوۡا عِنۡدَاللّٰهِ﴾

''جو کچھ تم سود پر دیتے ہو، کہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے، تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا'' (الروم: 39)

جو لوگ لین دین اور ناپ تول میں کمی کرتے تھے اُنہیں آپ ﷺ نے ڈرایا، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ٥ الَّذِيۡنَ إذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ٥ وَ اِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ﴾

''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے۔ جو لوگوں سے ناپ لیں تو پورا لیں، مگر جب اُنہیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں'' (المطففین: 2-1)

یہی وجہ تھی کہ قریش نے آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مخالفت کی اور آپ ﷺ کا مقابلہ کیا۔ قریش نے آپ ﷺ کی ذات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلام کی دعوت کے مقابلے میں کبھی ایذا رسانی اور کبھی پروپیگنڈے اور کبھی بائیکاٹ کا حربہ آزمایا۔ جبکہ آپ ﷺ نے قریش کے غلط افکار کے خلاف اپنی جدوجہد رکھی، آپ ان کے فاسد عقائد کو مسمار کرتے رہے اور دعوت کو پھیلانے میں بھرپور کوشش صَرف کرتے رہے۔ آپ ﷺ اسلام کی دعوت بالکل واضح انداز سے دیتے، نہ کسی موضوع پر اسلام کی رائے سے کچھ چھپاتے، نہ کسی اسلامی حکم کو ہلکا کر کے بتاتے، نہ کسی اسلامی رائے کو نرم بناتے اور نہ ہی کسی کی مداہنت، چاپلوسی یا تعریف کرتے۔ آپ ﷺ نے ایسا کیا اگرچہ آپ کو قریش کی طرف سے اذیتوں کا سامنا تھا، اور باوجود یہ کہ آپ ﷺ نہتے تھے، کوئی مددگار نہیں تھا، کوئی لشکر نہیں تھا، کوئی مادی ذرائع نہیں تھے اور نہ کوئی ہتھیار تھے۔ بڑی استقامت اور مضبوط ایمان کے ساتھ، تکالیف کے خطرے سے قطع نظر، آپ ﷺ نے دین کی دعوت کو نہایت وضاحت اور بہادری کے ساتھ ایک چیلنج کے انداز میں لوگوں کے سامنے رکھا۔ اور ان تمام تر رکاوٹوں کو عبور کیا جو قریش نے آپ کے اور لوگوں کے درمیان آڑ پیدا کرنے کے لیے آپ کے سامنے کھڑی کیں تھیں۔ اور رسول اللہ ﷺ لوگوں تک پہنچنے اور انہیں اسلام کی دعوت پہنچانے میں کامیاب

رہے۔ لوگوں نے اللہ کے دین کو پہچانا کیونکہ حق بہرحال باطل پر غالب آ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اسلام کا نور عرب میں پھیلنے لگا اور کئی لوگ جواب تک بتوں کے پرستار تھے وہ اسلام کے گرویدہ ہوگئے۔ عیسائی بھی اسلام کی طرف آئے اور قریش کے کچھ بڑے لوگوں کے دل بھی قرآن سننے کی طرف مائل ہوگئے۔

عرب کا شاعر طفیل بن عمر والدوسی لوگوں میں ایک دانا، خردمند اور دانشورانہ حیثیت رکھتا تھا۔ جب وہ مکہ آیا تو قریش نے اس سے پہلے ہی ملاقات کرکے رسول اللہ ﷺ کے متعلق ڈرایا کہ یہ شخص ایسی باتیں کرتا ہے جو انسان کو اسکے اہل وعیال سے الگ کر دیتی ہیں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تم محمد کی باتوں کے سحر میں آ جاؤ اور تمہاری اور تمہارے لوگوں کی بھی وہی حالت ہو جو مکہ کے لوگوں کی ہوئی ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ نہ تم محمد سے بات کرو اور نہ اُن کی بات سنو۔ ایک دن جب وہ کعبہ گیا تو آپ ﷺ لوگوں سے مخاطب تھے، طفیل نے آپ ﷺ کی کچھ باتیں سنیں جو اسے اچھی لگیں۔ اس نے دل میں سوچا کہ میں ایک شاعر ہوں اور عقل رکھتا ہوں اور کسی اچھی بات میں اگر کوئی بری اور قبیح بات بھی چھپی ہوئی ہو، تو وہ مجھ سے چھپ نہیں سکتی، پھر مجھے اس شخص کی بات سننے سے کیا چیز روک سکتی ہے؟ اگر یہ شخص ﷺ کوئی اچھی بات کہے گا تو میں قبول کرلونگا اور اگر بات بری ہوگی تو چھوڑ دونگا۔ یہ سوچ کر طفیل آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے آپ ﷺ کے گھر تک آیا اور اپنی منشاء ظاہر کی، آپ ﷺ نے اسے اسلام کے بارے میں بتایا اور قرآن پڑھ کر سنایا، جس پر اس نے اسلام کی شہادت دی اور واپس اپنے لوگوں میں آ کر اُنہیں بھی اسلام کی دعوت دی۔

اسی طرح آپ ﷺ کے پاس بیس عیسائی حاضر ہوئے، جنہیں اسلام کی دعوت کا پتہ چلا تھا۔ یہ لوگ آپ ﷺ سے ملے، آپ ﷺ کی بات سنی، اپنے سوالات کیئے، رسول اللہ ﷺ کے جوابات سنے، اسلام کی سچائی کی شہادت دی اور مسلمانوں میں داخل ہوگئے۔ اس پر قریش بہت بھڑکے اور اُن سے بدکلامی کی، کہا کہ تم بدنصیب لوگ ہو، تمہاری قوم نے تمہیں معلومات حاصل کرنے کیلیئے بھیجا تھا اور تم نے محمد ﷺ کی بات سن کر اپنا دین چھوڑ دیا۔ اس سے اُن لوگوں پر کوئی برا

اثر پڑنے کی بجائے اُن کے ایمان میں مزید اضافہ ہوا۔ اس سے آپ ﷺ کی شہرت بڑھی اور لوگوں کو شوق ہوا کہ وہ قرآن سنیں، یہاں تک کہ قریش کے بدترین خصومت رکھنے والے لوگ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا واقعی اس دعوت میں کوئی سچائی ہے اور جو وعدہ محمد ان سے کرتے ہیں اور جس بات سے وہ ہمیں ڈراتے ہیں، کیا وہ صحیح ہے؟ پس وہ چھپ چھپ کر قرآن سننے لگے۔ ابوسفیان بن حرب، ابوجہل عمرو بن ہشام اور الاخنس بن شریق، جو ایک دوسروں کے ارادوں سے بے خبر تھے، آپ ﷺ کے گھر کے باہر اپنی اپنی جگہ چھپ کر بیٹھ گئے تاکہ رسول اللہ ﷺ کو سن سکیں۔ آپ ﷺ معمول کے مطابق شب کا ایک بڑا حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔ اللہ کی آیات نے ان کے دلوں پر اثر کیا اور وہ قرآن کی تلاوت کو سنتے رہے یہاں تک کہ صبح کی روشنی ہو گئی۔ جب وہ واپس اپنے گھر جانے کے لیے نکلے تو راستے میں ان تینوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوگئی۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور ایک دوسرے سے کہا کہ دوبارا ایسا مت کرنا، کیونکہ اگر ہمارے بے وقوف لوگوں نے یہ دیکھ لیا تو ہمارا معاملہ کمزور پڑ جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ مضبوط ہونگے۔ تاہم اگلی شب پھر یہی ہوا اور صبح جب ان لوگوں کا پھر آمنا سامنا ہوا تو انہوں نے پھر ایک دوسرے کو لعنت ملامت کی، لیکن تیسری رات بھی یہ لوگ خود کو نہ روک پائے اور ایک دوسرے کے آنے سے بے خبر پھر قرآن سننے آ گئے۔ انہوں نے محمد ﷺ کے پیغام کے مقابلے میں اپنی کمزوری کو محسوس کیا اور ایک دوسرے سے پکا وعدہ لیا کہ اب وہ دوبارا ہرگز نہیں آئیں گے۔ تاہم ان لوگوں نے جو کچھ سنا تھا اُس کے بارے میں انہوں نے آپس میں گفتگو کی۔ وہ جھنجھلاہٹ میں تھے کہ ان کے اس عمل سے اُن کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی، جو کسی قبیلے کے سردار کے شایانِ شان نہیں اور خطرہ تھا کہ اس کے نتیجے میں دوسرے لوگ محمد ﷺ کے دین کو اپنا لیں گے۔ سو قریش کی تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچتا رہا۔ جس پر قریش کے خوف میں اضافہ ہوا کہ مکہ میں دعوت کے پھیل جانے کے بعد اب یہ دعوت عرب کے دیگر قبائل میں پھیل جائے گی، پس اُن کے مظالم میں اضافہ ہو گیا، جو وہ اصحابِ رسول پر کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ حالات تنگ ہو گئے۔ اس صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ طائف تشریف لے گئے کہ اگر ثقیف

کے لوگ اسلام کی دعوت قبول کرلیں تو پھر اُن سے نصرت اور حمایت طلب کی جائے۔ اُن لوگوں نے آپ ﷺ کو سخت جواب دیا اور آپ کے ساتھ نہایت بداخلاقی سے پیش آئے۔ اُنھوں نے اپنے آوارہ اور اوباش لڑکے اور غلام آپ ﷺ کے پیچھے لگا دئے جو آپ ﷺ پر ہتک آمیز فقرے کستے تھے اور پتھراؤ کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ کسی طرح آپ ﷺ نے ایک باغ میں پناہ لی جو عتبہ اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا۔ آپ ﷺ اس صورتِ حال اور دعوت کے معاملے پر غور فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ مکہ کے کسی سردار کی حمایت کے بغیر واپس مکہ نہیں جا سکتے تھے اور اہل طائف نے جس طرح کا سلوک کیا تھا، اب وہاں جانا بھی ناممکن تھا، نہ ہی آپ اسی باغ میں بیٹھے رہ سکتے تھے کہ وہ باغ بھی دو کافر بھائیوں کا تھا۔ انتہائی کرب کی حالت میں آپ ﷺ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور نہایت رنج والم کے ساتھ، مگر اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے آپ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے عرض کی۔ آپ نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا طلب کی اور یہ دعا مانگی: ''اے اللہ! میں اپنی کمزوری، کم سامانی اور انسانوں کے آگے اپنی بے بسی کا شکوہ تجھی سے کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا ربّ ہے، تو مجھے کن کے حوالے کرتا ہے؟ اُس کے جو میرے ساتھ بُرا سلوک کریں گے یا پھر وہ دشمن جنہیں تو نے میرے اوپر حاوی کیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی اور کی پرواہ نہیں۔ تیری دی ہوئی عافیت ہی میرے لئے کافی ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور کی پناہ لیتا ہوں جو تمام اندھیروں کو چھانٹ دیتا ہے اور ساری دنیا کی چیزوں اور آخرت کو سنوانے والا ہے۔ تاکہ تیرا نور مجھ پر رہے نہ کہ تیرا غضب اور قہر۔ تجھ پر ہی میرا بھروسہ ہے یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ اور تیرے سوا کوئی طاقت اور کوئی قوت نہیں ہے''۔ پھر آپ ﷺ مطعم بن عدي کی حفاظت میں مکہ واپس تشریف لائے۔ جب قریش کو اہلِ طائف کے سلوک کا علم ہوا تو اُنکی زیادتیوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ اب وہ لوگوں کو آپ ﷺ سے بات نہیں کرنے دیتے تھے۔ اہلِ مکہ آپ سے کنارہ کش ہو گئے اور آپ کی دعوت سے کترانے کرنے لگے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے دین کی دعوت کو جاری رکھا اور اپنے آپ کو اُن قبائل پر پیش کرنے لگے جو عرب کے دوسرے حصوں سے میلوں پر اور دیگر موقعوں

پر مکہ آتے تھے، آپ انہیں اسلام کی دعوت دیتے، انہیں بتاتے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں اور ان سے تقاضا کرتے کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں۔ لیکن آپ ﷺ کا چچا عبد العزی بن عبدالمطلب یعنی ابولہب سائے کی طرح آپ کے پیچھے لگا رہتا، کہ لوگ آپ ﷺ سے بات نہ کریں۔ لوگوں نے اُس کا اثر لیا اور آپ ﷺ سے پہلو تہی کرنے لگے۔ اب آپ ﷺ نے اِن قبائل سے بات کرنے کیلئے اُن کے خیموں میں جانا شروع کیا اور ان پر اپنے آپ کو پیش کرنے لگے۔ آپ ﷺ بنو کِندہ، بنوکلب، بنوحنیفہ اور بنو عامر بن صَعصَعہ کے قبائل سے اُن کے خیموں میں جا کر ملے۔ ان میں سے کسی نے بھی آپ کی بات کو قبول نہ کیا اور غیر مناسب انداز سے اسے رد کر دیا، بلکہ بنی حنیفہ آپ ﷺ کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے۔ جبکہ بنو عامر کا مطالبہ تھا کہ وہ اس قیمت پر آپ ﷺ کی مدد کرینگے کہ اگر اُن کی مدد سے آپ فتح یاب ہو گئے تو آپ ﷺ کے بعد اقتدار اُن کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ تو اللہ کا معاملہ ہے، وہ جس کو چاہے دے''۔ یہ سن کر بنو عامر نے بھی باقی قبائل کی طرح مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اہلِ مکہ، اہلِ طائف اور یہ قبائل اسلام کی دعوت کو رد کر چکے تھے، اور جو قبائل باہر سے کسی کام سے مکہ آتے وہ بھی آپ ﷺ کے تنہاء رہ جانے کی وجہ سے آپ سے دور رہتے۔ قریش جس سے دشمنی کرتے، تو اس کے مددگار لوگ بھی اسے دشمن سمجھتے اور اس کے خلاف قریش کی مدد کرتے۔ اس امر نے رسول اللہ کی تنہائی میں مزید اضافہ کیا۔ پس مکہ اور اس کے ارد گرد اسلام کی دعوت دینا مشکل ہو گیا۔ مکہ کا معاشرہ ہٹ دھرمی اور کفر پر جما ہوا تھا جس کی وجہ سے اب مکہ میں دعوت سے متعلق امید بہت کم تھی۔

باب نمبر 6

دعوت کے دو مراحل

مکہ میں آپ ﷺ کی دعوت دو مراحل میں تقسیم تھی: پہلا مرحلہ تعلیم وتربیت اور فکری و روحانی تیاری کا مرحلہ تھا۔ اور دوسرا مرحلہ دعوت کو پھیلانے اور جدوجہد کا مرحلہ تھا۔ پہلا مرحلہ اسلامی افکار کی سمجھ پیدا کرنے، اشخاص کو ان افکار کے مطابق ڈھالنے اور ان افکار کی بنیاد پر ایک گروہ تیار کرنے کا مرحلہ تھا۔ جبکہ دوسرا مرحلہ اِن افکار کو ایک محرک قوت کے طور پر معاشرے تک پہنچانے کا تھا، جو ان افکار کو زندگی کے ہر معاملے میں نافذ کرنے کی طرف معاشرے کو دھکیلے، کیونکہ جب تک افکار معاشرے میں نافذ نہ ہوں، ان کی حیثیت محض معلومات کی ہوتی ہے۔ اور ایسی معلومات خواہ کتابوں میں ہوں یا انسانی دماغوں میں، وہ دفن خزانے کی مانند ہیں، اور ان کی کوئی حیثیت نہیں جب تک کہ انہیں کارزارِ حیات میں نافذ نہ کردیا جائے۔ ان افکار کو نافذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ افکار لوگوں میں متحرک قوت بن جائیں، معاشرے کے لوگ ان پر ایمان رکھتے ہوں، ان کو سمجھتے ہوں، ان افکار کے علمبردار بنیں اور انکے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں۔ جس سے ان افکار کا نفاذ ناگزیر ہو جائے گا اور طبعی طور پر یہ افکار نافذ ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے مکہ میں انہی خطوط پر محنت کی اور انہی دو مراحل سے گزرے۔ پہلے مرحلے میں آپ ﷺ نے مکہ میں دعوتِ اسلام رکھی، دعوت کے ماننے والوں کی فکری تربیت کی اور انہیں اسلام کے احکامات

سکھائے۔ یہ مرحلہ ایک خفیہ مرحلہ تھا جس میں آپ ﷺ اسلام کے ماننے والوں کی دارارقم میں یا کسی پہاڑ کی وادی میں تربیت کیا کرتے تھے یا پھر اُنہی کے گھروں میں کچھ لوگوں کے حلقے بنا کر کسی کو بھیج دیتے تا کہ اُن لوگوں کی اُس خاص نہج پر تربیت ہو سکے۔ یہ سب رازدارانہ طور پر ہوتا تھا۔ اس طرح ان حلقوں میں شامل مسلمانوں کے ایمان اور اسلامی عقائد روز بروز قوی تر ہوتے، آپسی تعلقات مضبوط ہوتے اور وہ مہم جو اُنہیں درپیش تھی، اس کا ادراک اُن پر عیاں ہوتا رہتا اور یہ لوگ ہر قربانی کیلئے تیار تھے۔ دعوت نے ان کے دل و دماغ میں گھر کر لیا تھا اور اسلام ان کی رگوں کا خون بن گیا تھا اور وہ اسلام کی چلتی پھرتی مثال بن گئے۔ یہ پیغام کبھی ان کی ذات تک رُکا نہیں رہ سکتا تھا، اگر چہ وہ اسے قریش سے چھپاتے تھے اور اگر چہ ان کا یہ گروہ خفیہ تھا اور وہ مخفی طور پر جمع ہوتے تھے۔ جس کسی پر انہیں بھروسہ ہوتا یا جس کسی میں وہ دعوت کی قبولیت کی استعداد دیکھتے، اس سے اسلام کی بات کرتے جس سے لوگوں کو اس دعوت اور اس گروہ کے وجود کا احساس ہوا۔ یوں دعوت نے نقطۂ ابتدا کو عبور کر لیا اور ضروری تھا کہ دعوت کو معاشرے میں اتارا جائے اور دعوت کو پیش کرنے اور تمام لوگوں کو مخاطب کرنے کی کوشش کی جائے۔ یوں پہلے مرحلے کا اختتام ہوا جو کہ خفیہ گروہ بندی اور تربیت کا مرحلہ تھا جو اس گروہ سازی کی بنیاد تھی۔ اور دعوت بدیہی طور پر دوسرے مرحلے میں داخل ہو گئی جو کہ تفاعُل (اِنٹرایکشن) اور جدوجہد کا مرحلہ تھا۔ اس میں لوگوں کو اسلام سمجھانا بھی شامل تھا، جسے بعض نے مثبت مانتے ہوئے قبول کیا اور اس جماعت کا حصہ بن گئے اور بعض نے اسے رد کیا اور اس دعوت کے افکار سے ٹکراؤ کی راہ اختیار کی۔ انسانی عقلیں کتنی ہی ہٹ دھرم کیوں نہ ہوں وہ صحیح فکر کے سامنے دروازے بند نہیں کر سکتیں، خواہ وہ اس سے فرار اختیار کریں تا کہ یہ فکر ان پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

یوں تفاعل کے مرحلے کا آغاز ہوا، اور ایک فکر کی دوسری فکر سے، اور مسلمانوں کی کفار سے پنجہ آزمائی شروع ہو گئی۔ اس مرحلے کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ اس انداز سے نکلے کہ عربوں نے اس سے قبل کبھی ایسا منظر نہ دیکھا تھا۔ رسول اللہ

ﷺ اور صحابہ نے ایک گروہ کی شکل میں کعبہ کا طواف کیا اور اپنے پیغام کا اعلان کیا۔ اور اس کے بعد سے رسول اللہ ﷺ نے عام لوگوں میں دعوت واضح، علی الاعلان اور چیلنج کے انداز میں دینا شروع کر دی۔

اب ایسی قرآنی آیات نازل ہوئیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلاتی تھیں، شرک اور بت پرستی کی مذمت کرتی تھیں اور آباؤاجداد کی اندھی پیروی پر چوٹ کرتی تھیں۔ اور ایسی آیات آپ ﷺ پر نازل ہوئیں جن میں معاشرے میں پھیلے ہوئے فاسد معاملات پر حملہ کیا گیا تھا جیسے سود کا لین دین اور ناپ تول میں کمی۔ اب دعوت کو پیش کرنے کے لیے آپ ﷺ لوگوں سے گروہوں کی شکل میں ملاقات کرنے لگے، آپ ﷺ نے اپنے قریبی عزیزوں کو گھر کھانے کی دعوت پر بلایا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اسلام کو قبول کریں، آپ لوگوں کو اسلام کی طرف رغبت دلاتے، لیکن وہ لوگ اس سب کو رد کرتے رہے۔ اب آپ ﷺ نے قریش کو صفا کی چوٹی پر بلایا اور اسلام کا پیغام دیا جسے قریش کے سرداروں نے رد کر دیا، خاص کر ابولہب نے بڑی شدّت سے اسے ردّ کیا۔ اس کے بعد اہلِ اسلام کی قریش اور دیگر عربوں سے مخاصمت مزید گہری ہوگئی۔ لیکن اس سے ایک بات یہ ہوئی کہ جو دعوتی تربیت وتَثْقِیف اب تک لوگوں کے گھروں میں حلقوں کی شکل میں یا پہاڑیوں کے دامن میں یا دارِارقم میں کی جارہی تھی، اب اس کے ساتھ معاشرتی تثقیف شروع ہوگئی۔ اور وہ دعوت جو اب تک ایسے لوگوں کو دی جارہی تھی جو قبولیت کی استعداد رکھتے تھے، اب پورے معاشرے کو دی جانے لگی اور اس نے قریش کو متاثر کیا اور جیسے جیسے قریش کو دعوت سے لاحق خطرات میں اضافہ ہوتا گیا، ان کی مخاصمت بڑھتی گئی۔ اب قریش نے محسوس کیا کہ محمد اور اس دعوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ ایسے اقدامات کرنے لگے جن سے اسلام کا سدِّ باب کیا جا سکے۔ نبی ﷺ اور صحابہ کے خلاف قریش کی اذیتوں اور ظلم میں اضافہ ہوگیا۔ لیکن معاشرتی دعوت کا انداز اختیار کرنے کا زبردست اثر ہوا اور دعوت مکہ میں پھیل گئی، ہر ایک دن کوئی نہ کوئی اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا، جس میں غریب، محروم اور مظلوم بھی ہوتے، شرفائے

مکہ بھی اور تاجر بھی، ایسے تاجر کہ جن کی تجارت انہیں حق شناسی سے اور آپ ﷺ کی دعوت سے نہ روک پاتی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے دل ودماغ نے طہارت، پاکیزگی، سچائی اور دانائی کو جانا اور بے جا ضد اور سرکشی کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا اور جیسے ہی اللہ کے دین کی دعوت اور اِس کا حق ہونا ان پر آشکارا ہوا، انہوں نے فوراً لبیک کہا۔ پس مکہ میں اسلام پھیل گیا اور مرد وعورت دونوں اس میں داخل ہوگئے۔ اگرچہ معاشرے میں عام دعوت کی وجہ سے مسلمانوں کو مشقتیں جھیلنا پڑیں تاہم اس کے ذریعے بہت زیادہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچ پایا اور بڑے اچھے نتائج مرتب ہوئے۔ اس کامیابی نے اہلِ قریش کو غضب ناک کر دیا اور اُن کے دل کھولنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے بغیر توقف کے ایک مسلسل محاذ کھول رکھا تھا، آپ ﷺ مکہ میں رائج برائیوں جیسے ناانصافی، ہٹ دھرمی اور غلامی کی رسموں کو واضح اور صریح انداز میں بے نقاب کررہے تھے اور کفار کی حقیقت اور ان کے اعمال کو بھی بے نقاب کررہے تھے۔ یہ ایک شدید ترین دور کی ابتداء تھی، ایک طرف آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور دوسری طرف کفارِ مکہ۔ اگرچہ امرِ واقع یہ ہے کہ پہلے مرحلے یعنی مرحلۂ تثقیف سے دوسرے مرحلے یعنی مرحلہ تفاعل (انٹرایکشن) کی طرف منتقلی کا دور نازک ترین دور ہوتا ہے جس میں صبر، دانائی، معاملہ سنجی اور باریک بینی سے کام لینا پڑتا ہے۔ تاہم تفاعل کا مرحلہ نہایت سخت اور شدید ہوتا ہے کیونکہ اس میں نتائج اور حالات سے بے پرواہ ہو کر اپنی بات صریح طور سے کہنا ہوتی ہے اور کفار کی طرف سے مسلمانوں کو ان کے دین کے متعلق فتنے میں مبتلا کیا جاتا ہے اور ان کے ایمان اور قوتِ برداشت کا امتحان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مرحلے میں آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسے ایسے ظلم، تشدد اور جبر کی آزمائشوں کو برداشت کیا جو ایک پہاڑ کو بھی متزلزل کر دیتیں۔ اس دوران بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، بعض ان مظالم اور جبر کو سہتے سہتے شہید ہوگئے اور بعض یہ سب صعوبتیں برداشت کرتے رہے اور اپنی دعوت میں استقامت سے لگے رہے یہاں تک کہ وہ مکہ کو اسلام کے نور سے متاثر کرنے لگے اور مکہ سے کفر کی ظلمتیں چھٹنے لگیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آپ ﷺ دارِ ارقم میں نہایت رازداری سے لگاتار تین سال تک مسلمانوں کی تربیت میں لگے رہے اور تین سال کے عرصے میں خفیہ جماعت

سازی اور تربیت کے بعد آپ ﷺ نے آٹھ سال تک اہلِ کفر کے ساتھ جدو جہد اور کشمکش کی اور اپنی نبوت کے ثبوت کے طور پر معجزات دکھائے، لیکن قریش نے مسلمانوں کے خلاف اپنی اذیتوں اور سختیوں میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ ہی اسلام کے خلاف لڑائی کے لیے ان کے جذبات میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ بہرحال قریش کے ساتھ پنجہ لڑانے کے نتیجے میں اور حج کے قافلوں کی آمدورفت کے ذریعہ جزیرہ نما عرب کے ہر کونے کو اسلام کی خبر ہوگئی اور عرب میں اسلام کا چرچا عام ہوگیا۔ لیکن یہ عرب قبائل محض تماشائی بنے ہوئے تھے اور انہوں نے دعوت کی قبولیت کی طرف کوئی قدم نہ اٹھایا، کیونکہ یہ عرب قبائل بہرحال قریش کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ پس وہ رسول اللہ ﷺ سے پہلوتہی برت رہے تھے کہ کہیں وہ قریش کے غضب سے دوچار نہ ہو جائیں۔ اس اَمر نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ پر واضح کر دیا کہ تیسرے دور یعنی اسلام کے نفاذ کے دور کی طرف منتقل ہونا اب ناگزیر ہوگیا ہے، لیکن آپ ﷺ یہ مشاہدہ کر رہے تھے کہ قریش کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مکہ میں اسلام کے نافذ ہونے کا امکان ہی نہ تھا۔ مزید یہ کہ اہلِ مکہ کے مظالم اس بات میں مانع تھے کہ مسلمان دعوت کے کام کو اور پھیلائیں اور معاملہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان ہی گھوم رہا تھا، جبکہ باقی لوگوں کی طرف سے دعوت سے پہلوتہی نے صورتِ حال کو اور سنگین بنا دیا تھا۔

باب نمبر 7

دعوتی میدان میں توسیع

طائف میں بنی ثقیف کی طرف سے اسلام کو رد کر دینے اور نہایت برا سلوک کرنے کے بعد نیز حج کے موسم کے دوران بنو عامر بن صعصعہ، بنو حنیفہ، بنو کِندہ اور بنو کلب کی طرف سے آپ ﷺ کی پیشکش کو ٹھکرا دینے کے بعد قبائل کی طرف سے مدد و نصرت کی امید باقی نہ رہی۔ دوسری طرف قریش کی طرف سے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر مظالم اور بڑھ گئے اور انہوں نے آپ ﷺ کو مزید الگ تھلگ کر دیا تاکہ دعوت آگے نہ بڑھ پائے اور باہر سے بھی کوئی مدد نہ آسکے۔ لیکن اس صبر آزما دور میں آپ ﷺ اور مسلمان بڑی استقامت سے اپنے ایمان پر ڈٹے رہے اور اُنہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کامیابی کے وعدے اور اس دین کے باقی تمام ادیان پر غالب آنے پر کبھی شک نہ ہوا۔ آپ ﷺ درپیش خطرات کو خاطر میں لائے بغیر، جہاں تک ممکن ہوا اسلام کی دعوت دیتے رہے اور حج کے موسم میں جب پورے جزیرہ نما عرب سے قبائل مکہ جمع ہوتے تو آپ ﷺ ان قبائل کو اسلام کی طرف دعوت دیتے اس بات سے قطع نظر کہ یہ قبائل آپ کی طرف بے رغبتی کا مظاہرہ کرتے یا آپ سے پہلو تہی کرتے یا آپ کو برا جواب دیتے۔ اس دوران قریش کے کچھ اوباش آپ ﷺ کو تنگ بھی کرتے لیکن اس سے آپ ﷺ کے اعتماد اور امید میں کبھی فرق نہیں آیا کہ اللہ نے آپ کو اسلام کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور بے شک اللہ ضرور آپ کی حمایت اور نصرت کریگا اور اپنے دین کو غالب کرے گا۔ آپ ﷺ دعوت کی نازک صورتحال کی فکر مندی اور قریش

کے مصائب وآلام کے باوجود اللہ کی مدد کے منتظر تھے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کو اللہ کی مدد کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور جلد ہی مدینہ سے آئے ہوئے خزرج قبیلے کے ایک گروہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح کی نشانی آ گئی۔ مدینہ کے خزرج قبیلے کے یہ لوگ حج کیلئے مکہ آئے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ اِن لوگوں سے ملے، ان سے بات کی اور اسلام کی دعوت اُن کے سامنے رکھی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کہا" اللہ کی قسم یہ تو وہی نبی ﷺ ہیں جن کے بارے میں (مدینہ کے) یہودی ہمیں ڈراتے رہتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہودی آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے میں ہم سے سبقت لے جائیں"۔ یہ کہہ کر وہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اِن لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ" ہم اپنی قوم (یعنی اوس اور خزرج) کو ان کے حال پر چھوڑ چکے ہیں، کیونکہ باہمی دشمنی اور لڑائی میں اِن جیسا کوئی اور نہ ہوگا، شاید اللہ آپ کے ذریعے انہیں متحد کر دے اور اگر ایسا ہو گیا تو آپ سے زیادہ عزت والا کوئی نہ ہوگا۔" جب یہ لوگ مدینہ واپس آئے تو انہوں نے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے متعلق بتایا اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ وہ لوگوں کے دل ودماغ اس نئے دین کے لیے کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب اوس اور خزرج کے ہر گھرانے میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ شروع ہو گیا۔

باب نمبر 8

عقبہ کی پہلی بیعت

اس واقعہ کے اگلے سال مدینہ سے بارہ افراد پر مشتمل ایک جماعت آئی۔ ان لوگوں نے حج کیا اور آپ ﷺ سے عقبہ کے مقام پر ملاقات کی۔ انہوں نے بیعت کی: ''وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرینگے، چوری نہیں کرینگے، زنا نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے، کسی پر بہتان نہیں گھڑیں گے، رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کی اطاعت کرینگے۔ اگر اُنہوں نے اِس عہد کا ایفاء کیا تو اُن کیلئے جنت ہے اور اگر اِن گناہوں میں سے کوئی گناہ کیا تو یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ اُنہیں سزا دے یا معاف کردے''۔ اپنے اس عہد کے بعد جب حج کا موسم پورا ہو گیا تو یہ لوگ مدینہ واپس لوٹ گئے۔

باب نمبر 9

مدینہ میں اسلام کی دعوت

ابنِ اسحاق نے بیان کیا ہے: جب یہ لوگ واپس مدینہ جانے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو قرآن سکھائیں، اسلام کی تعلیم دیں اور دین کے فہم سے روشناس کریں۔ آپ کو مقری یعنی معلم کے نام سے پکارا جاتا۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ میں اسعد بن زراہ کے پاس ٹھہرے۔ آپؓ لوگوں کے گھروں اور قبیلوں میں جاتے اور اُنہیں قرآن پڑھ کر سناتے اور اسلام کی طرف بلاتے تھے۔ شروع میں ایک ایک، دو دو لوگ اسلام میں داخل ہوئے، یہاں تک کہ اسلام قبیلۂ اوس میں خطمہ، وائل اور واقف کے گھروں کے سوا تمام مدینہ میں پھیل گیا۔ مصعب رضی اللہ عنہ انہیں بدستور اسلام کی تعلیم دیتے رہے اور قرآن سکھاتے رہے۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو لکھ کر اجازت چاہی کہ کیا اب وہ لوگوں کو اکٹھا کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اس بات کی اجازت دی اور لکھا کہ یہودیوں کے مقدس دن یعنی سبات کا انتظار کرو جس دن وہ زبور کی تلاوت کرتے ہیں... اُس دن دوپہر کے بعد اللہ کے حضور دو رکعت نماز ادا کر کے اللہ کا قرب حاصل کرو، پھر اِن لوگوں کو خطبہ دو۔ اس حکم کی تعمیل میں مصعب رضی اللہ عنہ نے سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کے گھر بارہ لوگوں کو جمع کیا اور اُن کیلئے ایک بھیڑ ذبح کی۔ اس طرح مصعب رضی اللہ عنہ اسلام کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جمعہ کے لیے لوگوں کو جمع کیا۔ مصعب رضی اللہ عنہ مدینہ میں جگہ جگہ جاتے رہے اور لوگوں کو دینِ اسلام کے بارے میں بتاتے

رہے۔ ایک دن آپ رضی اللہ عنہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ، بنی اشہل اور بنی ظفر کی طرف روانہ ہوئے اور بنی ظفر کے باغیچوں میں سے ایک باغیچے میں ایک کنویں کے پاس بیٹھ گئے، جو مرق کہلاتا تھا۔ آپ نے آس پاس کے اُن لوگوں کو بلایا جو پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے۔ سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر اس وقت قبیلہ بنی عبدالاشہل کے سردار تھے اور ابھی مشرک ہی تھے۔ سعد بن معاذ، اسعد بن زرارہ (جو مصعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے) کے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ جب سعد اور اسید کو مصعب کے آنے کی اطلاع پہنچی تو سعد نے اُسید بن حضیر سے کہا: ''جاؤ اور اِن دونوں لوگوں کو یہاں سے بھگا دو، یہ ہمارے ناسمجھ لوگوں کو ورغلاتے ہیں۔ اور اِنہیں پھر اس علاقے میں نہ گھسنے دینا۔ اگر اسعد میرا خالہ زاد بھائی نہ ہوتا تو میں تمہیں یہ زحمت بھی نہ دیتا، تاہم میں اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' جب اسید رضی اللہ عنہ نیزہ ہاتھ میں لئے اسعد اور مصعب کے قریب پہنچے تو اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے مصعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''یہ شخص اپنے قبیلے کا سردار ہے، اس سے اللہ کی سچی بات کرنا۔'' مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر وہ بیٹھا تو میں اُس سے بات کرونگا۔'' اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور غصہ بھرے لہجے میں کہا: ''تم یہاں کیوں آئے ہو، کیا تم ہمارے کمزور لوگوں کو گمراہ کرتے ہو؟ اگر تمہیں اپنی جانیں پیاری ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔'' مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا آپ بیٹھ کر ہماری بات نہیں سنیں گے؟ اگر آپ کو بات اچھی لگے تو اسے قبول کر لیجئے گا ورنہ رد کر دیجئے گا۔'' یہ بات اُسید بن حضیر کو مناسب لگی اور وہ اپنا نیزہ زمین میں گاڑھ کر نیچے بیٹھ گئے۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے اسلام کے بارے میں بات کی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ مصعب رضی اللہ عنہ اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم! ابھی اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اپنے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکالا تھا لیکن ہم اس کے چہرے پر اسلام کے نور کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ اسید بن حضیر نے کہا: ''یہ کیا ہی اچھی باتیں ہیں! اگر کوئی اس دین میں داخل ہونا چاہے تو اسے کیا کرنا ہوگا؟'' مصعب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ وہ غسل کرے، پاک لباس پہنے، حق کی شہادت دے اور دو رکعت نماز پڑھے۔ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کیا اور کہا: ''میرے پیچھے ایک شخص ہے اگر وہ اسلام میں داخل ہو گیا تو اس کے پیچھے اس کی ساری قوم داخل ہو جائیگی، میں اسے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں،

یہ سعد بن معاذ ہے!'' اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اپنا نیزہ زمین سے نکالا اور واپس چلے گئے۔ جب وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف آ رہے تھے تو سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے کہا: ''اللہ کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ اسید ابن حضیر کا چہرا بدلا ہوا ہے، یہ ویسا نہیں ہے جیسا وہ گیا تھا۔'' جب اسید رضی اللہ عنہ اُن تک پہنچے تو سعد نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے اُن دونوں سے بات کی اور مجھے اُن میں کوئی بات غلط نہیں لگی۔ میں نے اُنہیں چلے جانے کا حکم دیا اور اُنہوں نے کہا کہ ہم ویسا ہی کرینگے جو تم چاہتے ہو۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بنی حارث اسعد بن زرارہ کو اس لیے مارنا چاہتے تھے کہ وہ تمہارا خالہ زاد بھائی ہے اور اسے مار کر وہ تمہیں اور تمہاری امان کو کمزور اور بے اثر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔'' اس پر سعد رضی اللہ عنہ بھڑک اُٹھے اور بنی حارثہ کے متعلق کہی جانے والی بات پر فکرمند ہو گئے۔ سعد بن معاذ نے اسید ابن حضیر رضی اللہ عنہ سے کہا: اللہ کی قسم! تم کچھ بھی نہ کر سکے۔ یہ کہہ کر سعد رضی اللہ عنہ ان دونوں کی طرف روانہ ہوئے، قریب پہنچ کر جب دیکھا کہ یہ دونوں اطمینان سے بیٹھے ہیں تو سمجھ گئے کہ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کا منشا یہ تھا کہ ان دونوں کی بات سنی جائے۔ سعد نے ان دونوں کے قریب آ کر بڑے غیظ سے اُنہیں دیکھا اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے ابو عمامہ! اگر ہم دونوں میں قرابت کا یہ رشتہ نہ ہوتا تو تم مجھ سے ایسا نہیں کر سکتے تھے، کیا تم ہمارے علاقے میں ہمارے ساتھ اس طرح پیش آ ؤ گے جو ہم ناپسند کرتے ہیں؟'' سعد کے آنے سے پہلے ہی اسعد ابن زرارہ مصعب رضی اللہ عنہ کو بتا چکے تھے کہ یہ شخص اپنی قوم کا سردار ہے اگر یہ تمہاری بات مان گیا تو ہر شخص مان لے گا۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے سعد سے کہا: ''کیا آپ بیٹھ کر ہماری بات نہیں سنیں گے؟ اگر آپ کو پسند آئے تو قبول کیجئے ورنہ اسے چھوڑ دیجئے''۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا تمہاری بات ٹھیک ہے، پس وہ بھی اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی طرح نیزہ زمین میں گاڑھ کر بیٹھ گئے۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے انہیں اسلام کے بارے میں بتایا اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ مصعب رضی اللہ عنہ اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ''قبل اس کے کہ سعد کچھ بولتے ہم نے اُن کے چہرے پر اسلام کی چمک دیکھی۔'' سعد رضی اللہ عنہ نے قرآن سننے کے بعد فرمایا: ''کیا ہی اچھی باتیں ہیں، اگر کوئی اس دین میں شامل ہونا چاہے تو وہ کیا کرے؟'' انہوں نے سعد کو بتایا کہ وہ غسل کر کے پاک ہو

جائے، پھر پاک کپڑے پہنے اور حق کی گواہی دے اور اللہ کے حضور دو رکعت نماز ادا کرے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے یہ سب کیا۔ پھر اپنا نیزہ نکالا اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف گئے۔ جب یہ دونوں وہاں پہنچے تو لوگوں نے کہا: ''سعد کا چہرا بدلا ہوا ہے، جب وہ گئے تھے تو ان کا چہرہ ایسا نہ تھا'' سعد رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا: ''اے بنو اشہل! تم لوگ اپنے اوپر میرے اقتدار کو کیسا سمجھتے ہو؟'' لوگوں نے جواب دیا: '' آپ ہمارے سردار ہیں، آپ کی رائے بہترین اور آپکی قیادت مسلّم ہے''۔ سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میری تم سب مردوں اور عورتوں سے گفتگو اس وقت تک حرام ہے جب تک تم اللہ اور اسکے رسول اپر ایمان نہ لاؤ۔'' چنانچہ بنی اشہل کے تمام مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول کرلیا۔ مصعب رضی اللہ عنہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے گھر مقیم رہے اور اپنی دعوت جاری رکھی یہاں تک کہ مدینہ کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جس میں کوئی مرد یا عورت مسلمان نہ ہو۔ مصعب بن عمیر ایک سال اوس اور خزرج کے درمیان رہے۔ اس دوران وہ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دے رہے تھے اور نہایت خوشی کے ساتھ اللہ کی حاکمیت اور کلمہ حق کے انصار و مددگار کی بڑھتی ہوئی تعداد کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ گھروں کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور کوشش کرتے کہ لوگ ان سے رابطہ کریں اور آپ انہیں اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ آپ آس پاس کے کھیتوں میں بھی جاتے اور لوگوں سے گفتگو کرتے، اسی طرح وہ قبائل کے سرداروں کے پاس جاتے اور انہیں اسلام کے طرف بلاتے۔ لوگوں تک حسن وخوبی سے بات پہچانے کیلئے مصعب رضی اللہ عنہ مناسب تدابیر بھی اختیار کرتے جیسا کہ آپ نے اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کی تھی، تا کہ وہ حق کی آواز سن لیں۔ یوں ایک سال کے دوران آپ اہلِ مدینہ کے بوسیدہ بت پرستی کے افکار کو توحید وایمان کے افکار سے بدل دینے اور غلط جذبات کو اسلامی جذبات سے بدل دینے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ شرک سے بیزاری ظاہر کرنے لگے، اور دھوکہ دہی اور ناپ تول میں کمی سے اجتناب کرنے لگے۔ مصعب رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کی کوشش نے ایک سال کے دوران مدینہ کی شرک کی حالت کو اسلام سے بدل دیا۔

باب نمبر 10

عقبہ کی دوسری بیعت

عقبہ کی پہلی بیعت اپنے اثر کے اعتبار سے بڑی خیر و برکت کا موجب تھی۔ کیونکہ باوجود ایک چھوٹی سی جماعت کے جو اس بیعت میں شریک تھے، صرف ایک شخص یعنی مصعب بن عمیر ہی انہیں کافی ہوئے۔ مدینہ کے معاشرے کے افکار اور جذبات، جو اُن میں عام تھے، میں انقلاب آیا اور وہ اسلامی بن گئے۔ جبکہ دوسری طرف اگر چہ مکہ میں ایک خاصی تعداد مسلمان ہو چکی تھی لیکن معاشرہ مجموعی طور پر اُن سے کٹا رہا، اور لوگوں نے گروہ در گروہ اسلام قبول نہ کیا، اور اسلامی افکار و جذبات معاشرے پر اثر انداز نہ ہوئے۔ جبکہ مدینہ میں اسلام لوگوں کے گروہوں میں داخل ہو گیا، اسلام وہاں کے معاشرے پر اثر انداز ہوا اور اہلِ مدینہ کے افکار اور جذبات اسلام سے متاثر ہوئے۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ایسے لوگ جو معاشرے سے علیحدہ ہوں اور لوگوں سے کٹے ہوئے ہوں، ان کا ایمان نہ تو معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور نہ ہی لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے، خواہ ان کا یہ ایمان کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔ نیز اگر لوگوں کے مابین تعلقات کو افکار و جذبات کے ذریعے متاثر کیا جائے تو معاشرے میں تبدیلی آ جاتی ہے خواہ دعوت کے حاملین کی تعداد کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اگر ایک معاشرہ کفر کی حالت پر بضد ہو جیسا کہ مکہ کا حال تھا، تو یہ زیادہ مشکل ہوتا ہے بانسبت اس معاشرے کے جہاں چاہے فاسد آراء ہوں لیکن وہ لوگوں میں پوری طرح راسخ نہ ہوں، جیسا کہ مدینہ کا معاملہ تھا۔ یہی

وجہ ہے کہ مدینہ کا معاشرہ مکہ کی نسبت اسلام سے زیادہ متاثر ہوا۔ مدینہ کے لوگ اپنے افکار کے غلط ہونے کو محسوس کرتے تھے اور وہ دیگر افکار اور زندگی کے لیے مختلف نظام کے بارے میں گفتگو کرتے تھے جو اُن کی زندگیوں کو منظّم کر سکے۔ اسکے برخلاف مکہ کے لوگ اپنی حالت پر اپنی دانست میں مطمئن تھے بلکہ وہ اپنے افکار کی حفاظت کرتے تھے کہ کہیں اِن میں کوئی تبدیلی نہ آ جائے، خاص طور پر اُن کے سرداران جیسے ابولہب، ابوجہل اور ابوسفیان۔ یہی وجہ ہے کہ مصعب رضی اللہ عنہ ایک قلیل عرصہ میں معاشرے کا رویہ اسلام کی طرف بدلنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ لوگوں کو دعوت دیتے، اُن کو اسلام کے افکار اور احکامات کی تعلیم دیتے، وہ لوگوں میں اسلام کی قبولیت کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ لوگ زیادہ تعداد میں روز بروز اسلام میں داخل ہو رہے تھے جس سے مصعب رضی اللہ عنہ کی ہمت میں مزید اضافہ ہوا اور وہ مزید تندہی سے تعلیم دینے لگے اور ان کی دعوت اور تیز ہوگئی۔ یہاں تک کہ حج کا موسم آ گیا اور مصعب رضی اللہ عنہ حج کے موسم میں مکہ تشریف لائے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ کے مسلمانوں کے احوال بتائے، اُنکی قوت پر روشنی ڈالی، مدینہ میں اسلام کے پھیلاؤ کا ذکر کیا اور مدینہ کے معاشرے کی تصویر پیش کی کہ وہاں ہر جگہ آپ ﷺ کا ذکر ہے، ماحول پر اسلام چھایا ہوا ہے، مسلمانانِ مدینہ کی قوت کا ذکر کیا اور ان کی دفاعی طاقت کو بیان کیا۔ اور اطلاع دی کہ ان میں سے بعض مسلمان، جن کا اسلام پر ایمان مضبوط ہے اور وہ اسکی دعوت کو پھیلانے اور اللہ کے دین کا دفاع کرنے پر تیار ہیں، اس سال مکہ آنے والے ہیں۔ مدینہ کے اِن حالات سے رسول اللہ ﷺ کو بہت مسرت ہوئی اور آپ ﷺ اس معاملے پر غور وخوض کرنے لگے، آپ ﷺ نے مکہ اور مدینہ کے ماحول میں فرق کا موازنہ کیا۔ مکہ میں آپ ﷺ نے بارہ سال مسلسل اسلام کی دعوت دی اور کوئی کسر نہ چھوڑی، جس قدر ممکن تھا محنت کی، ہر قسم کی اذیتیں جھیلیں، اسکے باوجود مکہ کے لوگوں کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کے باعث اسلام کی دعوت مکہ پر وہ اثر مرتب نہ کر پائی جو مطلوب تھا، مکہ کے لوگوں کے قلوب سخت تھے اور ان کے نفوس ضدی اور ہٹ دھرم تھے اور ان کی عقلیں دقیانوسی خیالات پر جمی ہوئی تھیں۔ نفوس میں بت پرستی کے گہرائی سے پیوست ہونے کے نتیجے میں مکہ کا معاشرہ اسلام کی دعوت کے لیے اپنا دل ودماغ کھولنے کے

لیے تیار نہ تھا۔ مکہ شرک اور بت پرستی کا مرکز تھا۔ اسکے برعکس مدینہ کا عالم یہ تھا کہ قبیلہ خزرج کے کچھ لوگوں کو اسلام قبول کیے ایک سال ہی گزرا تھا کہ عقبہ کی پہلی بیعت ہوئی اور اس کے بعد مصعب ﷛ کی ایک سال کی کوشش مدینہ کے ماحول میں انقلاب لانے کے لیے کافی ثابت ہوئی اور لوگ جوق درجوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ مکہ میں اسلام کی دعوت آگے نہیں بڑھ پائی تھی اور انہی لوگوں تک آ کر رُک گئی تھی جو مسلمان ہوئے تھے اور انہیں کفار کی شدید آزمائشوں کا سامنا تھا، لیکن مدینہ میں مسلمانوں کو وہاں کے مشرکوں اور یہودیوں کی طرف سے اذیتوں کا سامنا نہ تھا اور دعوت تیزی سے پھیلتی گئی، اور یوں اسلام لوگوں کے دلوں کی گہرائی تک رسائی پا گیا اور مسلمانوں کے لیے راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ پر یہ واضح ہوگیا کہ مدینہ اسلام کی دعوت کے لیے مکہ سے زیادہ موزوں ومناسب ہے، اور مدینہ کے معاشرے میں قابلیت موجود ہے چنانچہ وہاں اسلام کی دعوت کا نور مکہ سے زیادہ چمکے گا۔ اس لیے آپ ﷺ نے یہ سوچا کہ اگر ہجرت کر کے مدینہ جایا جائے اور مکہ کے مسلمان مدینہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہیں تو انہیں امن و تحفظ حاصل ہوگا اور وہ قریش کی زیادتیوں اور مظالم سے محفوظ ہوں گے اور پھر وہ دعوت کی طرف اپنی توجہ پوری طرح مرکوز کرسکیں گے اور اس طرح عملی مرحلے میں داخل ہوجائیں گے جو کہ اسلام کو نافذ کرنے اور اسلام کی دعوت کو ایک ریاست کی قوت اور اقتدار کے ذریعے آگے لے جانے کا مرحلہ ہے۔ یہی ہجرت کا سبب تھا اس کے علاوہ ہجرت کا کوئی اور سبب نہ تھا۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ آپ ﷺ نے محض قریش کے مظالم اور اذیتوں سے پریشان ہوکر اور اُن پر صبر اور استقامت سے ڈٹے نہ رہ کر یا ان پر غلبہ پانے کی کوشش کیئے بغیر ہجرت کا فیصلہ نہیں کیا تھا، آپ ﷺ تو دس سال مسلسل اِن صعوبتوں اور صبر آزما حالات میں بھی دعوت ہی پر جمے رہے اور آپ نے اپنی فکر میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ آپ ﷺ اور تمام اصحاب ﷢ نے قریش کے تشدد، ایذا اور دہشت کا سامنا کیا، قریش کی بدسلوکی اور مزاحمت کبھی بھی ان کے ارادوں کو کمزور نہ کرسکی، بلکہ اُن کا ایمان مزید مضبوط ہوا اور اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین نے ان کے عزم کو اور مستحکم کر دیا۔ لیکن اِس عرصے کے تجربات سے یہ بات آپ ﷺ پر واضح ہوگئی تھی کہ

مکہ کے معاشرے کے افکار کس قدر سطحی ہیں اور اہلِ مکہ کتنے سنگدل اور گمراہ ہیں۔ نتیجتاً یہاں دعوت کی کامیابی کے امکانات کم ہیں اور دعوت کے لیے یہاں کوششیں اور محنتیں صرف کرنا اپنی توانائیوں کو ضائع کرنا ہے، چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس معاشرے سے نکل کر کسی اور جگہ اپنی کاوشوں اور محنت کو مرکوز کیا جائے، اس لیے آپ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کرنے کا سوچا اور مدینہ ہجرت کرنے میں یہی فکر کارفرما تھی۔ نہ کہ محض قریش کے ظلم اور تشدد سے خود کو اور اپنے صحابہ کو محفوظ بنانے کیلئے۔ حالانکہ اس سے قبل ایسا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے اپنے بعض اصحاب رضی اللہ عنہم کو قریش کے ظلم و زیادتیوں سے بچنے کیلئے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کو اجازت ہے کہ اگر اس پر اسکے دین کی وجہ سے فتنے میں مبتلا کیا جا رہا ہو تو وہ کہیں اور ہجرت کر جائے، اگرچہ تشدد کو برداشت کرنا ایمان کو چمکاتا ہے، جور اور ظلم سے خلوص میں نکھار آتا ہے، مزاحمت سے عزم اور ارادہ قوی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان سے چیزوں کی بے وقعتی دلوں میں گھر کرتی ہے اور اللہ کی راہ میں آنے والی مشکلوں کا سامنا کرنا آسان ہوتا ہے، مومن اپنی جان، مال اور دل کا سکون تک قربان کر دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا بھی رخ ہے کہ مومن اِن مصائب کا سامنا کرنے اور قربانیوں پر تیار رہنے میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ اسکی ساری کوششیں اسی پر مرکوز رہتی ہیں نہ کہ دین کی اشاعت اور دعوت پر، اور وہ دینِ حق کی سچائی اور گہرائی پر اتنا غور نہیں کر پاتا کہ اس کی فکر وسیع ہو سکے۔ اسی لئے یہ ناگزیر تھا کہ فتنے کی جگہ سے ہجرت کا حکم دیا جاتا۔ حبشہ کی ہجرت کا یہی معاملہ تھا۔ لیکن مدینہ کی ہجرت کا معاملہ مختلف تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ وہ اپنے پیغام کو نئی حالت کی طرف منتقل کرنا چاہتے تھے، وہ معاشرے میں اس پیغام کو نافذ کر کے اسے زندہ و متحرک بنانا چاہتے تھے تاکہ ایک نیا معاشرہ تیار ہو جو اللہ تعالیٰ کی اس دعوت کو ساری دنیا میں پھیلا سکے اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ یہ وہ فکر تھی کہ جس کی بنا پر آپ ﷺ نے مدینہ میں اسلام کے داخل ہو جانے اور پھیل جانے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہاں ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ لیکن قبل اسکے کہ آپ ﷺ خود ہجرت کرتے یا اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیتے، یہ ضروری تھا کہ آپ ﷺ مدینہ سے آئے ہوئے حاجیوں سے، اُن میں موجود مسلمانوں

سے ملیں اور یہ محسوس کریں کہ اہلِ مدینہ کس حد تک دینِ اسلام کی حمایت کیلئے تیار ہیں، وہ اسلام کی راہ میں کہاں تک قربانیاں دے سکتے ہیں اور کیا وہ آپ ﷺ کے ہاتھ پر جنگ اور قتال کی بیعت کے لیے تیار ہیں؟ کیونکہ اسلامی ریاست کے قیام کیلئے یہی سنگِ بنیاد ہوگا۔ آپ ﷺ نے حاجیوں کی آمد کا انتظار کیا۔ یہ بعثتِ نبوی کے بارہویں سال یعنی 622ء کی بات ہے۔ حاجیوں کی تعداد کافی تھی اور اِن میں 75 مسلمان تھے، جن میں سے دو عورتیں تھیں۔ ایک نسیبہؓ بنت کعب یعنی اُمِ عمارہ جو بنی مازن بن النجار سے تھیں اور دوسری اسماءؓ بنت عمرو بن عدي یعنی ام منیع جو بنی سلمہ سے تھیں۔ آپ ﷺ نے اِن لوگوں سے راز داری سے رابطہ کیا اور اِن سے ایک اور بیعت کے بارے میں بات کی جو محض دعوت کو پھیلانے اور مصائب پر صبر کرنے پر نہ تھی بلکہ اس کے بڑے دور رس مضمرات تھے۔ یہ ایک ایسی بیعت تھی جو ایک ریاست کا سنگِ بنیاد بنے اور اسکی حفاظت کا اولین ذریعہ ہو، وہ ریاست جس کی جڑیں معاشرے میں ہوں، اور جو اسلام کے پیغام کو پوری انسانیت تک لے کر جائے، اور اسلامی دعوت کے پھیلاؤ اور اسلامی احکام کے نفاذ کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو مادّی قوت سے ہٹا سکے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اُن سے اس بیعت پر بات کی تاکہ اُن میں اِن امور کی استعداد کو محسوس کریں۔ مدینہ کے مسلمانوں نے ایامِ تشریق کے دوران ایک شب آپ ﷺ سے عقبہ کے مقام پر ملنے کا وعدہ کیا۔ آپ ﷺ نے اُنہیں ہدایت دی کہ ''جب وہ آئیں تو کسی سوتے کو نہ اُٹھائیں اور نہ کسی شخص کا، جو غائب ہو، انتظار کریں۔'' مقررہ شب جب ایک تہائی سے زیادہ گزر گئی تو وہ لوگ بڑی احتیاط سے عقبہ کی طرف آپ ﷺ سے ملاقات کیلئے روانہ ہوئے، اُن کے ساتھ دونوں خواتین بھی تھیں۔ یہ لوگ دبے پاؤں عقبہ کے پہاڑ پر چڑھ گئے تاکہ ان کا یہ معاملہ راز رہے۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر آپ ﷺ کا انتظار کیا۔ رسول اللہ ﷺ عباس کے ساتھ تشریف لائے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ عباس اس لیے ساتھ آئے تھے کہ اطمینان کرلیں کہ اُن کے بھتیجے یعنی رسول اللہ ﷺ کسی خطرے میں تو نہیں پڑ رہے اور آپؓ ہی نے گفتگو کا آغاز کیا، فرمایا: ''اے اہلِ خزرج! تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہم میں کیا مقام ہے۔ ہم نے اپنے ہی لوگوں سے انکی حفاظت کی ہے اور وہ بھی اس بات سے

واقف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم میں عزت اور حفاظت سے رہتے ہیں لیکن اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہارے پاس آ جائیں، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جو وعدہ تم نے اُن سے کیا ہے اس کو پورا کرو گے اور اُن کی دشمنوں سے حفاظت کرو گے تو تم یہ بوجھ اٹھا لو، اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جب یہ تمہارے پاس آ جائیں گے تو پھر تم انہیں چھوڑ دو گے اور ان سے کیا وعدہ پورا نہ کرو گے تو تم ابھی اُنہیں چھوڑ جاؤ''۔ اُن لوگوں نے جواب دیا: ''ہم نے سن لیا جو آپ نے کہا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ اب آپ فرمایئے اور اپنے لئے اور اپنے ربّ کیلئے جو پسند ہو وہ فیصلہ کیجئے''۔ آپ ﷺ نے پہلے کچھ آیاتِ قرآنی تلاوت کیں، پھر اسلام کیلئے رغبت کی بات کی اور فرمایا: ''میں اس بات پر تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم جس طرح اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہو اسی طرح میری حفاظت بھی کرو گے۔'' سب سے پہلے البراء نے پہل کرتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا کہ ''اے اللہ کے رسول ﷺ ہم بیعت کرتے ہیں، اللہ کی قسم! ہم جنگجو قوم ہیں، اور ہمارے پاس اسلحہ ہے جو ہمیں ہمارے باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے۔'' اس سے پہلے کہ البراء کی بات ختم ہوتی، ایک شخص ابوالھیثم ابن التیھان نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا: ''رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ دوسروں کا (یہودیوں کا) معاہدہ ہے، ہم اسے توڑ دیں اور پھر اللہ تعالیٰ آپ کو فتح دیدے تو پھر کیا آپ اپنی قوم میں لوٹ آئیں گے اور ہمیں چھوڑ دیں گے؟''۔ اس پر آپ مسکرائے اور فرمایا: ''تمہارا خون میرا خون ہے، تمہاری تباہی میری تباہی ہے، تم مجھ میں سے ہو اور میں تم میں سے ہوں، میں اُس سے مقابلہ کرونگا جو تم سے لڑے اور اُس سے میری صلح ہوگی جو تم سے صلح کرے گا''۔ عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے خزرج کو مخاطب کیا اور کہا: ''اے خزرج کے لوگو! کیا تمہیں احساس ہے کہ تم یہ بیعت کر کے خود کو کس وعدے کے سپرد کر رہے ہو؟ اس کا مطلب ہے ہر ایک سے لڑنا اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس سے تمہارے مال و اثاثے تم سے چھوٹ جائینگے اور تمہارے عزت دار لوگ مارے جائینگے اور پھر تم اِنہیں (یعنی رسول اللہ ﷺ) کو چھوڑ دو گے تو بہتر ہے تم ابھی چھوڑ دو کیونکہ بعد میں آپ ﷺ کو چھوڑ دینے کا مطلب ہوگا کہ دنیا اور آخرت میں شدید رسوائی۔ لیکن اگر تمہیں یقین ہے کہ تم ان سے وفا کرو گے چاہے تمہارے مال و اثاثے لٹ جائیں اور تمہارے

اشراف مارے جائیں تو پھر انہیں اپنے ساتھ لے چلو، اس میں تمہارے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں نفع ہی نفع ہے''۔ اس پر سب لوگوں نے حامی بھری کہ وہ اپنے اموال کے لٹ جانے اور اشراف کے قتل ہوجانے پر فوقیت دیتے ہوئے آپ ﷺ کو لیتے ہیں، پھر آپ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ اگر ہم آپ ﷺ سے وفا کریں تو ہمارے لئے اس وفا کا کیا بدلہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے نہایت اطمینان اور اعتماد سے فرمایا: ''جنت!''

اس پر سب لوگوں نے اپنے ہاتھ بڑھا دیئے اور یہ کہتے ہوئے بیعت کی: ''ہم اللہ کے رسول ﷺ کی بیعت کرتے ہیں کہ ہم تنگی اور آسانی میں، پسند اور ناپسند میں اور اپنے اوپر ترجیح دیے جانے میں (یعنی ہر حالت میں) سنیں اور اطاعت کریں گے، اور یہ کہ ہم اہلِ امر سے تنازع نہ کریں گے اور ہر حال میں حق بات کہیں گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کرینگے''۔ پھر آپ ﷺ نے کہا: اپنے میں سے بارہ افراد آگے بڑھاؤ جو اپنی قوم کے معاملات کے ذمہ دار ہوں۔ اہلِ مدینہ نے قبیلہ خزرج سے نو اور قبیلہ اوس سے تین افراد آگے بڑھائے، آپ ﷺ نے ان نقیبوں سے فرمایا کہ ''تم اپنی قوم کے معاملات کے ذمہ دار ہو جس طرح عیسیٰ ابنِ مریم کے حواری ان کے ذمہ دار تھے، اور میں اپنی قوم کا ذمہ دار ہوں'' اس کے بعد اہلِ مدینہ اپنے بستروں کی طرف لوٹ گئے اور پھر مدینہ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ اس بیعت کے بعد آپ ﷺ نے مسلمانانِ مکہ کو حکم دیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں۔ مسلمان انفرادی طور پر یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں مدینہ کی طرف روانہ ہونے لگے۔ قریش کو جب اس بیعت کی بھنک لگی تو اُنہوں نے کوششیں کیں کہ مسلمانوں کو ہجرت نہ کرنے دیں یہاں تک کہ اُنہوں نے یہ تدبیر بھی آزمالی کہ اگر شوہر ہجرت کر رہا ہے تو بیوی کو روک لیں، لیکن مسلمان بہرحال روانہ ہوتے رہے۔ آپ ﷺ مکہ ہی میں رہے اور یہ بات ظاہر نہ ہونے دی کہ آیا آپ ﷺ بھی ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں یا مکہ ہی میں قیام کرینگے۔ تاہم ایسی علامات تھیں کہ آپ بھی ہجرت کر جائیں گے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے ہجرت کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں جواب دیا کہ ((**لا تعجل لعل اللّٰه يجعل لك صاحباً**)) ''جلدی مت کرو، ممکن ہے کہ

اللہ تمہارے لئے ساتھی کر دے۔'' اس سے ابو بکرؓ نے جان لیا کہ آپ ﷺ بھی ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ قریش نے جب دیکھا کہ اصحابِ رسول ہجرت کر رہے ہیں تو اُنہیں یقین ہو گیا کہ آپ ﷺ اُن سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے اور اس بات پر اتفاق کیا کہ آپ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیا جائے۔ جبریلؑ نے آپ ﷺ کو قریش کے مذموم عزائم کی اطلاع دی اور یہ کہا کہ آپ ﷺ آج شب اپنے اُس بستر پر نہ سوئیں جس پر وہ روز سوتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ ﷺ بھی ہجرت کر جائیں۔

مدینہ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت، اہلِ مدینہ کا آپ ﷺ کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہونا اور ایک اسلامی ریاست کا قیام، صرف یہی وہ وجوہات تھیں جو آپ ﷺ کی ہجرت کا محرک تھیں۔ یہ ایک فاش غلطی ہوگی کہ یہ گمان کیا جائے کہ قریش کی طرف سے آپ کو قتل کئے جانے کے خوف سے آپ ﷺ نے مکہ سے راہِ فرار اختیار کی۔ آپ ﷺ کبھی بھی قریش کے مظالم کو یا اُنکی اذیتوں کو خاطر میں نہیں لائے اور نہ ہی دعوتِ اسلام کی راہ میں موت کی آپ کو کوئی پرواہ تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ کی ہجرت کا محرک صرف یہی تھا کہ اسلامی دعوت کو آگے بڑھایا جائے اور اسلامی ریاست کو قائم کیا جائے۔ قریش کا آپ ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ اس خوف کی بنا پر تھا کہ آپ ﷺ کہیں مدینہ ہجرت نہ کر جائیں جہاں آپ ﷺ کو اقتدار اور حمایت حاصل ہوگی۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوئے۔ چنانچہ ہجرت در حقیقت اسلام کے دو ادوار میں حدِ فاصل تھی: یعنی لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کے دور اور اسلام پر مبنی معاشرے کے قیام، اسلام کو نافذ کرنے، اسلام کے ذریعے حکمرانی کرنے، اسلامی ریاست کی اتھارٹی کے ذریعے اسلام کو پھیلانے اور دعوت کو شر اور سرکش قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے قوت کے استعمال کے دور کے درمیان حدِ فاصل۔

باب نمبر 11

اسلامی ریاست کا قیام

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ کی ایک بڑی تعداد آپ ﷺ کے استقبال اور انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے اُمڈ پڑی ، اِن میں مسلمان بھی تھے، مشرکین اور یہود بھی۔ آپ ﷺ کو مسلمانوں نے گھیر رکھا تھا جو آپ ﷺ کو اپنا مہمان بنانا چاہتے تھے تا کہ آپ ﷺ آرام اور راحت سے رہ سکیں اور وہ آپ ﷺ کی خدمت کرسکیں۔ وہ خود کو آپ ﷺ اور دینِ اسلام اور اس کی دعوت کیلئے پیش کررہے تھے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف اس کے حصّے میں آئے۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنی اونٹنی کی لگام چھوڑ دی جو سہل بن عمرو اور سہیل بن عمرو کے ایک گودام کے سامنے آ کر رُک گئی۔ اسی جگہ کو آپ ﷺ نے بعد میں خرید لیا اور یہیں ایک مسجد اور اطراف میں اپنے گھر تعمیر کئے۔ مسجد کی تعمیر قدرے آسانی سے انجام پا گئی کیونکہ یہ کافی سادہ بنائی گئی اور اسی وجہ سے کم لاگت اور محنت میں یہ کام مکمل ہو گیا۔ اس میں ایک صحن تھا جس کے اطراف میں اینٹ اور گارے سے دیواریں بنائی گئیں، اس کے ایک حصہ پر کھجور کے تنوں کی چھت ڈالی گئی اور باقی حصہ کھلا رہنے دیا گیا۔ اس مسجد ہی کے ایک حصے میں ایسے لوگوں کی رہائش بنادی گئی جن کے رہنے کا کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا۔ روشنی کیلئے صرف عشاء کی نماز کے وقت مشعلیں چلائی جاتی تھیں، اور باقی وقت میں کوئی روشنی نہیں ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کا گھر بھی اسی سادگی سے بنا تھا بس اُس میں روشنی بہتر تھی۔ جب تک یہ تعمیر مکمل ہوئی ، آپ ﷺ ابو ایوبؓ (خالد بن سیف الانصاريؓ) کے گھر مقیم رہے پھر اپنے گھر آ گئے جہاں آپ ﷺ نے آخر عمر تک قیام کیا۔

آپ نے اس نئی زندگی کے بارے میں سوچا جس کی راہیں آپ کے سامنے کھل چکی تھیں اور اس راستے کے متعلق جس میں دعوت ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے یعنی تَثْقِیف کے مرحلے سے غیر اسلامی معاشرے کے ساتھ تفاعُل کے مرحلے میں داخل ہوئی تھی اور اب یہ لوگوں کے معاملات پر اسلام کے قوانین کے نفاذ کے مرحلے کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ پہلے دور میں دعوت کے راستے میں آنے والی تکالیف پر صبر کیا گیا، اب حکومت و اقتدار کا دور تھا جس میں مادّی قوت اس دعوت کی حمایت وحفاظت کیلئے میسّر تھی۔ اسی لئے آپ ﷺ نے مدینہ آمد پر سب سے پہلے ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا جو مسلمانوں کیلئے نماز، باہم مل بیٹھنے، آپسی مشورے، مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کے مابین فیصلہ کرنے کا مرکز تھی۔ آپ ﷺ نے ان کاموں کے نمٹانے کیلئے اپنے دو وزیر (معاون) مقرر کئے، یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ، اور فرمایا:

((وزيراي في الأرض ابو بكر و عمر))

''زمین پر میرے دو معاون ابوبکر اور عمر ہیں''

لوگ ہمیشہ آپ کے قریب رہتے اور اپنے معاملات میں آپ ﷺ کی طرف رجوع کرتے۔ آپ ﷺ بیک وقت ایک ریاست کے سربراہ بھی تھے، قاضی اور فوج کے سپہ سالار بھی، آپ ﷺ مسلمانوں کے امور کا اہتمام فرماتے تھے اور آپسی تنازعات میں فیصلہ بھی کرتے تھے۔ آپ ﷺ فوجی دستے تشکیل دیتے، اُن پر امیر مقرر فرماتے اور اُنہیں مدینہ کے باہر میں مختلف مہمات پر بھیجتے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ کے مدینہ میں قیام کے پہلے دن سے ایک ریاست تشکیل پا گئی جس کی بنیاد ایسے معاشرے پر رکھی گئی تھی جو مضبوط بنیادوں پر کھڑا تھا، اور جس کے پاس اپنی قوت تھی جس کے ذریعے وہ اپنا تحفظ کر سکے اور دعوت کو پھیلا سکے۔ اس پر اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد آپ ﷺ اب اُن مادّی رکاوٹوں کو زائل کرنے کی شروعات کر سکتے تھے جو اس دعوت کے پھیلاؤ میں کھڑی تھیں۔

باب نمبر 12

معاشرے کی تشکیل

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کو جس جبلتِ بقاء سے نوازا ہے، اُس کا ایک مظہر یہ ہے کہ انسان آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، چنانچہ انسانوں کا مل کر رہنا فطری اور قدرتی ہے اور یہ ایک جبلی امر ہے۔ تاہم محض انسانوں کا جمع ہونا، کسی معاشرے کو جنم نہیں دیتا، بلکہ اس سے تو صرف لوگوں کا ایک ہجوم ہی بنتا ہے۔ تاہم جب ان لوگوں کے درمیان تعلقات استوار ہو جاتے ہیں، تا کہ مشترکہ مفادات کو حاصل کیا جائے اور مشترکہ خطرات سے بچاؤ کیا جائے، تو یہ تعلقات لوگوں کے اس مجموعے کو معاشرے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ البتہ محض ان تعلقات کی موجودگی ایسے معاشرے کو جنم نہیں دیتی جو باہم مربوط ہو۔ مربوط معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے لوگوں کے آپس کے تعلقات میں وحدت پیدا ہو اور جہاں تک تعلقات کی وحدت کا تعلق ہے تو یہ وحدت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگوں کے افکار میں وحدت پیدا ہو جائے، اور ان کی پسند و ناپسند میں وحدت پیدا ہو جائے جو کہ جذبات و احساسات کی وحدت سے پیدا ہوتی ہے اور معاملات کے حل کے متعلق وحدت پیدا ہو جائے جو کہ اس نظام کی وحدت کے ذریعے پیدا ہوتی ہے جو ان معاملات کو حل کرتا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ ایک معاشرے میں موجود افکار، جذبات اور اس پر نافذ نظام کو دیکھا جائے، کیونکہ یہی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جس

کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے۔ اب ہم اسی بنیاد پر رسول ﷺ کی مدینہ آمد کے وقت وہاں کے معاشرے پر نظر ڈالیں گے، تاکہ اسکی ہئیت کو سمجھا جا سکے۔

مدینہ میں اُس وقت تین مختلف گروہ آباد تھے: اول مسلمان، جن میں مہاجر اور انصار دونوں تھے اور انہی کی غالب اکثریت تھی۔ دوسرے مشرکین، جن میں قبائلِ اوس وخزرج کے وہ لوگ تھے جو ایمان نہیں لائے تھے اور یہ قلیل تعداد میں تھے۔ اور تیسرے یہودی، جن کی چار ٹکڑیاں تھیں، ان میں سے ایک گروہ مدینہ کے اندر تھا جو کہ بنو قَینُقاع کا قبیلہ تھا، جبکہ تین گروہ مدینہ سے باہر آباد تھے جو کہ بنی نضیر، بنی قُریظہ اور خیبر کے یہودی تھے۔ چنانچہ جہاں تک یہود کا تعلق ہے تو اسلام کی آمد سے قبل بھی ان کا معاشرہ مدینہ کے معاشرے سے جدا تھا کیونکہ اُن کے افکار، اُن کے جذبات اور اُن کا نظام جس سے وہ اپنے معاملات طے کرتے تھے وہ اہلِ مدینہ سے مختلف تھے۔ چنانچہ وہ مدینہ کے اندر اور اُس کے گرد آباد ہونے کے باوجود بھی مدینہ کے معاشرے کا حصہ نہ تھے۔ رہے مشرک، تو وہ بہت تھوڑے تھے اور مدینہ پر چھایا ہوا اسلامی ماحول ان پر بھی حاوی ہو چکا تھا۔ اس بناء پر اِن مشرکین کا اسلامی افکار، اسلامی جذبات اور اسلامی نظام کے تابع ہونا حتمی امر تھا، گو کہ وہ مسلم نہیں ہوئے تھے۔ رہے مہاجر اور انصار تو یہ ایک عقیدۂ اسلام پر تھے اور اسلام نے انہیں آپس میں جوڑ دیا تھا، چنانچہ ان کے افکار اور جذبات ایک تھے اور اسلام نے اِن کی زندگیوں اور معاملات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ بنا دیا تھا۔ کیونکہ یہ ایک رشتہ یعنی اسلام سے جڑے ہوئے تھے، چنانچہ اُن کا اپنی زندگیوں اور تعلقات کو اسلام کے تحت منظّم کرنا فطری اور ناگزیر تھا۔ آپ ﷺ نے اسلامی عقیدے کی بنیاد پر مسلمانوں کے آپسی تعلقات کو ڈھالنا شروع کیا اور اُن کو ایک بھائی چارے کے رشتے میں پرو دیا، ایسا بھائی چارہ کہ جس کے واضح اور دائمی اثرات اُن کے آپسی تعلقات، تجارتی لین دین اور زندگی کے تمام معاملات میں محسوس کئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر آپ ﷺ نے بھائی چارہ قائم کرتے ہوئے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی بنایا۔ آپ ﷺ کے غلام زید رضی اللہ عنہ، آپ ﷺ کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھائی بنائے گئے، ابو بکر رضی اللہ عنہ

کوخارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا۔ مہاجرین وانصار آپس میں بھائی بھائی بن گئے چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ عتبان بن مالک الخزرجی رضی اللہ عنہ کے بھائی بنے، طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا اور اسی طرح عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا۔ یہ بھائی چارہ مادّی پہلو پر بھی اثر انداز ہوا، چنانچہ انصار اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ نہایت فراخدلی سے پیش آئے جس نے اِن کے درمیان رشتوں کو مضبوط تر بنا دیا۔ انصار نے اپنے مال اور اشیاء میں مہاجرین کو شریک کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ زراعت اور تجارت میں بھی اپنا شریک بنایا۔ مہاجرین کے تاجروں نے تجارت شروع کر دی، عبدالرحمٰن بن عِوف رضی اللہ عنہ نے مکھن اور پنیر بیچنا شروع کر دیا اور اسی طرح دیگر مہاجر تاجروں نے اپنی اپنی تجارت شروع کر دی۔ جس نے تجارت نہیں کی وہ زراعت کی طرف بڑھا، جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ اُن زمینوں پر کاشت کرتے تھے جو انصار نے اُنہیں دی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ((**من کانت له ارض فلیرزعها او لیمنحها اخاه**)) ''جس کسی کے پاس زمین ہو وہ اُس پر کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دیدے۔'' اس طرح مسلمان اپنی روزی کمانے لگے۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹی سی جماعت تھی جن کے پاس نہ مال تھا اور نہ کام اور نہ ہی رہنے کیلئے گھر میسر نہیں تھا، یہ ضرورت مند تھے۔ یہ لوگ نہ مہاجر تھے اور نہ ہی انصار، یہ عرب کے دوسرے علاقوں سے مدینہ آئے تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ آپ ﷺ نے اِن حضرات کو اپنی عنایت میں رکھا اور رہنے کیلئے مسجد کا وہ حصہ دیا جس پر چھت ڈالی گئی تھی، یہ لوگ وہیں رہتے اور وہیں ان کا ٹھکانہ تھا۔ یہ لوگ اصحابِ صفہ کہلائے۔ مہاجرین وانصار میں سے وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے رزق میں وسعت عطا فرمائی تھی، وہ اِن کیلئے کھانے کا بندوبست کر دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو مجتمع کیا اور ان کے آپسی تعلقات کو ایک مضبوط بنیاد پر استوار کیا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جس کی بنیادیں اتنی قوی ہوں کہ وہ ایک طرف تو کفر کے راستے میں آہنی دیوار ثابت ہو اور دوسری طرف وہ مشرکین اور یہودیوں کی سازشوں اور چالاکیوں کی مزاحمت کر سکتا ہو۔ یہ اسلامی معاشرہ اور اسکی وحدت قائم ہو گئی اور آپ ﷺ اس طرف سے مطمئن ہو گئے۔ جہاں تک مشرکینِ مدینہ کا

سوال ہے تو یہ اپنا کوئی اثر اس اسلامی معاشرے پر نہیں ڈال سکے، یہ لوگ خود کو اسلامی حکم کے تابع کر چکے تھے اور رفتہ رفتہ اِنکا وجود ختم ہو گیا۔ البتہ یہود کا معاملہ یہ تھا کہ ان کا معاشرہ تو اسلام سے پہلے بھی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا تھا اور اسلام کے بعد اُنکے اور اسلامی معاشرے کا فرق اور یہودیوں اور مسلمانوں کا فرق نمایاں ہوتا گیا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اُن سے تعلقات ایک معین بنیاد پر طے کئے جائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مسلمانانِ مدینہ کے دیگر لوگوں کے ساتھ تعلق کی حد بندی فرمائی اور ان حدود و قیود کو بھی بیان کر دیا جن کی پابندی ان لوگوں پر لازم تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین دستاویز تحریر فرمائی جس میں یہودیوں کا بھی ذکر کیا اور ان پر بھی شروط عائد کی گئیں۔ اس دستاویز میں مسلمانوں کے مابین اور ان میں شامل ہونے والے لوگوں کے طرزِ تعلقات کی وضاحت کی گئی تھی جس کے بعد یہودیوں کے مختلف قبائل سے مسلمانوں کے تعلقات کی حد بندی کو بیان کیا گیا تھا۔ دستاویز کی ابتداء اس طرح کی گئی: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ دستاویز محمد ﷺ کی طرف سے قریش (مہاجرین) کے اور یثرب کے مسلمانوں (انصارِ مدینہ) کے اور اُن کے جنہوں نے اِن کی اتباع کی، ان کے ساتھ آ کر ملے اور ساتھ جہاد کیا، کے مابین ہے، کہ یہ لوگ دوسرے لوگوں سے جدا ایک امت ہیں'' پھر لکھا گیا کہ مسلمانوں کے مابین تعلق کی بنیاد کیا ہوگی اور مومنوں کے آپسی رشتوں کے بیان میں ہی یہودیوں کا بھی ذکر کیا، چنانچہ یہ تحریر کیا گیا کہ: ''کوئی مومن کسی کافر کیلئے ایک مومن کو قتل نہیں کر سکتا اور نہ ہی ایک مومن کسی مومن کے مقابلے میں ایک کافر کی مدد کر سکتا ہے۔ اللہ کی حفاظت سب کیلئے ہے اور یہ ان میں سے ادنیٰ ترین کے لیے بھی ہے۔ مسلمان دوسرے لوگوں سے جدا، آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ یہود جو ہماری اتباع کریں سو اُن کیلئے ہماری مدد ہے۔ اُن کے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوگا اور اُن کے کسی دشمن کو مدد نہیں دی جائیگی۔ مسلمانوں کا امن ایک ہے۔ پس اللہ کی راہ میں قتال کے دوران ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو چھوڑ کر دشمن سے امن نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ یہ برابری پر ہو''۔ دستاویز کی اس شِق میں یہود سے مراد وہ یہودی نہیں ہیں جو مدینہ کے اطراف میں تھے، بلکہ اس سے مراد ایسا کوئی بھی یہودی ہے جو اس اسلامی ریاست کے تحت اس کا شہری بننا

چاہے، تو اس کی حفاظت کی جائے گی اور وہ معاملات میں مسلمانوں جیسے حقوق اور سلوک کا حقدار ہو گا، اوراس کی حیثیت ذمی کی ہوگی۔ جہاں تک دستاویز میں شامل یہودیوں کے قبائل کا تعلق ہے تو ان کا ذکر ان کے قبائل کے نام کے ساتھ دستاویز کے آخر میں مسلمانوں کے تعلقات کے وضع کئے جانے کے بعد کیا گیا ہے، اِن میں بنی عوف اور بنی نجار وغیرہ کے یہود شامل ہیں۔ دستاویز کی شرائط کے ذریعے اُن کی اسلامی ریاست میں حیثیت کا تعین کیا گیا ہے۔ دستاویز کے متن میں بڑی صراحت سے یہ بات طے کی گئی ہے کہ یہودیوں کے مسلمانوں سے معاملات کا تعین اسلام کی بنیاد پر ہوگا اوراس بات پر کہ وہ اسلام کی اتھارٹی کے تحت ہوں گے اور وہ ہراُس امر کی پابندی کریں گے جو اسلامی ریاست کے مفادات ومصالح کا لازمی تقاضا ہو۔ چنانچہ دستاویز کے متن کے متعدد نکات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

(1) یہودیوں کے قریبی دوست، انہی کی طرح ہیں، یہ لوگ محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جائیں گے۔

(2) یثرب (مدینہ) اس دستاویز میں لکھے گئے لوگوں کی پناہ گاہ ہوگی۔

(3) اس دستاویز میں شامل لوگوں کے مابین اگر کوئی ایسی بات ہو جائے جس سے فساد کا اندیشہ ہو، تو یہ معاملہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف (فیصلے کیلئے) لایا جائے گا۔

(4) قریش مکہ کو یا اُن کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائیگی۔

اس طرح مدینے کے اطراف کے یہودیوں کی حیثیت کا تعین کیا گیا اور ان پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ مدینہ چھوڑ کر نہیں جا سکتے سوائے آپ ﷺ کی یعنی اسلامی ریاست کی اجازت کے ساتھ، اور یہ کہ وہ مدینہ کی حرمت کے پابند ہونگے یعنی وہ نہ تو مدینہ پر جنگ کر سکیں گے اور نہ کسی ایسے فریق کی مدد کرینگے جو مدینہ پر حملہ کرے، وہ نہ تو قریشِ مکہ کو اور نہ اُن کے کسی حلیف کو پناہ دینگے اور یہ کہ اُن کے کسی بھی معاملے میں اختلاف کی صورت میں فیصلہ رسول اللہ ﷺ فرمائینگے۔

یہودی ان شرائط کو مان گئے اور اُن کے قبائل جیسا کہ بنی عوف، بنی نجار، بنی حارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی الأوس اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں نے اس دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ اس دستاویز پر دستخط ثبت کرنے میں بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنو قینقاع اُس وقت شامل نہیں ہوئے تھے، لیکن کچھ عرصے بعد نبی ﷺ اور ان کے مابین بھی اسی طرح کی دستاویز طے پا گئی۔ اور یہود نے اس دستاویز میں مذکور شرائط کو تسلیم کر لیا۔

اس دستاویز کے طے ہو جانے سے آپ ﷺ نے اسلامی ریاست کے شہریوں کے مابین تعلقات کو واضح بنیادوں پر استوار کر دیا اور اسلامی ریاست اور اس کے اردگرد بسنے والے یہودی قبائل کے درمیان تعلقات کو بھی واضح بنیادوں پر طے کر دیا، یعنی اسلام کی حکمرانی ہی ان تعلقات کی بنیاد ہو گی۔ رسول اللہ اسلامی معاشرے کی تشکیل پر مطمئن تھے، یہودی ہمسایوں اور مسلمانوں کے دشمنوں کی طرف سے کسی غدّاری کا فوری خطرہ نہیں تھا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے جہاد کی قوت سے اُن مادی رکاوٹوں کو ہٹانے کا عمل شروع کیا جو اسلام کی دعوت کی راہ میں حائل تھیں۔

باب نمبر 13

جہاد کی تیاری

اب جبکہ آپ ﷺ مدینہ کے معاشرے کی طرف سے مطمئن ہو گئے اور پڑوسی یہودیوں سے معاہدات ہو چکے تھے، تو آپ ﷺ نے مدینہ میں جہاد کی تیاری شروع کی، کیونکہ اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے علاقۂ اقتدار میں اسلامی احکامات کو مکمل طور پر نافذ کرے اور اپنی سرحدوں سے باہر اسلامی دعوت کو پہنچائے۔ اسلامی ریاست اسلام کی دعوت کو عیسائی مشنریوں کی طرح مشنری طریقے سے نہیں پھیلاتی، بلکہ اسلامی ریاست اسلام کی طرف بلاتی ہے، لوگوں کی اسلامی افکار اور احکامات کے ذریعے تربیت کرتی ہے اور اس دعوت کے راستے میں حائل کسی بھی مادی رکاوٹ کو ایسی قوت کے ذریعے زائل کرتی ہے جو ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی قابلیت رکھتی ہو۔

قریش اسلامی دعوت کے راستے میں مادی رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور یہ ضروری تھا کہ ایک ایسی قوت تیار کی جائے جو اس رکاوٹ کو زائل کر سکے۔ پس اسلام کی دعوت کو مدینہ سے باہر پھیلانے کی غرض سے ایک فوج بنانے کی تیاری شروع ہوئی۔ آپ ﷺ نے قصداً کچھ اقدامات کئے جن کا مقصد ایک طرف تو قریش کو للکارنا تھا اور دوسری طرف مدینہ اور آس پاس کے یہودیوں اور منافقین پر رعب طاری کرنا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے چار ماہ کے دوران تین مہمات مدینہ کے

باہر بھیجیں۔ ایک مہم میں آپ ﷺ نے تیس مہاجر سواروں پر مشتمل ایک دستہ اپنے چچا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بھیجا، جو العیص کے مقام پر سمندر کے کنارے ابوجہل بن ھشام کی سربراہی میں جانے والے تین سو سواروں کے قافلے تک پہنچا۔ قریب تھا کہ ان کے مابین معرکہ ہوتا لیکن مجدی بن عمرو الجھنی کے بیچ بچاؤ سے یہ لڑائی نہ ہوئی اور حمزہ رضی اللہ عنہ بغیر قتال کئے مدینہ واپس پہنچے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک اور دستہ ابوعبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ کیا، یہ دستہ بھی صرف مہاجر سواروں پر مشتمل تھا جن کی تعداد ساٹھ تھی۔ اس کا سامنا عکرمہ بن ابی جہل سے وادیٔ رابغ میں ہوا، مسلمانوں کی طرف سے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے تیر چلایا لیکن بات آگے نہ بڑھی اور فریقین واپس لوٹ گئے۔ اس کے بعد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بیس سواروں کے دستے کی قیادت دے کر مکہ کی جانب بھیجا گیا۔ یہ دستہ بھی بغیر معرکہ آرائی کے لوٹ آیا۔ ان مہمات سے ایک تو مدینہ میں جہاد کی فضاء بنی اور دوسری طرف قریش پر جنگ کی ہیبت طاری ہوگئی اور اب وہ رسول اللہ ﷺ سے ایسا خطرہ محسوس کرنے لگے جو انہیں پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا اور اگر یہ مہمات نہ بھیجی گئی ہوتیں تو قریش کو اس بات کا احساس نہ ہوتا۔ آپ ﷺ نے محض اتنے پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ ہجرت کے ایک سال بعد آپ ﷺ خود ایک مہم پر روانہ ہوئے، آپ کے ساتھ سعد بن عبادہ بھی تھے، آپ ﷺ قریش اور بنی ضمرہ کو تلاش کرتے ہوئے الأبوا اور پھر ودّان تک پہنچے۔ قریش تو نہیں ملے، البتہ بنی ضمرہ نے آپ ﷺ سے صلح کر لی۔ اس کے ایک مہینے بعد آپ دو سو انصار اور مہاجرین پر مشتمل ایک دستہ لے کر نکلے، حتیٰ کہ آپ بواط پہنچ گئے۔ وہاں پر امیہ بن خلف کی قیادت میں ایک قافلے سے آمنا سامنا ہوا۔ اس قافلے میں 2500 مویشی تھے، جس کی حفاظت کے لیے سو جنگجو ساتھ تھے۔ اس بار بھی مقابلہ نہیں ہوا کیونکہ یہ قافلہ مسلمانوں کے لشکر سے بچ کر ایک ایسے راستے سے نکل گیا جس پر عام طور پر کوئی نہیں جاتا تھا۔ اس کے تین ماہ بعد ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ کو مدینہ کی ذمہ داری دے کر آپ ﷺ 200 سے زائد افراد کی فوج کے ہمراہ ینبع کے علاقے میں العشیرہ کے مقام پر پہنچے، یہ بات جمادیٰ الاول کے آخر کی ہے، وہیں آپ ﷺ نے جمادیٰ الاخر کے ابتدائی دنوں تک قریش کے ایک قافلے کا انتظار کیا جو ابوسفیان کی

قیادت میں آ رہا تھا۔ یہ ہجرت کا دوسرا سال تھا، بہر حال قریش کے قافلے سے ٹکراؤ نہیں ہوا لیکن یہ مہم رائیگاں نہ گئی، اس کے دوران بنی مُدلج اور اُن کے حلیف بنی ضمرہ کے قبائل سے معاہدے ہوئے۔ ابھی اس مہم سے مدینہ واپسی کو دس دن ہی گزرے تھے کہ قریش کے ایک حلیف کرز بن جابر الفہری نے مدینہ کے اونٹوں اور مویشیوں پر حملہ کیا، آپ ﷺ مدینہ کی ذمہ داری زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سونپ کر، خود اس کی تلاش میں روانہ ہوئے اور بدر کی جانب سفوان کی وادی تک پیچھا کیا لیکن وہ پکڑا نہ جا سکا۔ یہ بدرِ اول ہے۔

اس طرح رسول اللہ نے اپنی فوج کے ذریعے جزیرہ نما عرب میں گشت اور فوجی مہمات کی روانگی کے ذریعے قریش کو چیلنج کرنا شروع کیا۔ اگرچہ اِن مہمات میں کوئی باقاعدہ لڑائی نہیں ہوئی تاہم اس کے نتائج زبردست تھے، ان اقدامات نے بڑی جنگوں کی راہ ہموار کی اور مسلمانوں کو دشمن کا مقابلہ کرنے اور اس سے جنگ کرنے پر تیار کیا۔ مزید یہ کہ اس سے مدینہ اور اطراف کے یہود اور منافقین بھی ڈر گئے کہ اگر وہ کسی قسم کی مہم جوئی کے بارے میں سوچ بھی رہے ہوں تو باز آ جائیں۔ مزید برآں قریش کی ہمتیں پست ہوئیں اور مسلمانوں کے دشمنوں کے دل میں رعب پیدا ہوا۔ پھر اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مدینہ اور بحر احمر کے درمیان جو قبائل آباد تھے جیسے بنی مُدْلج اور بنی ضمْرہ اُن سے معاہدات ہو گئے اور یہ قبائل مکہ اور شام کے تجارتی راستے میں آتے تھے۔

جہاد کی شروعات

مدینہ میں اسلامی قوانین سے متعلق آیات نازل ہورہی تھیں اور رسول اللہ ﷺ مسلسل اسلامی احکام کو معاشرے پر نافذ کررہے تھے۔ آپ ﷺ اسلامی ریاست کو مضبوط بنا رہے تھے اور معاشرے کو اسلام اور اسکے نظاموں پر استوار کررہے تھے۔ آپ نے مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا اور یہی وہ وقت تھا جب اسلام معاشرے میں ایک نظام اور قانون کی حیثیت سے زندہ و متحرک ہوگیا، جسے ایک معاشرے نے اختیار کرلیا تھا اور اُس معاشرے نے اس کی دعوت کو پھیلانے کی ذمہ داری بھی لے لی تھی۔ مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا تھا، ساتھ ہی مسلمانوں کی طاقت اور حفاظتی قوت بھی بڑھ رہی تھی۔ مشرکین اور یہود فرداً فرداً اور گروہ در گروہ اسلام میں شامل ہورہے تھے۔ جب مدینہ کے اندر اسلام اور اسکی دعوت کی طرف سے آپ ﷺ مطمئن ہوئے تو باقی جزیرہ نما عرب میں دعوت پر توجہ مرکوز کی۔ لیکن آپ ﷺ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش اس دعوت کی راہ میں ایک مادی رکاوٹ ہیں اور اِن پر اسلام کے قطعی دلائل و براہین کا کوئی اثر ہونے والا نہیں، پس یہ ضروری تھا کہ مادی رکاوٹ کو مادی قوت سے زائل کیا جائے۔ جب آپ ﷺ مکہ میں تھے تو آپ اس مادی قوت کو زائل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اسلام کے پاس کوئی ریاست نہ تھی جو ایک ایسی فوج تیار کر سکے جو ایسی مادی رکاوٹوں کے ازالے کیلئے ناگزیر ہے۔ لیکن اب ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی اور اس بات پر قادر تھی کہ دعوت میں

رکاوٹ بننے والی اس قوت کو اپنے زورِ بازو سے زیر کر دے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ اس قوت کو تیار کیا جائے اور جنگی فضاء قائم کی جائے اور دعوت کے لیے ایک نئی پالیسی کو اختیار کیا جائے، بعد یہ کہ اس پالیسی کے اسباب و وسائل کو میسر بنایا جائے۔

اسی غرض سے آپ ﷺ نے فوجی مہمات شروع کی تھیں جن میں سے بعض میں آپ ﷺ خود بھی شریک رہے تھے تا کہ قریش کو چیلنج کیا جائے۔ ان مہمات میں سب سے آخری مہم عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی مہم تھی۔ اور یہ مہم معرکۂ بدر کا پیش خیمہ بنی۔ اس مہم کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے دوسرے سال ماہِ رجب میں عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو مہاجرین کی جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ آپ ﷺ نے عبداللہ کو ایک خط اس حکم کے ساتھ دیا کہ اسے دو دن سفر کے بعد کھولا جائے اور اس میں لکھے ہوئے حکم پر عمل کیا جائے اور کسی بھی ساتھی پر کوئی سختی نہ کی جائے۔ حسبِ حکم جب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وہ خط کھولا تو اُس میں لکھا تھا: ''یہ خط پڑھنے کے بعد مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ میں پہنچو اور قریش پر نگاہ رکھو، اور ہمیں اُن کے حالات سے آگاہ کرو''۔ اُنہوں نے اپنے ساتھیوں کو آپ ﷺ کا حکم سنایا اور بتایا کہ یہ حکم بھی دیا ہے کہ ساتھ چلنے کے لیے کسی پر سختی نہ کی جائے۔ پس عبداللہ بن جحش کے ساتھی آپؓ کے ساتھ چلے یہاں تک کہ وہ نخلہ پہنچے۔ اور ان میں سے سعد بن ابی وقاص الزہریؓ اور عتبہ بن غزوانؓ کے سوا کوئی پیچھے نہ رہا کہ جن کا اونٹ گم ہو گیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں نکل گئے اور باقی ساتھیوں سے بچھڑ گئے۔ اور آخر کار دونوں قریش کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے انہیں پکڑ کر قید کر دیا۔ ادھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نخلہ میں قریش کی تاک میں بیٹھے تھے کہ ایک کارواں گزرا جس میں کچھ تجارتی سامان تھا۔ یہ رجب کے آخری دن تھے جو حرمت کا مہینہ تھا، چنانچہ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، لوگوں کی رائے یہ تھی اس معاملے میں نبی ﷺ نے ہمیں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا لیکن اگر ہم اِنہیں آج کی رات چھوڑ دیتے ہیں تو یہ حرم میں داخل ہو جائینگے اور ہماری زد سے باہر بھی، لیکن اگر ہم لڑتے ہیں تو یہ حرام مہینوں میں لڑائی ہوگی۔ پہلے تو وہ لڑنے سے ہچکچائے اور ڈرے لیکن پھر ایک دوسرے کو

حوصلہ دیا اور بالآخر لڑنے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں میں سے ایک نے قافلے کے سردار عمرو بن الحضرمی کا نشانہ لیا اور وہ مارا گیا۔ مسلمانوں نے قریش کے دو آدمیوں کو قیدی بنایا، سامان اپنے قبضے میں لیا اور مدینہ لوٹ آئے۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا کہ ''میں نے تمہیں حرام مہینے میں قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔'' آپ ﷺ نے مویشیوں اور قیدیوں کو جوں کا توں رکھا اور اس میں سے کوئی چیز نہ لی۔

یہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی مہم کا خلاصہ ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ قریش کی خبر لائیں، لیکن ہوا یہ کہ حملہ ہوا، ایک قتل ہوا، قیدی بنائے گئے اور سامان ضبط کیا گیا اور یہ سب رجب کے حرام مہینے میں ہوا۔ اب اس معاملے میں اسلام کا حکم کیا ہوگا؟ آپ ﷺ اسی پر غور فرما رہے تھے اور اللہ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے، اسی لئے آپ ﷺ نے قیدیوں اور مال کے معاملے کو جوں کا توں رکھا۔ قریش نے اس واقعے کو موقع جان کر سارے عرب میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور یہ بات پھیلائی کہ رسول اللہ ﷺ اور اُن کے اصحاب رضی اللہ عنہ نے حرام مہینوں کی حرمت کا پاس نہیں رکھا اور حرمت والے مہینے میں قتال کیا، سامان ضبط کیا اور آدمیوں کو قیدی بنایا۔ مکہ میں جو مسلمان بچے تھے، قریش اُن سے بھی الجھے، اُن مسلمانوں نے یہ صفائی پیش کی کہ یہ معاملہ شعبان میں ہوا تھا نہ کہ رجب میں لیکن یہ وضاحت کافی نہیں تھی، اور یہ قریش کے پروپیگنڈے کو رد نہ کر سکی۔ یہودی بھی قریش کا ساتھ دینے لگے اور عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ پر الزام لگانے لگے۔ اس پروپیگنڈے سے مسلمانوں کا جینا محال ہو گیا، ادھر آپ ﷺ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے، حتیٰ کہ اللہ کا حکم نازل ہوا:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾

”لوگ اُن سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی بابت کا سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ سنگین ہے، یہ فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے، یہ لوگ تم سے لڑائی کرتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں“ (البقرة: 217)

اب اِن آیات کے نازل ہونے پر آپ ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم کیا اور قریش کے دو قیدیوں کے عوض سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کی رہائی حاصل کی۔ یہ آیات قریش کی الزام تراشیوں کا کڑا جواب تھیں۔ قریش کا یہ کہنا تھا کہ حرمات کے مہینوں میں قتال ایک بڑا جرم ہے، قرآن نے جواب دیا کہ اس سے بڑا جرم لوگوں کو حرمِ کعبہ سے دور رکھنا اور وہاں سے نکل جانے پر مجبور کرنا ہے۔ قریش کی طرف سے مسلمانوں کو اُن کے دین کے سبب ڈرانا، ان پر تشدد کرنا اور انہیں حراساں کرنا یہ حرمات کے مہینوں میں یا دیگر مہینوں میں لڑنے سے زیادہ سنگین ہیں۔ قریش نے بلاتوقف مسلمانوں پر مظالم کیئے تاکہ اُنہیں اُن کے دین سے ہٹا سکیں، اسلئے اب مسلمانوں کو یہ حق تھا کہ وہ اِن مہینوں میں بھی قتال کریں، اُن کے لئے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔ اور ان قریش کا بس چلے تو وہ مسلمانوں سے لڑتے رہیں یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیں۔ یہ قریش ہی تھے کہ جو دعوت کی راہ میں آڑ بن کر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روک کر، اللہ سے کفر کرکے، مسجدِ حرام کے لوگوں کو وہاں سے نکال کر اور مسلمانوں پر ان کے دین کے سبب ظلم کرکے عظیم جرم اور گناہ کے مرتکب ہورہے تھے۔ چنانچہ وہ اسی بات کے حقدار ہیں کہ اُن سے جب مناسب ہو قتال کیا جائے، خواہ وہ حرمت کے مہینے ہوں یا دوسرے۔ چنانچہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی معرکہ آرائی نہ اُن کیلئے اور نہ ہی مسلمانوں کیلئے باعثِ شرم تھی۔

بلکہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی جنگی مہم اسلامی سیاست اور اسلامی دعوت کی پالیسی میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں واقد ابن عبداللہ التمیمی رضی اللہ عنہ کا پھینکا ہوا تیر عمرو الحضرمی کو لگا اور وہ ہلاک ہوا، یہ پہلا خون تھا جو اللہ کی راہ میں بہایا گیا۔

ان آیات سے پہلے حرام مہینوں میں قتال کی ممانعت تھی، اب مسلمان کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت لڑ سکتے تھے، اِن آیاتِ قتال کے عمومی حکم سے حرام مہینوں میں قتال کی پابندی منسوخ ہو گئی۔

باب نمبر 15

مدینہ کی زندگی

اسلام ایک مخصوص ضابطہ حیات ہے جس کا ماخذ زندگی کے بارے میں اسلام کے مخصوص مفہوم وتصورات ہیں۔ اسلام کی تہذیب دوسری تمام تہذیبوں سے جدا اور یکسر مختلف ہے۔ اسلام کے ضابطۂ حیات کی تین نمایاں خصوصیات یہ ہیں: **اول**: یہ اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر استوار ہے، **دوم**: اس میں زندگی کے اعمال کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی ہیں یعنی اس ضابطہ حیات میں زندگی کی تصویر حلال وحرام سے عبارت ہے، اور **سوم**: خوشی کے معنی اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے یعنی حقیقی اور دائمی سکون اللہ تعالیٰ کی رضا ہی میں ہے۔ یہی اسلامی طرزِ زندگی ہے اور یہی وہ زندگی ہے جس کی طرف مسلمان کو رغبت کرنی چاہیئے اور جس کے لیے اسے کوشش کرنی چاہیے اور اسی طرزِ زندگی کو اسے اختیار کرنا چاہیے۔ مندرجہ بالا کو ممکن بنانے کیلئے ناگزیر ہے کہ ایک اسلامی ریاست موجود ہو جو اسلام کے احکامات کو مکمل طور پر اور بغیر کسی استثناء کے جاری اور نافذ کرے۔ مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اُنھوں نے مخصوص طرزِ زندگی کی شروعات کی، جس کی بنیاد اسلامی عقیدہ پر تھی۔ اب معاملات اور عقوبات سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام آیات کی شکل میں نازل ہونا شروع ہوئے۔ عبادات سے متعلق بھی ایسے احکامات نازل ہوئے جو اب تک نازل نہیں ہوئے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال زکوٰۃ اور روزہ فرض ہوئے

اور اذان شرع ہوئی، اہلِ مدینہ نے بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی میٹھی آواز میں ہر دن پانچ بار اہلِ ایمان کو بلاتے سنا، اور مسلمان اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے نمازوں کے لیے نکلتے۔ آپ ﷺ کے مدینہ میں سترہ ماہ قیام کے بعد اللہ نے نماز کے لیے قبلہ تبدیل کر دیا اور کعبہ کو قبلہ قرار دے دیا۔ عبادات، طعام، اخلاقیات، معاملات اور عقوبات سے متعلق مسلسل آیات نازل ہوتی رہیں۔ اِن آیات میں نشہ آور چیزوں اور خنزیر کو حرام قرار دیا گیا، حدود اور جنائیات کے احکام نازل ہوئے، تجارت اور سود کے بارے میں آیات نازل ہوئیں اور اسی طرح دیگر امور کے متعلق آیات نازل ہوئیں۔ جب بھی زندگی کے مسائل سے متعلق اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نازل ہوتا، آپ ﷺ اسے لوگوں کو سناتے، سمجھاتے اور اس پر پابندی کا حکم دیتے۔ آپ ﷺ مسلمانوں کے امور کا اہتمام فرماتے، اُن کے تنازعات کا فیصلہ کرتے، اُن کے معاملات اور امور کی دیکھ بھال کرتے اور مشکلوں کو سلجھاتے۔ یہ سب کبھی آپ ﷺ اپنے قول سے کرتے، کبھی اپنے افعال سے جو آپ ﷺ انجام دیتے، اور کبھی اُن افعال پر اپنی خاموشی سے جو آپ ﷺ کے سامنے سرزد ہوتے، کیونکہ آپ ﷺ کا قول، فعل اور خاموشی تینوں ہی شریعت کا حصہ ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى O اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى﴾ (النجم : 4-3)

''اور نبی ﷺ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے ہیں۔ ماسوائے وہ وحی جو ان پر نازل کی جاتی ہے''

مدینہ میں زندگی ایک معین نقطہ نظر پر رواں تھی جو کہ اسلام کا نقطہ نظر ہے۔ مدینہ کی زندگی اس بناء پر دوسرے معاشروں سے منفرد اور یکسر مختلف تھی کہ وہاں افکار، احساسات اور وہ نظام جس سے معاملاتِ زندگی حل ہو رہے تھے اور ان کے آپسی تعلقات استوار ہو رہے تھے، سب اسلامی تھے۔ آپ ﷺ اس بات پر خوش تھے کہ دعوت اب اس مقام پر پہنچ گئی تھی اور مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلام کے احکام اور اوامر پر سکون و اطمینان کے ساتھ کاربند تھے اور انہیں اذیتوں اور دین سے ہٹائے جانے کا خوف دامن گیر نہ تھا۔ لوگوں کے مسائل اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق

حل ہورہے تھے اور اگر کوئی نیا مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ آپ ﷺ کے پاس فیصلے کیلئے لایا جاتا، کوئی عمل خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس پر اللہ کے اوامر کے مطابق عمل کیا جاتا اور مسلمان ہر اس چیز سے باز رہتے جس سے اللہ نے منع فرمایا تھا۔ یہ زندگی لوگوں کے لیے اطمینان اور خوشی وسعادت کا باعث تھی۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتی تھی تاکہ آپ ﷺ انہیں اللہ کے حکامات کی تعلیم دیں، اور وہ قرآن سیکھیں اور یاد کریں اور رسول اللہ ﷺ ان کی تربیت کریں۔ اسلام پھیل رہا تھا اور مسلمانوں اور اسلام کی طاقت بڑھتی جارہی تھی۔

باب نمبر 16

یہودیوں اور عیسائیوں سے بحث ومباحثہ

غیر مسلموں کو مسلمانوں کی قوت کا اندازہ بہت جلد ہو گیا۔ وہ یہ جان رہے تھے کہ مسلمانوں کی قوت اس بات سے ہے کہ یہ اسلام کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مسلمان اپنے اعمال میں ایسے مگن ہیں کہ یہ صبح ہونے پر شام کا شام ہونے پر صبح کا انتظار نہیں کرتے۔ مسلمان اپنے دین سے خوش ہیں، اسکے احکامات نافذ کرتے ہیں، اسکا کلمہ بلند کرتے ہیں اور اس پر مطمئن اور راضی ہیں۔ اسلام کے دشمنوں کو یہ بات ہضم نہ ہوئی اور اس کے اثرات سب سے پہلے مدینہ کے آس پاس کے یہودیوں میں نظر آئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی قوت وشوکت میں اضافہ ہو رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں تو یہودیوں کو مسلمانوں سے خطرہ محسوس ہوا اور وہ اسلام اور آپ ﷺ کے حوالے سے اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے لگے۔ یہودی اس بات پر شدید برہم تھے کہ اُنہی میں سے بعض لوگ اسلام قبول کر چکے تھے اور اس سے یہودیوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اسلام ان کی صفوں میں سرایت نہ کر جائے اور ان کے لوگوں پر نہ چھا جائے، پس وہ اسلام، اسکے عقائد اور احکام پر حملے کرنے لگے اور یہ حملے اُن حملوں سے زیادہ شدید تھے جو مکہ کے قریش کیا کرتے تھے۔ سازشیں، مکر، نفاق، سابقہ انبیاء کے حالات وواقعات سے یہودیوں کی واقفیت وہ ہتھیار تھے، جس سے یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے خلاف فکری جنگ شروع کی۔ ان کے کچھ پیشوا بظاہر مسلمان بھی ہوئے، وہ مسلمانوں میں بیٹھتے اور اپنے تقویٰ کا اظہار کرتے لیکن کچھ ہی عرصے بعد شکوک اور غیر یقینی کا اظہار

کرتے اور آپ ﷺ سے اس غرض سے سوالات کرتے کہ اسلامی عقیدہ پر مسلمانوں کے یقین کو متزلزل کیا جائے۔ اوس وخزرج کے کچھ اور لوگ جو انہی کی طرح محض بظاہر اسلام لائے تھے، اِن کا ساتھ دیتے تھے تاکہ مسلمان تذبذب اور تردد کا شکار ہوں اور اِن میں دشمنی اور مخاصمت پڑ جائے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اِن کے آپس میں معاہدے تھے، بحث ومباحثے بسا اوقات ہاتھا پائی کی شکل اختیار کر لیتے تھے جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا جو کہ حلیم، دانا اور سلجھی ہوئی شخصیت کے حامل تھے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ فنحاص نامی ایک یہودی کو اللہ کا خوف دلا رہے تھے اور اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ اس نے جواب دیا کہ ''ہم اللہ کی طرح فقیر نہیں ہیں بلکہ وہ خود فقیر ہے، ہم اس کے محتاج نہیں بلکہ وہ ہمارا محتاج ہے، اگر وہ ہمارا محتاج نہ ہوتا تو ہم سے قرض نہ مانگتا، جیسا کہ تمہارا نبی بتاتا ہے۔ اس نے تم پر تو سود حرام کر دیا ہے اور ہمارے لئے حلال کیا ہے۔ اگر وہ ہمارا محتاج نہ ہوتا تو ہمیں سود کیوں دیتا۔'' فنحاص دراصل اللہ تعالی کے اس فرمان کا حوالہ دے رہا تھا:

﴿مَنْ ذَ الَّذِی یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً﴾

''کون ہے ایسا جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے پس اللہ تعالیٰ اس کو بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائیں گے'' (البقرة : 245)

اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا اور اُنہوں نے یہودی کے منہ پر یہ کہتے ہوئے طمانچہ مار دیا ''کہ اے اللہ کے دشمن اگر ہمارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیرا سر قلم کر دیتا۔'' اس طرح مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان بحثیں کافی عرصہ تک چلتی رہیں۔ اس اثناء میں نجران سے ساٹھ عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ آیا۔ اُنہیں یہ علم تھا کہ مدینہ میں مسلمانوں اور یہودیوں میں اختلاف ہے، سو اُن کا مقصد تھا کہ کسی طرح اس بحث ومباحثے کو استعمال کر کے مسلمانوں اور یہودیوں میں دشمنی پیدا کر دی جائے، تاکہ پھر اس دینِ قدیم (یہودیت) اور دینِ جدید (اسلام) کے معرکے سے یہ دونوں کمزور ہو جائیں اور عیسائیت کا بول بالا ہو جائے۔ یہ وفد رسول اللہ ﷺ اور یہودیوں

سے ملا۔ آپ ﷺ بہرحال نصرانی اور یہودیوں کو اہلِ کتاب سمجھتے تھے اور دونوں کو ہی اسلام کی دعوت دیتے تھے اور دونوں کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سناتے تھے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾

''آپ کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا کارساز سمجھیں۔ پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں'' (ال عمران: 64)

یہودیوں اور عیسائیوں کے اس سوال کے بارے میں کہ آپ ﷺ انبیاء میں سے کس کو مانتے ہیں آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سناتے:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾

''اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو چیز ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی، اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے انبیا کو دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ (البقرۃ: 136)

اب اُن کے پاس کہنے کو اور کچھ نہ ہوتا۔ ان دلائل کا ان پر اثر بھی ہوتا تھا لیکن وہ ایمان نہیں لاتے تھے کیونکہ ایسا کرنے سے اُن کا مرتبہ اور مقام ختم ہوتا تھا۔ یہ بات اُن میں سے بعض نے تسلیم بھی کی، مثلاً نجران کے وفد کا ایک شخص ابوحارثہ جو اس وفد میں اپنے علم و مرتبے میں بلند فضیلت رکھتا

تھا، اس سے جب اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا کہ اب تمہیں کیا بات اسلام قبول کرنے سے روک رہی ہے؟ تو اس نے کہا: ''رومیوں نے ہمیں مال، عزت اور اعزاز سے نوازا ہے، اور ہمیں اسلام کی مخالفت کرنے کو کہا ہے، اگر ہم اسلام کو تسلیم کرلیں گے تو وہ (نصرانی رومی) ہم سے یہ سب چھین لینگے''۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو چیز انہیں اسلام قبول کرنے سے روک رہی تھی وہ اِن کا اپنا مفاد اور ہٹ دھرمی تھی۔ آپ ﷺ نے عیسائیوں کو قرآن حکیم کی یہ آیات سنائیں اور ایک مباہلے کی دعوت دی:

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ كُمْ وَنِسَآءَ نَا وَ نِسَآءَ كُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾

''اس لیے جو شخص آپ کے پاس اس علم کے آجانے کے بعد بھی آپ سے اس میں جھگڑے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو اور اپنی اپنی جانوں کو بلائیں، پھر عاجزی کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں''۔ (ال عمران: 61)

اس وفد نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ ہم آپ ﷺ سے مباہلہ نہیں کرنا چاہتے آپ ﷺ اپنے دین پر قائم رہیں اور ہم اپنے دین پر۔ ساتھ ہی یہ عرض کی کہ آپ ﷺ اُن کے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیج دیں جو اُن کے (عیسائیوں کے) درمیان مالی معاملات میں اختلاف کی صورت میں فیصلہ کر سکے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ابوعبیدہ بن جراحؓ کو اس وفد کے ساتھ کیا کہ وہ عیسائیوں کے مالی معاملات میں اسلام کے مطابق فیصلے کریں۔

اس طرح اسلام کی دعوت، افکار کی قوت اور مضبوط استدلال یہود و نصاریٰ اور منافقین کے کلامی مباحثوں پر غالب آیا اور تمام باطل افکار زائل ہوکر رہ گئے اور صرف اسلام ہی اپنی صحیح آئیڈیالوجی کی بنا پر حاوی رہا۔ لوگ اسی کے احکامات کے فہم کو موضوعِ گفتگو بناتے اور اسی کی دعوت دیتے۔ اسلام مدینہ میں گہرائی سے پیوست ہو گیا تھا اور اس کا جھنڈا فکر اور احکامات کے

لحاظ سے ہر چیز پر چھا گیا۔ البتہ منافقین اور یہود کے قلوب مسلمانوں کے خلاف نفرت اور کینہ سے بھرے رہے۔ تاہم اسلام کی اتھارٹی اور مستحکم اسلامی معاشرہ ہر چیز پر غالب آ گیا۔ پے در پے فوجی مہمات اور قوت کے مظاہرے کے نتیجے میں یہ بیمار ذہن لوگ سکوت پر مجبور ہو گئے اور اسلام کا کلمہ بلند ہو گیا۔ چنانچہ مدینہ اور اُس کے آس پاس اسلام کے دشمنوں نے یا تو خاموشی اختیار کر لی یا خود کو اسلامی حکومت کے ماتحت کر لیا۔

باب نمبر 17

غزوۂ بدر

2 ہجری رمضان کی آٹھ تاریخ کو آپ ﷺ اپنے تین سو پانچ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ وہ ستّر اونٹوں پر سوار تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مدینہ میں نماز کی امامت کیلئے عمرو بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا جبکہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا۔ ہر ایک اونٹ پر دو، تین یا چار صحابہ اپنی اپنی باری پر سوار ہوتے تھے اور یہ قافلہ ابوسفیان کے قافلے کے تعاقب میں تھا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ قافلہ ابوسفیان کے قافلے کے بارے میں خبر حاصل کرتے کرتے ذَفران کی وادی پہنچا اور وہاں خیمہ زن ہو گیا۔ یہاں یہ خبر ملی کہ قریشِ مکہ ابوسفیان کے قافلے کی حفاظت کے لیے مکہ سے نکل پڑے ہیں۔ اب معاملہ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب ابوسفیان کے قافلے سے ٹکراؤ کا سوال نہیں تھا بلکہ معاملہ یہ تھا کہ کیا قریش سے مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے دی، پھر مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا ''اے اللہ کے رسول آپ ﷺ چلئے جہاں اللہ کا حکم ہے اور ہم آپ کے ساتھ ہیں، ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہیں گے کہ جنھوں نے موسیٰ سے کہا تھا آپ اور آپ کا رب جانے اور قتال کرے اور ہم اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ آپ اور آپ کا رب قتال کرے اور ہم آپ کے ساتھ قتال کرینگے، حتیٰ کہ اگر آپ ہمیں برک الغماد جانے کے لیے کہیں گے تو ہم وہاں بھی پہنچیں گے''۔ انصار خاموش تھے، آپ ﷺ نے سب کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے لوگو! اپنی رائے دو''۔ اس سے آپ ﷺ کی مراد انصار سے تھی جنھوں نے عقبہ میں آپ ﷺ کی اسی

طرح حفاظت کرنے کی بیعت کی تھی جس طرح وہ اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں، لیکن اُس میں مدینہ سے باہر جا کر لڑنا شامل نہیں تھا۔ لہٰذا جب انصار نے یہ محسوس کیا کہ اس سے اُن کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو انصار کے سردار تھے، کھڑے ہوئے اور فرمایا ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کی مراد ہم سے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بے شک ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کو سچا تسلیم کیا ہے اور جو پیغام آپ لائے ہیں اُس کی سچائی پر شہادت دی ہے اور آپ کی بات سننے اور حکم ماننے کا عہد کیا ہے، لہٰذا آپ جہاں چاہیں جائیے ہم آپ کے ساتھ ہیں اور قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو مبعوث فرمایا ہے، اگر آپ ہمیں سمندر میں چھلانگ لگانے کو بھی کہیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہونگے اور ہم میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہیگا، ہم دشمن سے کل ہی مقابلہ کو تیار ہیں، ہم جنگ میں تجربہ کار ہیں اور آپ ہم پر اعتماد کر سکتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ذریعے آپ کو ایسا کچھ دکھائے جو آپ کو خوش کر دے، لہٰذا آپ ہمیں اللہ کی رحمت کے ساتھ لے چلئے''۔ ابھی سعد رضی اللہ عنہ کی بات پوری نہیں ہونے پائی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک مسرت سے کھل اُٹھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کوچ کرو اور اللہ نے مجھے دو میں سے ایک گروہ پر فتح یابی کی بشارت دی ہے، میں ابھی سے دشمن کو زیر ہوتا دیکھ رہا ہوں''۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا قافلہ روانہ ہوا اور بدر کے قریب پہنچ گیا جہاں یہ پتہ چلا کہ قریش کا لشکر قریب آ پہنچا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو کچھ دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ بدر کے کنویں کی طرف بھیجا کہ وہ قریش کے حالات کی خبر لائیں۔ یہ صحابہ اپنے ساتھ قریش کے دو نوجوانوں کو پکڑ کر لائے جن کی معلومات سے یہ اندازہ ہوا کہ

سردارانِ قریش سب کے سب ابوسفیان کے قافلے کی حفاظت کیلئے اپنے ساتھ نوسو سے ایک ہزار افراد پر مشتمل قافلہ لے کر نکلے ہیں۔ یہ جان کر مدِ مقابل دشمن کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے اور شدید لڑائی متوقع ہے، رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ اہلِ مکہ نے اپنے سب سے بہادر افراد کو مقابلہ کیلئے روانہ کیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مطالبہ کیا کہ وہ اِس مہم کیلئے اپنی کمر کس لیں۔ مسلمانوں نے عہد کیا کہ وہ ڈٹ کر کفار کا مقابلہ کرینگے۔ مسلمان فوج نے کنوئیں کے اطراف اپنا ڈیرا ڈالا اور ایک حوض تیار کیا جسے پانی سے بھر دیا گیا اور باقی تمام کنوؤں کو بند کر دیا تا کہ اپنی فوج کو پانی مہیا ہوتا رہے اور کفار کو پانی میسر نہ آئے۔ رسول اللہ ﷺ کے قیام کیلئے ایک خیمہ تیار کیا گیا۔ دوسری طرف قریش نے بھی مسلمانوں کے مقابلے کے لیے پوزیشن سنبھال لی اور پھر جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ سب سے پہلے اسود ابن عبدالاسد مخزومی قریش کی صفوں سے نکل کر مقابلہ کیلئے آگے آیا تا کہ اُس حوض کو توڑ دے جس میں پانی بھرا گیا تھا۔ اس کے مقابلہ کیلئے حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آگے آئے اور ایک ہی وار سے اُس کے پاؤں کو اُس کے دھڑ سے الگ کر دیا، جس سے اسود پیٹھ کے بل گر پڑا اور اُس کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا اور پھر اُس حوض کے قریب ہی اگلے ہی وار میں حمزہ رضی اللہ عنہ نے اُس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد عتبہ بن ربیع اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کے ہمراہ آگے آیا جس کے مقابلہ کیلئے حمزہ، علی اور عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم آئے۔ حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو اور علی رضی اللہ عنہ نے ولید کو کچھ بھی مہلت دیئے بغیر موت کے گھاٹ اتار دیا پھر وہ عبیدہ رضی اللہ عنہ کی مدد کو آگے بڑھے جو عتبہ سے نبرد آزما تھے اور زخمی ہو گئے تھے، چنانچہ وہ عتبہ کو ختم کر کے عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ واپس لے آئے۔ پھر دونوں فوجیں ایک دوسرے کی طرف بڑھیں۔ یہ 17 رمضان 2 ھ کی صبح تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فوج کی صفوں کو آراستہ کیا اور اُنہیں لڑائی کی ترغیب کی۔ اس ترغیب سے اور خود رسول اللہ ﷺ کے اُن کے درمیان موجود ہونے سے صحابہ کے جوش میں اور اضافہ ہوگیا اور وہ آگے بڑھے اور قریش کی صفوں میں گھس گئے، ہر طرف قریش کے سر اُن کے دھڑوں سے جدا ہو کر گر رہے تھے اور مسلمانوں کے لبوں پر 'احد احد' کے نعرے رواں تھے جن سے فضاء گونج اُٹھی تھی، رسول اللہ ﷺ صفوں کے

درمیان تھے، آپ ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں اُٹھا کر قریش کی طرف پھینکیں اور فرمایا کہ ''قریش کے چہرے سیاہ ہوں۔'' اور اپنے صحابہ سے کہا: آگے بڑھو، مسلمان آگے بڑھے یہاں تک کہ معرکہ مسلمانوں کی فتح پر اختتام پزیر ہوگیا۔ قریش کے کئی سردار قتل ہوئے اور اس سے زیادہ افراد گرفتار کئے گئے اور باقی اپنی جان بچا کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔ اس طرح مسلمان ایک اہم اور شاندار فتح لے کر مدینہ لوٹے جس نے ان کی قوت میں مزید اضافہ کر دیا۔

باب نمبر 18

بنی قینُقاع کی ریاست بدری

جنگ بدر سے پہلے ہی یہودی مسلمانوں کو بری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بدر کی فتح کے بعد ان کی دشمنی میں مزید اضافہ ہوگیا اور وہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے لگے، اُنہیں مسلمانوں کے ساتھ اپنے معاہدے کا ذرا بھی پاس نہ تھا۔ جب بھی یہودی ان حدوں کو عبور کرتے تو مسلمانوں کی طرف سے انہیں سخت جواب ملتا۔ پس یہودی مسلمانوں کی پکڑ سے خوفزدہ رہتے تھے مگر بجائے یہ کہ وہ اپنے آپ کو سدھارتے ان کی ایذا رسانیوں میں اضافہ ہی ہوا۔ انہی میں سے ایک مثال اُس واقعہ کی ہے جو بنی قینقاع کے بازار میں پیش آیا، جب ایک مسلمان عورت اپنا زیور لے کر بنی قینقاع کے بازار میں ایک یہودی سُنار کی دکان پر گئی۔ چنانچہ جب وہ عورت اُس دکان پر بیٹھی ہوئی تھی تو پیچھے سے ایک یہودی نے نُکیلے کانٹے میں اُس عورت کے لباس کا پچھلا حصہ پھنسا دیا۔ پس جب وہ کھڑی ہونے لگی تو وہ بے پردہ ہوگئی اور یہودی مسلمان عورت پر ہنسنے لگے۔ عورت نے چیخ پکار کی جس پر ایک مسلمان یہودی پر جھپٹ پڑا اور اُسے قتل کر دیا۔ یہودیوں نے اسے گھیر لیا اور مار ڈالا۔ اب اس کے اہل وعیال کی پکار پر مسلمان جمع ہوئے اور یہودیوں پر حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تنازعہ شروع ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ پہلے ہی یہودیوں کو ان کی شرارتوں اور چالبازیوں پر تنبیہ کر چکے تھے۔ پس جب یہ واقع پیش آیا تو رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو لے کر نکلے اور بنو قینقاع کا محاصرہ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم

سے مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ بنی قینقاع کے یہود کو قتل کر دیا جائے، لیکن عبداللہ ابن اُبی ابن سلول نے، جو یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کا حلیف تھا، رسول اللہ ﷺ سے فریاد کی: اے محمد! میرے حلیف کے بارے میں احسان کیجئے۔ آپ ﷺ نے اس کی فرمائش کو نظر انداز کر دیا، اس نے پھر اپنی بات کو دہرایا، رسول اللہ نے پھر اس سے اعراض کیا۔ لیکن وہ اپنی بات دہراتا رہا جس پر آپ ﷺ نے اُس کی درخواست کو اس پر احسان کی غرض سے قبول کر لیا اور انہیں قتل نہ کرنے کا فیصلہ کیا اس شرط پر کہ وہ اپنے برے عمل کے بدلے میں مدینہ سے جلاوطن کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ بنی قینقاع کے یہودی مدینہ سے شمال کی سمت روانہ ہوئے اور شام جا کر بس گئے۔

باب نمبر 19

داخلی بغاوتوں کو کچلنا

مسلمانوں نے قریش کے ساتھ اپنی پہلی جنگ ،یعنی جنگِ بدر میں بھاری کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کامیابی نے قریش کو ہلا کر رکھ دیا۔ مدینہ داخلی طور پر یہودیوں کی سازشوں اور شرارتوں سے محفوظ ہو گیا۔ کچھ یہودیوں نے تو مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کر لیے اور بعض کو ملک بدر کر دیا گیا اور یوں مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن قریش خاموش نہ بیٹھے، وہ مسلمانوں سے بدر کی شکست کا انتقام لینے کی تیاری کرنے لگے۔ اس کا موقع اُنہیں اگلے ہی سال اُحد میں مل گیا جب مسلمانوں کے کچھ تیر اندازوں نے مال غنیمت اکھٹا کرنے کی غرض سے اپنے قائدؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے محاذ چھوڑ دیا اور نتیجتاً مسلمانوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ قریش بہت خوش تھے کہ انہوں نے اس شرم و ذلت کا ازالہ کر دیا تھا جو انہیں بدر میں دیکھنا پڑی۔ مسلمان شکست خوردہ ہو کر مدینہ لوٹے۔ اس شکست کے کافی نتائج نکلے۔ مسلمانوں کے چہروں پر اُن کی ہار عیاں تھی حالانکہ مسلمانوں نے جنگ کے بعد کفار کا حمراء الاسد کے مقام تک پیچھا بھی کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مدینہ کے کئی لوگ اور عرب کے کچھ قبائل بغاوت پر اتر آئے۔ کیونکہ بدر کے بعد اور مسلمانوں کی طرف سے بالا دست طرزِ عمل کے نتیجے میں مدینہ کے یہودی اور منافقین مسلمانوں کی حکمرانی کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے اور اسی طرح مدینہ سے باہر موجود عرب قبائل کے دلوں پر بھی مسلمانوں کا رعب طاری ہو چکا تھا۔ مگر اُحد کے بعد یہ سب جاتا رہا۔ اب مدینہ

کے باہر موجود عرب قبائل رسول اللہ ﷺ کے اقتدار کو چیلنج کرنے کے منصوبے بنانے لگے دوسری طرف مدینہ کے یہودیوں اور منافقین نے بھی مسلمانوں سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی فکر تھی کہ اُحد کی شکست سے مسلمانوں کا جو وقار مجروح ہوا ہے، اسے بحال کیا جائے اور ہر اُس کوشش کو جو مسلمانوں کو زیر کرنے اور اُنہیں کمتر بنانے کیلئے کی جارہی ہے، اسے ناکام بنایا جائے۔ پس آپ ﷺ اہلِ مدینہ میں موجود ایسے لوگوں اور مدینہ سے باہر قبائل کی خبروں کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

جنگ اُحد کے تقریباً ایک ماہ بعد آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنو اسد کا قبیلہ اس تاک میں ہے کہ مدینہ پر حملہ کر کے آس پاس کی چراگاہوں سے مویشی پکڑ کر لے جائے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ اُن کے حملہ کرنے سے پہلے ہی اُن پر حملہ کر دیا جائے، اس غرض سے آپ نے ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ کو قائد بنا کر ایک سو پچاس صحابہؓ کا دستہ تیار کیا۔ اس دستے میں مسلمانوں کے اعلیٰ اور بہادر ترین افراد کو شامل کیا گیا تھا جن میں ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور دیگر شامل تھے۔ اس منصوبے کو خفیہ رکھنے کے لیے آپ ﷺ نے اِن کو حکم دیا کہ وہ عام رستے کے بجائے دوسرا راستہ اختیار کریں، دن میں چھپے رہیں اور رات کے وقت سفر کریں تا کہ اِس حملہ کی خبر دشمن کو نہ ہو۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے اور بنی اسد پہنچ کر علی الصبح صحابہ کو جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے بنی اسد پر حملہ آور ہو گئے اور جلد ہی اُنہیں شکست دے کر اور اُن کے مال و مویشی لے کر مدینہ لوٹ آئے۔ اس سے دوبارہ مسلمانوں کا رعب اور اُن کی طاقت کا اثر قائم ہو گیا۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی کہ خالد بن ابی سفیان الھذلی نخلہ یا عرنہ کے مقام پر ہے اور مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے فوج جمع کر رہا ہے، چنانچہ آپ نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو اس بات کی مخبری کیلئے بھیجا۔ عبداللہ بن انیس جب خالد کے پاس پہنچے تو اُس نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ ایک عرب ہیں اور اُنہیں یہ اطلاع ملی

ہے کہ خالد مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے فوج جمع کر رہا ہے اور وہ اسی (میں شریک ہونے کی) غرض سے اُس کے پاس آئے ہیں۔ خالد نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے حملہ والی بات نہیں چھپائی اور اُنہیں بتا دیا۔ یہ دونوں چلتے چلتے باتیں کر رہے تھے، جب وہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے خالد کے آدمی اُنہیں دیکھ نہیں سکتے تھے، تو عبداللہ ابن انیس رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار سے خالد کو قتل کر دیا اور مدینہ آ کر ساری خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اِس سے قبیلہ ہذیل کے بنولحیان ٹھنڈے پڑ گئے اور باقی عرب سے بھی مدینہ پر آنے والا خطرہ کم ہو گیا۔ اس کے بعد گو کہ عرب کا خطرہ کسی حد تک ٹل گیا تھا، لیکن بہر حال اب بھی عرب مسلمانوں کے اقتدار کو کمزور کرنے کی فکر میں تھے اور مسلمانوں کی حکمرانی کو چیلنج کرنے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ چنانچہ ہذیل کے پڑوس کے ایک قبیلہ کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ وہ اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں اور یہ گزارش کی کہ اُن کے ساتھ کچھ صحابہ کو بھیجا جائے جو اُن لوگوں کو دین سکھائیں، قرآن سنائیں اور اسلامی شریعت سے آگاہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ساتھ چھ صحابہ کو روانہ کیا، جب صحابہ ہذیل کے علاقہ کے کنوئیں پر پہنچے تو ان لوگوں نے صحابہ کو دھوکا دیا اور چیخ کر قبیلۂ ہذیل کے لوگوں کو صحابہ کے خلاف بلایا۔ صحابہ اس اچانک حملہ کے سبب گھر گئے، اُنہوں نے اپنی تلواریں نکالیں اور لڑتے لڑتے اُن میں سے تین شہید ہو گئے اور باقی تین نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ قیدی بنا لئے گئے۔ ان تینوں کو مکہ لے جایا گیا تا کہ اُنہیں بیچا جا سکے۔ راستے میں ان تین میں سے ایک صحابی، عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے اُن لوگوں کی غفلت کا موقع پا کر ہاتھ چھڑا لیا، وہ اپنی تلوار بھی نکالنے میں کامیاب رہے لیکن دشمنوں نے اُنہیں زیر کر کے شہید کر دیا۔ باقی دو کو مکّہ میں بیچ دیا گیا۔ ان میں سے ایک زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ تھے جنہیں صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ ابن خلف کی موت کا بدلا لینے کیلئے خریدا تھا تا کہ وہ اِنہیں مار کر اپنے باپ کا انتقام لے سکے۔ جب زید بن دثنہ کو قتل کرنے کے لیے لایا گیا تو ابوسفیان نے آپؓ سے پوچھا ''تمہیں اللہ کا واسطہ، سچ بتاؤ کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہوگا کہ اِس وقت یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے اور اُن کی گردن پر وار ہوتا اور تم مزے سے اپنے اہل و عیال میں ہوتے؟'' زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''بخدا مجھے یہ گوارا نہیں کہ اس وقت یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہوتے اور اُنہیں ایک کانٹا بھی چبھ رہا ہوتا جبکہ میں اپنے گھر میں اہل وعیال کے ساتھ ہوتا''۔ صفوان کو بہت حیرت ہوئی اور اُس نے کہا کہ میں نے کسی کو اپنے ساتھی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھی اُن سے کرتے ہیں، پھر اس نے زید رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ دوسرے صحابی خبیب رضی اللہ عنہ تھے، انہیں سولی چڑھانے تک قید میں رکھا گیا تھا، جب اُنہیں سولی پر چڑھانے کیلئے لایا گیا تو اُنہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی اور خشوع کے ساتھ اپنی نماز ادا کی پھر فرمایا: ''اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم یہ سوچو گے کہ میں نے موت کے خوف سے نماز طویل کر دی ہے تو میں اور لمبی نماز پڑھتا''۔ پھر اُنہیں لکڑی پر لٹکایا گیا اور خبیب اُن لوگوں کو غصہ سے دیکھتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے رہے کہ اے اللہ! ہم نے تیرے رسول کا پیغام پہنچا دیا، اے اللہ تو اِن کفار کے ایک ایک شخص کو اس طرح ختم کر دے کہ اِن میں سے کوئی نہ بچے۔ کفار خبیب رضی اللہ عنہ کی چیخ پکار سے دہل اُٹھے اور پھر اُنہیں قتل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اِن چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قتل کیئے جانے کا بہت رنج ہوا اور مسلمانوں کو بھی اس واقعہ کا بہت افسوس ہوا، سب سے بڑھ کر افسوس کی یہ بات تھی کہ ہذیل نے اُنہیں بہت بڑا دھوکہ دیا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذرا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ ان حالات کے سبب گہری فکر میں تھے کہ نجد سے ایک شخص ابوالبراء عامر ابن مالک حاضر ہوا، یہ شخص تیر اندازی کا ماہر تھا، آپ نے اس کو اسلام کے بارے میں تعارف کرایا اور دین میں داخل ہونے کی دعوت دی، گو کہ اُس نے دعوت قبول نہیں کی لیکن اسلام کیلئے کوئی مخالفت بھی نہیں کی اور یہ درخواست کی کہ اس کے ساتھ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھیجا جائے جو اہلِ نجد کو اسلام سے متعارف کرائیں اور ساتھ ہی اُس نے کہا کہ اُسے قوی امید ہے کہ اہلِ نجد اس دعوت کا مثبت جواب دینگے۔ رسول اللہ ﷺ ابھی حال کے واقعہ کی وجہ سے، جس میں قبیلۂ ہذیل نے صحابہ کو دھوکا دیا تھا، فکر مند تھے لہٰذا آپ ﷺ نے ابوالبراء کی درخواست منظور نہ کی۔ لیکن ابوالبراء نے رسول اللہ ﷺ کو یقین دلایا کہ وہ ان صحابہ کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ ابوالبراء بہر حال ایک معتبر شخص تھا جس کی بات میں وزن تھا اور کوئی بھی شخص جو اُس کی حفاظت میں ہو، اسے دھوکا دیے جانے کا خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے اصرار پر آپ ﷺ نے منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ساتھ

40 صحابہ کو اہلِ نجد کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے روانہ کیا۔ جب یہ لوگ معونہ کے کنوئیں تک پہنچے تو اُنہوں نے اپنے ایک ساتھی کو رسول اللہ ﷺ کا خط دے کر عامر ابن طفیل کے پاس بھیجا۔ جب یہ قاصد عامر کے پاس پہنچا تو عامر اُس پر جھپٹ پڑا اور بغیر رسول اللہ ﷺ کا خط دیکھے ہی قاصد کو قتل کر دیا۔ پھر اپنے قبیلہ یعنی بنی عامر کو چلا کر پکارا کہ وہ مسلمانوں کو گھیر کر قتل کر دیں۔ بنی عامر نے عامر بن طفیل کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور ابوالبرا کے ساتھ مسلمانوں کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ عامر بن طفیل نے اس پر خاموش ہونے کے بجائے قریب کے دوسرے عرب قبائل کو آواز دی جنھوں نے مسلمانوں کو، جو اپنے اونٹوں پر سوار تھے گھیر لیا۔ مسلمانوں نے تلواریں نکال لیں اور اپنے آخری شخص تک مقابلہ کیا لیکن سوائے دو صحابہ کے سب کے سب شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کا رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں پر شدید اثر پڑا اور آپ ﷺ اس امر کی فکر کرنے لگے کہ کس طرح ان عرب قبائل کو باز رکھا جائے اور مسلمانوں کا رعب و دبدبہ کس طرح بحال کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے محسوس کیا کہ ان حادثات کی وجہ سے مدینہ ہی میں حالات بگڑ رہے ہیں لہٰذا پہلے مدینہ پر توجہ دی جائے اور جب ان پر قابو پا لیا جائے پھر ریاست کے خارجی احوال سے نمٹا جائے۔ جنگ اُحد، معونہ اور رجیع کے حادثات سے مسلمانوں کے وقار کو ٹھیس پہنچی تھی جس کے سبب منافقین اور یہود کی ہمتیں بڑھ گئیں تھیں۔ یہ لوگ موقع کی تلاش میں تھے، رسول اللہ ﷺ نے اُن کی نیتوں کو بھانپ لیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہ کو اس فرمان کے ساتھ اُن کے پاس بھیجا: ''بنی نضیر کے یہود کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ تم میرے ملک سے نکل جاؤ کیونکہ تم نے دھوکا دے کر اس عہد کو توڑا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے تمہارے ساتھ کیا تھا، تمہارے پاس دس دن کی مہلت ہے، ان دس دنوں میں ملک چھوڑ دو اس کے بعد اگر کوئی دکھائی دیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائیگا''۔ بنو نضیر ملک چھوڑنے پر تیار ہو ہی گئے تھے کہ عبداللہ بن ابی اور حیی بن اخطب نے اُنہیں ہمت دلائی اور اس بات پر منا لیا کہ وہ اپنے قلعوں میں محصور رہیں۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اُن پر گھیرا تنگ کر دیا، اب وہ مصالحت کی طرف آئے کہ اُن کی جان بخش دی جائے اور وہ ملک چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے

حکم دیا کہ وہ اپنے تین تین افراد کو ایک اونٹ پر لے کر جس قدر کھانے پینے کا سامان لے جا سکیں چلے جائیں، اور اِس کے علاوہ اُن کے پاس کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح یہودیوں نکلے اور اپنا باقی سامان اور اثاثہ، جس میں زمین، باغ اور اسلحہ شامل تھا، پیچھے چھوڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سارا مال مہاجرین میں اور انصار کے صرف دو اشخاص ابو دجانہ اور سھل ابن حنیف، جو کہ مہاجرین کی ہی طرح بے سروسامان تھے، میں تقسیم فرما دیا۔

اس طرح یہودیوں کو ملک بدر کر کے آپ ﷺ نے داخلی سیاست کے معاملے کو نبٹایا اور مسلمانوں کی طاقت کا سکہ بٹھایا اور ان کا دبدبہ بحال کر دیا۔ اب آپ ﷺ نے خارجی سیاست کی جانب توجہ فرمائی، چنانچہ سب سے پہلے قریش کو چیلنج کیا گیا لیکن قریش مقابلہ کیلئے نہیں آئے۔ واقعہ یہ تھا کہ جنگِ بدر کے موقع پر ابوسفیان نے چیلنج کیا تھا کہ آج ہی کی تاریخ یعنی یومِ بدر کو ہم اگلے سال پھر مقابلہ کرینگے، رسول اللہ ﷺ کو جب ابوسفیان کا یہ قول یاد آیا تو آپ ﷺ نے ضروری سمجھا کہ اس چیلنج کا جواب دینا چاہئے چنانچہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تیار کیا اور عبداللہ بن عبداللہ بن سلول کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کر کے میدانِ بدر پہنچے اور قریش سے قتال کے منتظر رہے۔ مکہ سے ابوسفیان دو ہزار فوجیوں کے ساتھ روانہ ہوا، لیکن راستہ ہی سے اپنے لشکر کے ساتھ مکہ لوٹ گیا۔ رسول اللہ ﷺ مسلسل آٹھ دن تک وہیں خیمہ زن رہے لیکن قریش نہیں آئے بالآخر رسول اللہ ﷺ کو قریش کے واپس لوٹ جانے کی اطلاع ہوئی اور آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ لوٹے، لیکن ان آٹھ دنوں کے قیام میں بدر میں تجارت کے ذریعے کافی منافع حاصل کیا۔ یہ واپسی کامیابی کے ساتھ ہوئی گو کہ قریش مقابلہ کیلئے نہیں آئے۔ پھر آپ نے نجد کے غطفان پر حملہ کیا جو بغیر مقابلہ کئے اپنی عورتوں اور سامان کو چھوڑ گئے، جو مسلمان مالِ غنیمت کے طور پر اپنے ساتھ مدینہ لے آئے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دومۃ الجندل کا قصد کیا جو شام اور حجاز کی سرحد پر واقع تھا، اس کا مقصد اُن قبائل کو زیر اور سیدھا کرنا تھا جو قافلوں پر حملے کیا کرتے تھے۔

دومۃ الجندل نے بھی مقابلہ نہیں کیا اور وہ اپنا مال ومتاع وہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے جسے مالِ غنیمت کے طور پر مسلمان لے کر فتح یاب ہو کر مدینہ لوٹے۔

ان خارجی غزوات اور مدینہ کے اندر کارروائیوں سے رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کی ہیبت دوبارا عربوں اور یہودیوں پر بٹھا دی۔ اب جنگ اُحد کی شکست کے اثرات پوری طرح زائل ہو گئے تھے۔

باب نمبر 20

غزوۂ احزاب

غزوۂ اُحد کے بعد مدینہ کے اندر اور باہر ہونے والی مہمات مسلمانوں کی ہیبت کو پھیلانے اور اسلامی ریاست کو مستحکم بنانے میں کافی مؤثر ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کے وقار میں اضافہ ہوا اور ریاست کی اتھارٹی کو تقویت ملی۔ اب جزیرہ نمائے عرب کے قبائل اس بات سے خوف کھانے لگے کہ اُن پر حملہ نہ ہو جائے۔ اگر انہیں خبر پہنچتی کہ رسول اللہ ﷺ ان پر حملہ آور ہونے جا رہے ہیں تو ان میں کھلبلی مچ جاتی اور اگر کبھی ایسا ہوتا تو وہ بغیر مقابلہ کئے بھاگ کھڑے ہوتے جیسا کہ غطفان اور دومۃ الجندل میں ہوا۔ اور قریشِ مکہ مسلمانوں کا سامنا کرنے میں بزدلی دکھانے لگے جیسا کہ بدر کے دوسرے معرکے میں ہوا جبکہ وہ خود ہی چیلنج کر کے گئے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو قدرے سکون میسّر آیا اور انہوں نے مدینہ میں اپنی زندگیوں کی طرف توجہ دی اور اُن نئے حالات کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو منظّم کیا، جو اُنہیں بنی نضیر کے مالِ غنیمت حاصل ہونے کے بعد میسر ہوئی تھی۔ مہاجرین میں بنو نضیر کی زمینیں، باغات اور اثاثے تقسیم کئے گئے تھے۔ البتہ ان ضروریات زندگی نے اُنہیں جہاد سے غافل نہیں کیا، کیونکہ جہاد تو قیامت تک کیلئے فرض کیا گیا ہے۔ اتنا ضرور تھا کہ اب اُن کی زندگیاں پہلے کی بانسبت بہتر اور پہلے سے زیادہ مستحکم ہو گئیں تھیں۔ اس اطمینان اور سکون کے باوجود، رسول اللہ ﷺ ہمیشہ دشمن کے خطرے سے چوکنا رہتے کہ کہیں دشمن دھوکا نہ دے۔ آپ کی یہ کوشش ہوتی کہ جزیرہ نمائے عرب کے

مختلف علاقوں سے خبریں اُن تک پہنچتی رہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس غرض سے کئی لوگوں کو مختلف جگہوں پر بھیجا کہ وہ دشمن کے ارادوں کی معلومات پہنچائیں تا کہ خطرے کیلئے پیشگی منصوبہ بندی کرنے کی مہلت مل جائے اور دشمن سے مقابلہ اس حال میں ہو کہ دشمن کی ممکنہ چال پہلے سے ہی علم ہو۔ اگرچہ عرب مسلمانوں کی قوت سے خائف تھے اور اُن کے اقتدار سے ڈرتے تھے مزید یہ کہ بنونضیر اور بنوقینقاع کے یہودی قبائل کو مدینہ سے ملک بدر کر دیا گیا تھا اور غطفان اور ہذیل جیسے قبائل نے بھی شکست کھائی تھی، لیکن جزیرہ نما عرب میں مسلمانوں کے کئی دشمن موجود تھے۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ دشمن کی اطلاعات اور اُن کی تیاریوں کی خبریں جمع کرنے کو اہم سمجھتے تھے۔ اسی دوران اطلاعات موصول ہوئیں کہ قریشِ مکہ اور بعض دوسرے قبائل مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں، لہٰذا آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس مقابلہ کیلئے تیار کیا۔ اطلاعات ایسی آ رہی تھیں کہ بنی نضیر کے یہودی رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ملک بدر کئے جانے کے بعد سے اپنے سینوں میں یہ آرزو لگائے بیٹھے تھے کہ عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا کر اُن سے اپنا انتقام لیں۔ اس سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنونضیر کے حیي بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق اور کنانہ بن ابی الحقیق اور اُن کے ساتھ بنو وائل کے ھوذہ بن قیس اور ابوعمار مکہ پہنچے۔ قریش نے حیي سے بنی نضیر کے بارے میں پوچھا تو حیي نے کہا: ''وہ اُنہیں مدینہ اور خیبر کے درمیان چھوڑ کر آیا ہے اور وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ قریش کے ہمراہ مسلمانوں پر چڑھائی کی جائے''۔ پھر قریش نے اُس سے بنوقریظہ کا پوچھا تو اُس نے کہا: ''وہ مدینہ ہی میں ہیں اور ظاہری طور سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ تم مدینہ پر یلغار کرو تو وہ اندر سے تمہاری مدد کریں''۔ قریش اس مقام پر کچھ متردّد ہوئے کہ آیا آگے بڑھا جائے یا نہیں؟ کیونکہ دراصل رسول اللہ ﷺ اور یہودیوں کے مابین ماسوائے اس کے کوئی تنازعہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ یہود سمجھتے ہوں کہ رسول اللہ ﷺ ہی حق پر ہوں؟ چنانچہ قریش نے یہودیوں سے پوچھا: ''اے قوم یہود! تم تو اولین اہلِ کتاب ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے اور رسول ﷺ کے درمیان کیا اختلاف ہے، تم بتاؤ کہ ہم میں کس کا دین بہتر ہے''؟ یہودی توحید پرست تھے

اور اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام ہی حق ہے لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے عربوں کو مسلمانوں کے خلاف جمع کرنے والی اپنی سازش کے پیش نظر ایسی بے باک غلطی کی کہ جواب دیا کہ ''بے شک تمہارا دین بہتر ہے اور تم ہی حق پر ہو''۔ یہ یہودیوں کی دائمی رسوائی تھی کہ انہوں نے جانتے بوجھتے یہ کہا کہ بتوں کی پرستش ایک اللہ کی عبادت سے بہتر ہے، لیکن اُنہوں نے ڈھٹائی سے ایسا کیا اور کرتے رہے۔ جب یہودیوں کو یقین ہوگیا کہ اُنہوں نے قریش کو مسلمانوں پر حملہ کیلئے آمادہ کرلیا ہے، تو اُنہوں نے قیس عیلان کے قبیلۂ غطفان کا رخ کیا پھر بنی مُرۃ، بنی فزارۃ، اشجع، سُلَیم، بنی سعد اور اسد کے پاس گئے اور ہر اُس قبیلے کے پاس گئے جسے مسلمانوں سے کوئی انتقام لینا ہوتا تھا اور اسے بدلا لینے پر اکسایا اور بھڑکایا۔ یہودی ہر قبیلے کو یقین دلاتے کہ قریش نے حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، پھر اُس قبیلہ کے بتوں کی تعریف کرتے اور اُنہیں فتح اور کامیابی کا بھروسہ دلاتے۔ اس طرح یہودیوں نے کئی عرب قبائل کو جمع کیا اور یہ سب قریش کے ساتھ مدینہ پر حملہ کے لیے نکل پڑے۔

قریش کے چار ہزار سپاہی، تین سو گھڑ سوار اور پندرہ سو اونٹوں پر سوار جنگجو ابوسفیان کی قیادت میں نکلے۔ قبیلہ غطفان کے سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد ایک ہزار اونٹوں پر سوار عیینہ بن حصن بن حذیفہ کی قیادت میں آئی، قبیلۂ اشجع کے چار سو سپاہی مسعر بن رحیلہ کی قیادت میں آئے، بنی مرۃ کے بھی چار سو سپاہی حارث بن عوف کی قیادت میں نکلے، بنی سلیم اور اصحاب بئر معونۃ کے سات سو سپاہی بھی اس لشکر میں شامل ہوئے۔ یہ تمام لوگ جمع ہوئے اور اِن کے ساتھ بنو سعد اور بنو اسد کے فوجی بھی شامل ہوگئے۔ اِن تمام کی تعداد کم و بیش دس ہزار ہوگئی اور یہ سب ابوسفیان کی قیادت میں مدینہ کی جانب بڑھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس فوجی چڑھائی کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے مدینہ کو محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ مدینہ کے اطراف میں ایک خندق کھودی جائے جس سے شہر دشمن سے محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ خندق کھودی گئی جس میں آپ ﷺ نے بذاتِ خود اپنے ہاتھوں سے کھدائی کی، آپ ﷺ مٹی اُٹھا اُٹھا کر

مسلمانوں کی ہمت افزائی فرماتے اور اُنہیں اپنی کوششیں دوگنی کرنے کی ترغیب دیتے۔ اس طرح یہ خندق کھودنے کا کام چھ دن میں مکمل کیا گیا اور جو گھر عین خندق کے سامنے اور دشمن کے حملہ پر تھے اُن کی دیواروں کو مضبوط کیا گیا، خندق پار مکانوں کو خالی کرایا گیا اور عورتوں اور بچوں کو ایسے گھروں میں منتقل کیا گیا جن کی دیواریں مضبوط کردی گئیں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ تین ہزار صحابہ کے ساتھ نکلے اور آپ ﷺ کی پشت پر سلع کی پہاڑیاں تھیں، اور آپ ﷺ اور دشمن کے درمیان خندق حائل تھی، یہاں آپ ﷺ نے ایک سرخ خیمہ میں قیام کیا۔

قریش اور اُن کے حلیف قبائل چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے مقابلہ اُحد کے مقام پر ہو۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے اور مسلمان وہاں نہیں ملے، تو قریش اور دوسرے عرب قبائل آگے مدینہ کی جانب بڑھے اور اپنے اور مدینہ کے درمیان خندق کو حائل پا کر اُنہیں سخت تعجب ہوا کیونکہ دفاع کا یہ طریقہ اُن کیلئے بالکل نیا تھا۔ لہٰذا قریش اور عرب قبائل نے مدینہ کے باہر خندق کی دوسری جانب اپنا پڑاؤ ڈالا۔ اب ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ اُنہیں خندق کے باہر طویل عرصہ تک رکنا پڑسکتا ہے، جبکہ موسم شدید سردی کا تھا اور طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ان حالات میں کمزوری نے اُن کے دلوں میں گھر کرلیا اور یہ سوچنے لگے کہ اب لوٹ جائیں۔ حیي بن کعب کو اس بات کا احساس تھا چنانچہ اُس نے کہا کہ قبیلۂ بنوقریظہ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہیئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنا معاہدہ ختم کردیں اور وہ بھی ان قبائل کے ساتھ مل جائیں جس سے حملہ میں آسانی ہوجائے گی۔ اُس نے قریش اور دوسرے قبائل سے کہا کہ اگر بنوقریظہ ایسا کرتے ہیں تو مسلمانوں کی مدد ختم ہو جائے گی اور مدینہ میں داخل ہونے کا راستہ کھل جائیگا۔ قریش اور غطفان اس تجویز سے خوش ہوئے اور حیي کو ذمہ داری سونپی کہ وہ بنوقریظہ کے سردار کعب بن اسد سے گفتگو کرے۔ کعب نے جب حیي کو آتے دیکھا تو گھر کا دروازہ بند کرلیا، لیکن حیي اپنی بات پر اڑا رہا اور بالآخر گفتگو شروع ہوگئی۔ حیي نے کعب سے کہا کہ ''اے کعب میں تمہارے لئے کبھی نہ ختم ہونے والی شہرت اور ایک بڑی فوج لے کر آیا ہوں، میرے ساتھ قریش اور غطفان کے اکابر اور

سردار آئے ہیں، میرا اُن سے پکا عہد ہو چکا ہے کہ وہ محمد ﷺ اور اُن کے ساتھیوں کا خاتمہ کیے بغیر نہیں جائینگے۔ کعب کو تردّد تھا، اس نے حیی سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے وعدے کے سچے اور پابند ہیں۔ کعب کو مسلمانوں سے عہد شکنی کرنے میں ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن حیی اپنی بات پر جما رہا، اُس نے کعب کو یاد دلایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا تھا اور اس وقت سے پہلے وہ کس قدر مضبوط تھے، بالآخر کعب نے حیی کی بات تسلیم کر لی۔ اس طرح کعب نے مسلمانوں سے کیئے ہوئے عہد کو توڑ ڈالا۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ اور صحابہ کو اس بات پر کافی تشویش ہوئی اور وہ اس کے نتائج کے بارے میں فکرمند ہو گئے۔ آپ ﷺ نے قبیلہ اُوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور خوات بن جبیر رضی اللہ عنہ کو بنی قریظہ کی غداری کے حالات پتہ کرنے کیلئے بھیجا اور ساتھ ہی اُنہیں یہ تاکید بھی کر دی کہ اگر واقعی یہودیوں نے ایسا کیا ہے، تو وہ واپس آ کر ایک خاص اشارے سے بتائیں تا کہ صرف رسول اللہ ﷺ اس کو سمجھ پائیں اور لوگ اس سے خوف زدہ نہ ہوں۔ لیکن جب یہ لوگ بنی قریظہ پہنچے تو پتہ چلا کہ حالات اُس سے بھی زیادہ سنگین ہو چکے تھے جس کی انہیں اطلاع ملی تھی۔ ان لوگوں نے بنی قریظہ کے سردار کعب کو سمجھانے کی کوشش کی، تو اُس نے مطالبہ کیا کہ بنی نضیر کے یہود جنہیں ملک بدر کر دیا گیا ہے، اُنہیں واپس بلایا جائے تا کہ وہ اپنے وطن میں رہ سکیں۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو کہ بنی قریظہ کے حلیف تھے کعب کو سمجھانے لگے لیکن اُس نے خود رسول اللہ ﷺ کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ محمد (ﷺ) کون ہیں!؟ ہمارا اُن سے نہ ہی کوئی عہد ہے اور نہ کوئی معاہدہ۔ ان صحابہؓ نے آ کر سارے احوال رسول اللہ ﷺ کو بتائے جس سے تشویش اور بڑھ گئی۔ ادھر قبائل قتال کی تیاریاں کرنے لگے۔ بنی قریظہ نے ان قبائل سے کہا کہ وہ شدید قتال شروع کریں اور یہ لوگ دس دن میں قتال کی تیاری مکمل کر کے شامل ہو جائینگے۔ احزاب نے اپنی فوج کے تین حصہ کیئے، ابن اعور السلمی کا دستہ وادی کی جانب سے حملہ کرنے والا تھا، عیینہ بن حصن کے دستے کو ایک جانب سے اور ابوسفیان کے دستے کو عین خندق کے سامنے سے حملہ کرنا تھا۔ مسلمانوں میں خوف و ہراساں کا ماحول اور تشویش عیاں تھی۔ ادھر ان قبائل کے حوصلے بلند

تھے اور اُن کی قوت مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اُنہوں نے خندق پر حملہ کیا اور اُن کے کچھ لوگ اُس پر گزرنے میں کامیاب بھی رہے۔ اُن کے کچھ گھڑ سوار جن میں عمرو ابن عبد ودّ، عکرمہ بن ابی جہل اور ضرارہ بن خطاب شامل تھے، خندق کے ایک کم چوڑائی والے حصہ سے آگے بڑھنے لگے، یہ اپنے گھوڑوں کو ہانکتے ہوئے سلع کی پہاڑیوں اور خندق کے درمیان آ گئے۔ علی رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ کچھ مسلمانوں کو اُس جگہ لائے جہاں سے کفار خندق پار کرنے والے تھے تا کہ اس جگہ کی حفاظت کی جا سکے۔ عمرو بن عبد ود اپنے دستے کے ساتھ آ کر رکا اور اِنہیں لڑنے کے لئے چیلنج کیا جسے علی رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا۔ عمرو بن عبد ود نے کہا "لیکن کیوں؟ اے میرے بھتیجے، اللہ کی قسم میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: لیکن میں تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور عمرو بن عبد ود مارا گیا، اُس کے ساتھی فرار ہو گئے۔ لیکن اس واقعہ سے قبائل کمزور نہیں پڑے بلکہ اپنے غضب میں اُنہوں نے مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس اثناء میں بنی قریظہ کے یہود میں سے کچھ جوشیلے اپنے قلعہ سے باہر نکل آئے تا کہ آس پاس کے گھروں میں لوگوں کو خوف زدہ کریں اور دہشت پھیلائیں۔ ہر طرف سے گھرے ہوئے مسلمانوں کی تکلیفیں اور بڑھ گئیں اور خوف و ہیبت کی فضا چھا گئی۔ لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مشکل حالات میں بھی ہمیشہ کی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رحمت و مدد کا یقین تھا۔ ایسے وقت نُعَیمُ بن مسعود رضی اللہ عنہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی تجویز رکھی جس سے دشمن کی چالیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ نعیم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بنی قریظہ کے پاس گئے جنہیں اِن کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع نہیں تھی اور زمانۂ جاہلیت میں ان سے دوستی بھی تھی۔ انہوں نے یہودیوں کو اپنے پرانے رشتے یاد دلائے جس میں ایک دوسرے کیلئے محبت تھی اور یہودیوں کو بتایا کہ آج قریش اور غطفان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں لیکن بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ زیادہ دیر تک نہ رکیں رہیں اور یہودیوں کو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جائیں، پھر یہودیوں کا کیا ہوگا۔ اُنہوں نے یہودیوں کو نصیحت کی کہ وہ اس وقت تک عرب قبائل کے ساتھ مل کر نہ لڑیں جب تک کہ وہ قبائل کے کچھ لوگ اپنے پاس بطور یرغمال نہ رکھ لیں، تا کہ اُن

کے چھوڑ کر بھاگنے کا اندیشہ نہ رہے۔ اس طرح اُنہوں بنی قریظہ کے یہودیوں کو اپنی بات سمجھا دی۔ پھر نعیم رضی اللہ عنہ قریش کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ یہودیوں کو محمد ﷺ سے عہد شکنی کرنے کا ملال ہے اور اب وہ لوگ اس طرح رسول اللہ ﷺ کو منانے کی فکر میں ہیں کہ تم سے بطورِ امانت قریش اور غطفان کے سرداروں کو لے لیں اور پھر اُنہیں محمد ﷺ کے حوالے کر دیں جو اُن کے سر قلم کر دینگے۔ پھر قریش کو نصیحت کی کہ اگر بنو قریظہ کسی کو تمہارے پاس بھیجیں اور تمہارے آدمی بطور رہن رکھنا چاہیں تو تم اُنہیں ہرگز ایک آدمی بھی نہ دینا۔ پھر نعیم رضی اللہ عنہ قبیلہ غطفان کے پاس گئے اور اُنہیں بھی وہی کچھ بتایا جو قریش کو بتا چکے تھے۔ اب قبائل کے دلوں میں یہود کی طرف سے شبہات گھر کر چکے تھے۔ ابوسفیان نے اپنا قاصد بنی قریظہ کے یہودیوں کو بھیجا اور یہ کہلوایا کہ ہم اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کو گھیرنے کیلئے کئی دن سے بیٹھے ہیں اور یہ عرصہ اب لمبا ہوتا جا رہا ہے، چنانچہ کل تم حملہ کر دو اور ہم تمہارے پیچھے ہیں۔ کعب نے جواب بھجوایا کہ کل سبت یعنی ہفتے کا دن ہے اور ہم سبت کو کوئی کام یا قتال نہیں کرتے۔ اب قریش کو نعیم رضی اللہ عنہ کی بات اور سچی لگنے لگی اور ابو سفیان بہت غضب ناک ہوگیا، اس نے قاصد دوبارہ بھیج کر کہلوایا کہ اپنا ہفتہ کسی اور دن کر لو، کل قتال ہونا بہت ضروری ہے، ہم حملہ کر رہے ہیں اگر تم ہمارے ساتھ نہیں ہوئے تو ہم محمد ﷺ سے پہلے تم سے قتال کرینگے۔ بنو قریظہ نے ابوسفیان کا جواب سن کر کہا کہ ہم سبت کے دن کی حرمت ہر حال میں قائم رکھیں گے اور اپنا مطالبہ پیش کیا کہ تمہارے آدمی بطور ضمانت ہمیں درکار ہیں۔ ابو سفیان کو جب یہ جواب ملا تو اسے نعیم رضی اللہ عنہ کی بات کا کامل یقین ہوگیا اور وہ یہ فکر کرنے لگا کہ اب کیا کیا جائے، چنانچہ اُس نے غطفان سے بات کی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ پر حملہ کرنے میں متردّد ہو رہے ہوں۔ جب رات ہوئی تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اُن پر شدید آندھی، بجلی کی تیز کڑک اور موسلا دھار بارش بھیج دی جس سے اُن کے خیمے اُکھڑ گئے، کھانے پینے کے برتن تتر بتر ہوگئے اور اُن کے دلوں میں خوف طاری ہوگیا۔ وہ یہ فکر کرنے لگے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ اس موقعہ کو حاصل کر لیں اور اُن پر ٹوٹ پڑیں، اس سے وہ لرز گئے۔ اسی دوران طلیحہ نے پکارا کہ محمد ﷺ نے حملہ کر دیا ہے لہٰذا جان بچا کر بھاگو"۔ ابوسفیان چلانے لگا: "اے لوگو! میں نکل

رہا ہوں چنانچہ تم بھی نکلو‘‘۔ تمام قریش جو کچھ سامان ہاتھ لگا اسے اُٹھا کر بھاگنے لگے اور غطفان اور دوسرے عرب قبیلے بھی اُن کے پیچھے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب صبح ہوئی تو سب جا چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ دیکھا تو وہ اور تمام مسلمان خندق سے ہٹے اور مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس طرح مسلمانوں کو قتال سے بچالیا۔

اب جب رسول اللہ ﷺ کو قریش سے آرام ملا اور اللہ نے اُنہیں قتال سے بچالیا تو آپ ﷺ نے تہیہ کرلیا کہ بنی قریظہ سے اب معاملہ نمٹا ہی لیا جائے تا کہ اُن کے دھوکوں سے حفاظت ہو اور وہ دشمنوں سے مل کر مسلمانوں کو ختم کرنے کی پھر کوئی سازش نہ کرسکیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اعلان کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں منادی کردے:

((من كان سامعا مطيعا فلا يصلين العصر الا ببني قريظة))

’’جو کوئی سن کر اطاعت کرنے والا ہو وہ عصر کی نماز بنی قریظہ پہنچ کر ہی پڑھے‘‘

علی رضی اللہ عنہ اسلام کا پرچم لے کر آگے بڑھے اور مسلمان خوشی اور سرور کے ساتھ اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑے یہاں تک کہ بنی قریظہ پہنچ کر بنی قریظہ کا محاصرہ کرلیا جو پچیس راتوں تک چلا۔ یہودیوں نے اپنا قاصد رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔ کافی مذاکرات کے بعد وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ قبول کرلینگے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ سنایا کہ اُن کے سپاہیوں کو قتل کردیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے اور مال ضبط کر لیا جائے۔ اس فیصلہ پر عمل درآمد کردیا گیا اور مدینہ ہمیشہ کیلئے یہودیوں کے شر وفساد سے پاک ہو گیا۔

احزاب کی اِس شکست سے قریش کی یہ آخری کوشش کہ مسلمانوں کو ختم کردیا جائے، دم توڑ گئی اور بنو قریظہ کا یہ فیصلہ ہونے سے یہودیوں کے تینوں قبیلے جو مدینہ کے گرد آباد تھے اور جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے معاہدے کر رکھے تھے اور یکے بعد دیگرے معاہدوں کی خلاف ورزی کی

تھی، کا معاملہ نبٹا دیا گیا۔ اب معاملہ پوری طرح سے مسلمانوں کے موافق تھا اور عرب مسلمانوں کے دبدبہ سے مرعوب ہو چکے تھے۔

باب نمبر 21

حدیبیہ کا معاہدہ

رسول اللہ ﷺ کو ہجرت کیے چھ سال گزر چکے تھے۔ اب آپ ﷺ کو اپنی فوج اور مدینہ کے معاشرے کی طرف سے اطمینان تھا اور عرب کے تمام قبائل بھی اسلامی ریاست سے مرعوب ہو چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت کو پھیلانے اور اسلامی ریاستِ کو مضبوط کرنے اور اسلام کے دشمنوں کو کمزور کرنیکے نئے اسالیب پر غور کرنا شروع کیا۔ اس دوران آپ ﷺ کو خبریں ملیں کہ خیبر اور مکہ کے لوگ آپس میں مل کر مدینہ پر چڑھائی کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی جس سے ایک طرف مکہ کے لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں اور دوسری طرف آپ کے لیے جزیرہ نمائے عرب میں دعوت کے فروغ کا راستہ ہموار ہو جائے اور ساتھ ساتھ خیبر کے یہودی قریشِ مکہ سے دور ہو جائیں۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ آپ ﷺ بیت اللہ کی زیارت کی غرض سے پرامن طریقہ سے مکہ جائیں۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ عربوں کا حرام مہینوں میں جنگ نہ کرنے کا رواج اس منصوبہ میں معاون ثابت ہوگا اور اس سے یہ مقصد بھی حاصل ہو جائیگا۔ آپ ﷺ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ قریش میں اب وہ وحدت نہیں رہی تھی اور وہ مسلمانوں سے خائف بھی تھے، لہذا وہ مسلمانوں کے بارے میں کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے سو مرتبہ سوچیں گے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے حج پر جانے کا فیصلہ کرلیا، آپ جانتے تھے کہ اگر قریش انہیں حج کرنے سے منع کریں گے تو یہ قریش کے خلاف

زبردست پروپیگنڈے کا ذریعہ بنے گا، اور یوں اسلام کا پیغام مزید پھیلے گا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ذیقعد میں اعلان کر دیا کہ آپ ﷺ حج پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی عرب کے دوسرے قبائل کو بھی دعوت بھیجی کہ وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ حج پر چلیں۔ یہ قبائل غیر مسلم تھے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ عرب لوگوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ آپ ﷺ حج کیلئے جا رہے ہیں نہ کہ لڑائی کیلئے۔ اُن لوگوں کو جو اسلام میں نہیں تھے، شامل کرنے سے یہ واضح تھا کہ آپ ﷺ قتال نہیں چاہتے تھے۔ اس اقدام سے قریش کی طرف سے حج سے منع کرنے کی صورت میں عربوں کی رائے عامہ کو جیتنا مقصود تھا، اسی لئے بغیر ہتھیار کے نکلنے کا اعلان کیا گیا تھا، اور مسلمانوں کو صرف ذاتی تلواریں میان کے ساتھ رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اور مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ وہ حج کیلئے نکل رہے ہیں نہ کہ قتال کیلئے۔ آپ ﷺ اپنی اونٹنی 'قصویٰ' پر سوار مدینہ سے حج کیلئے نکلے اور آپ ﷺ کے ساتھ ایک ہزار چار سو افراد تھے۔ نیز قربانی کے ستّر اونٹ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ نے احرام باندھ لیا تا کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ آپ قتال کے لیے نہیں بلکہ حج کے لیے جا رہے ہیں۔ مدینہ سے روانگی کے چھ یا سات میل بعد ذی الحلیفہ کے مقام پر لوگوں نے حج کا احرام باندھا اور مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ قریش کو اس بات کی اطلاع ملی کہ مسلمان حج کے ارادے سے آ رہے ہیں اور لڑائی نہیں کرنا چاہتے، لیکن انہیں خدشہ تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخل ہونے کیلئے کوئی حربہ ہے۔ لہٰذا انہوں کافی نے غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا کہ ہر حال میں مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنا ہے، خواہ کتنا ہی جانی نقصان اُٹھانا پڑے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک فوج ترتیب دی تا کہ مسلمانوں سے مقابلہ کر کے اُنہیں مکہ میں داخل ہونے سے روکا جا سکے۔ یہ فوج خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل کی قیادت میں تیار کی گئی جس میں سے دو سو افراد گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ فوج حجاج کی جماعت کو روکنے کیلئے آگے بڑھی اور اس نے ذی طویٰ کے مقام پر آ کر پڑاؤ ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ کو قریش کے اس فعل کی خبر ملی کہ قریش نے اُنہیں روکنے کیلئے فوج روانہ کی ہے۔ جب آپ ﷺ مکہ سے دو منزل کی مسافت پر عسفان نامی گاؤں تک پہنچے تو وہاں بنی کعب قبیلہ کا ایک شخص ملا جس سے آپ ﷺ نے قریش کے

بارے میں دریافت فرمایا، اُس نے بتایا: ''قریش کو آپکے آنے کی اطلاع ہے اور وہ ذی طویٰ میں خیمہ زن ہیں، اُن کے ساتھ دودھ دینے والی اونٹنیاں ہیں اور وہ شیر کی کھال پہنے ہوئے ہیں اور اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دینگے۔ اُن کا سردار خالد بن ولید ہے جو **کراع الغمیم** پر موجود ہے''۔ '**کراع الغمیم**' مسلمانوں کے قیام یعنی عسفان کے علاقہ سے قریب آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ سنا تو فرمایا: قریش کی تباہی ہو، اُنہیں جنگ ہڑپ کر چکی ہے، اُن کا کیا نقصان ہوگا اگر وہ میرے اور عرب کے درمیان سے ہٹ جائیں؟ وہ چاہتے ہیں کہ وہ مجھے ختم کر دیں، اور اگر اللہ نے مجھے اُن پر غالب کر دیا تو یہ لوگ فوج در فوج دین میں داخل ہو جائینگے اور اگر ایسا نہ ہوا تو جب تک اُن کے پاس طاقت ہے، وہ مجھ سے لڑتے رہیں گے۔ یہ قریش کیا سمجھتے ہیں؟ اللہ کی قسم میں اس وقت تک جہاد کرتا رہوں گا جب تک کہ جس کام کو دے کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے وہ غالب نہ ہو جائے یا پھر میرا خاتمہ ہو جائے''۔ اب رسول اللہ ﷺ نے اپنے منصوبہ پر پھر غور فرمایا۔ انہوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ ان کی حکمتِ عملی پر امن ہے اور قتال کی کوئی تیاری نہیں کی۔ لیکن قریش نے باوجود اس کے کہ آپ ﷺ قتال نہیں چاہتے تھے، قتال کیلئے اپنی فوج روانہ کر دی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا واپس جائیں یا اپنی حکمتِ عملی بدل کر قتال کیا جائے۔ آپ ﷺ کو مسلمانوں کی قوتِ ایمانی پر پورا اعتماد تھا کہ اگر جنگ کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوا تو مسلمان کفار سے قتال کیلئے تیار ہونگے۔ تاہم چونکہ رسول اللہ جنگ کے ارادے سے نہیں آئے تھے اور یہ فیصلہ فرما چکے تھے کہ وہ لڑائی نہیں کریں گے بلکہ وہ حج کیلئے آئے تھے اور صرف اور صرف امن کی نیت لے کر آئے تھے، چنانچہ آپ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ اگر حج کرنے سے روکا جائیگا، تو یہ روکنا بھی پر امن ہو اور قتال کے ذریعہ سے نہ روکا جائے اور نہ ہی آپ جنگ کر کے مکہ داخل ہونا چاہ رہے تھے۔ جو پر امن منصوبہ آپ ﷺ نے بنایا تھا اُس سے یہ حاصل کرنا مقصود تھا کہ اسلام کا عظیم الشان اور امن و سلامتی کا پیغام تمام عربوں کے سامنے آئے اور دعوت کو فروغ ملے اور اُس کے مقابلہ میں قریش اور مشرکین کی گمراہی، اسلام سے دشمنی اور تکبر واضح ہو اور عربوں کی رائے عامہ اس سے متاثر ہو۔

آپ ﷺ اچھی طرح جانتے تھے کہ رائے عامہ کا ایسا ماحول اسلامی دعوت کیلئے بہت کارگر ثابت ہوگا اوراس سے دعوت کے پھیلنے میں بڑی مدد ملے گی اور یہ ایک فتح ہوگی اوراسی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے پرامن منصوبہ بندی کی گئی تھی اور جنگ کی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ لیکن اب اگر جنگ کی جائے تو یہ حکمتِ عملی ناکام ہوتی ہے اوراپنے مقاصد کوضرب لگتی ہے،جنہیں حاصل کرنے کیلئے یہ سفرکیا گیا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے نہایت غوروفکرکیااورآپ ﷺ کی یہ فکرکسی بھی انسان کی سوچ سے کہیں زیادہ دُوررس، گہری اورسیاست کے تقاضوں کےاعتبارسے بہت باریک تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ آپ اپنی پرامن حکمتِ عملی پر قائم رہیں گے تاکہ وہ مقصد زائل نہ ہو جس کے لئے یہ سفرکیا گیا ہے،اور یہ نہ ہوکہ قریش کوایک بہانہ مل جائے اورعربوں کی رائے عامہ اسلام کی بجائے قریش کےحق میں ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں میں اعلان فرمایا:''کون شخص ہمیں ایسے راستہ سے نکال لے جائیگا جس پر وہ (کفار) نہیں گزرتے؟'' ایک شخص آگے بڑھااورمسلمانوں کوایسے راستے سے لے گیا جو بہت ہی پتھریلہ اوردشوارگزارتھا، یہ راستہ پہاڑیوں کے درمیان سے گزرکرحدیبیہ کے مقام کوپہنچا جومکہ کے نچلےعلاقہ میں واقع ہے۔ یہاں مسلمان نے اپنے خیمے نصب کئے۔ جب خالد بن ولیداورعکرمہ ابن ابی جہل نے اِنہیں مکہ کے اتنا قریب دیکھا تووہ خوف زدہ ہوگئے اورمکہ کی طرف فراراختیارکی تاکہ مکہ کی حفاظت کی جائے۔ مسلمانوں کے اس قدم سے کفاردہل کررہ گئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مسلمان بغیرروک ٹوک کے اتنی قریب آجائینگے۔ اب مشرکین کی فوج مکہ میں تھی اورمسلمان حدیبیہ کے مقام پرخیمہ زن تھے۔ دونوں فریق اس بات پرغورکررہے تھے کہ اگلا قدم کیا اُٹھایا جائے۔ بعض مسلمان یہ سوچ رہے تھے کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ قریش اُنہیں بغیر جنگ کے حج کرنے دینگے،اس لئے اب ہمارے سامنےاس کےسوا کوئی چارانہیں کہ جنگ کر کے فتح حاصل کی جائے اورپھرحج،اس طرح قریش کا کام ہمیشہ کیلئے تمام ہوجائیگا۔ ادھرقریش یہ سوچ رہے تھے کہ جنگ کرکےاپنی تمام ترقوت کو بروئے کارلایا جائے اورمسلمانوں کوواپس جانے پرمجبورکردیا جائے، چاہےاس کوشش میں وہ پورے کے پورے فناء ہوجائیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ مسلمانوں کی قوت اورتیاری کے بارے میں فکرمند

تھے اور جانچ رہے تھے کہ مسلمانوں کی کیا حکمتِ عملی ہوگی۔ تاہم رسول اللہ ﷺ اپنی اسی حکمتِ عملی پر قائم تھے جو آپ ﷺ نے احرام باندھتے وقت تیار کی تھی۔ اب آپ ﷺ کو قریش کے اگلے قدم کا انتظار تھا، آپ ﷺ یہ جانتے تھے کہ قریش اُن سے خائف ہیں اور وہ بالآخر اپنا نمائندہ ضرور بھیجیں گے تاکہ آپ ﷺ کے حج پر جانے کے متعلق گفت وشنید کی جائے۔ کچھ ہی انتظار کے بعد قریش نے بدیل بن ورقہ کو الخزاعہ قبیلے کے کچھ افراد کے وفد کے ساتھ بھیجا۔ یہ وفد تھوڑی سی گفتگو کے بعد اس بات سے مطمئن ہو گیا کہ مسلمان لڑائی کیلئے نہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کیلئے آئے ہیں۔ یہ لوگ واپس آئے اور قریش کو اس بات کا یقین دلایا اور اپنی کوشش کی مگر قریش نے الٹا ان پر الزام لگایا کہ وفد رسول اللہ ﷺ کی طرف جھک گیا ہے اور ان کی بات کا یقین نہ کیا۔ پھر قریش نے مکرز بن حفص کی قیادت میں ایک اور وفد روانہ کیا اور اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ پیش آیا۔ اس کے بعد قریش نے حلیس بن علقمہ کو بھیجا جو حبشیوں کا سردار تھا، تاکہ وہ مذاکرات کرے۔ اس سے کفار کا منشاء یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو روکے اور اگر بات چیت ناکام ہوتی ہے تو حلیس کے دل میں مسلمانوں سے نفرت اور بڑھ جائیگی اور اس سے مکہ کے دفاع میں مدد ملے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو حلیس کے آنے کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ قربانی کے اونٹوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے تاکہ جب وہ آئے تو جانور سامنے ہوں اور حلیس کے سامنے یہ واضح دلیل ہو کہ مسلمان حج کے ارادے سے آئے ہیں، نہ کہ لڑائی کی نیت سے۔ جب حلیس مسلمانوں کے خیموں کے پاس آیا تو کھلے ہوئے اونٹ وادی کے عرض میں گھوم رہے تھے اور لوگوں کو دیکھنے سے یہ نہیں لگتا تھا کہ یہ قتال کے ارادے سے آئے ہیں، ہر طرف عبادت کا ماحول تھا۔ اس چیز نے حلیس کو متاثر کیا اور اُسے یقین آ گیا کہ مسلمان حج کے لئے آئے ہیں جنگ کی نیت سے نہیں۔ لہٰذا حلیس رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کئے بغیر مسلمانوں کی نیت سے مطمئن ہو کر مکہ لوٹ گیا۔ اُس نے مکہ پہنچ کر قریش کو احوال سے آگاہ کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ قریش مسلمانوں کو حج کر لینے دیں۔ اور اُس نے قریش کو خبردار کیا کہ اگر قریش رسول اللہ ﷺ اور کعبہ کے درمیان آئے تو وہ اور اس کے حبشی قریش کو چھوڑ جائیں گے۔ اب کفار نے اپنا رویہ نرم کیا تاکہ حلیس کو ٹھنڈا کریں اور کہا کہ اُنہیں کچھ مہلت

درکار ہے تا کہ وہ معاملہ پر اچھی طرح سے غور کرسکیں۔ حلیس اس بات پر راضی ہوگیا۔ اب قریش نے عروہ بن مسعود ثقفی کو بھیجا اور اُسے یقین دلایا کہ وہ اُس کی رائے اور معاملہ فہمی پر اعتماد کرتے ہیں۔ عروہ نے رسول اللہ ﷺ کو ہر طرح سے منانے کی کوشش کی کہ وہ واپس چلے جائیں، اس نے ہر چال آزما کر دیکھ لی لیکن کامیاب نہیں ہوا، آخرکار اُسے رسول اللہ ﷺ کے موقف سے اتفاق کرنا پڑا۔ اُس نے آکر قریش سے کہا: ''اے قومِ قریش! میں نے قیصر کو اس کے ملک میں دیکھا ہے اور کسریٰ اور نجاشی کو اُن کے ملکوں میں دیکھا ہے، لیکن کسی بادشاہ کو ایسا نہیں دیکھا جیسا رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ کے ساتھ دیکھا۔ وہ لوگ کسی بھی چیز کے عوض محمد ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑینگے، لہٰذا اب تم سوچ لو''۔ اس سے قریش کی دشمنی اور خصومت اور بڑھ گئی اور مذاکرات بغیر کسی نتیجہ پر آئے طویل ہوتے چلے گئے۔ اب رسول اللہ ﷺ نے اپنا سفیر بھیجنے کا ارادہ کیا کیونکہ ممکن ہے کہ قریش کے سفیر آپ ﷺ سے ڈرتے ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ ہمارا سفیر قریش کو بات سمجھا پائے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے خراش بن امیہ الخزاعی رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنایا، لیکن قریش نے اُن کے اونٹ کو ذبح کر دیا اور اگر حبشیوں نے اُن کی حفاظت نہ کی ہوتی تو وہ لوگ اُنہیں بھی قتل کر دیتے۔ اس کے بعد قریش کی دشمنی اور بڑھی، وہ اپنے اوباش لڑکوں کو راتوں کو مسلمانوں کے خیموں پر بھیجتے جو خیموں پر پتھر پھینکتے تھے، اس سے مسلمان کو طیش آیا اور وہ قریش سے قتال کرنے کی بات کرنے لگے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں سمجھایا۔ پھر قریش نے پچاس آدمی بھیجے کہ وہ مسلمانوں کے خیموں کو گھیر لیں اور لوگوں کو ماریں۔ لیکن صحابہ نے انہیں پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کر دیا، لیکن آپ ﷺ نے اُن سب کو معاف فرما دیا اور اُنہیں جانے کی اجازت دے دی۔ اس واقعہ کا مثبت اثر اہل مکہ پر پڑا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بات میں سچے ہیں کہ وہ حج کیلئے آئے ہیں اور قتال کرنے نہیں آئے۔ اس طرح رائے عامہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں اس حد تک ہوگئی کہ اگر آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوتے اور قریش روکنے کی کوشش کرتے تو اہلِ مکہ اور اہل عرب ہی اُن ہی کی مخالفت کرتے۔ اب قریش نے اپنی بھڑکانے والی حرکتیں بند کیں اور اپنے معاملہ پر غور کیا تو دیکھا کہ اُن ہی میں سے کچھ آوازیں ایسی اُٹھ رہی ہیں جو امن چاہتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے

پھرارادہ کیا کہ سفیر بھیجا جائے جو قریش سے گفت وشنید کرے، اس غرض سے آپ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ قریش مجھے قتل کر دینگے اور مکہ میں بنوعدی بن کعب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو میری حفاظت کر سکے، قریش کو میرا سخت رویہ اور عداوت یاد ہے، تاہم میں ایک ایسے شخص کا نام بتاتا ہوں جو مجھ سے بڑھ کر عزت والا ہے اور وہ عثمان بن عفان ہیں۔ پس آپ ﷺ نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ابوسفیان کے پاس بھیجا۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بطور سفیر پہنچے اور بات کی، قریش نے اُن سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو بیت اللہ کا طواف کر سکتے ہیں، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے طواف کرنے کے بعد ہی طواف کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد طویل گفتگو ہوئی لیکن قریش اپنی ضد پر اڑے رہے اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بات ماننے سے انکار کرتے رہے۔ بات چیت طول پکڑتی گئی اور بحث مباحثہ جاری رہا تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کا موقف یکسر انکار سے تبدیل ہو کر یہ ہو گیا کہ ایسے نتیجے پر پہنچا جائے جو مسلمانوں اور قریش دونوں کو مطمئن کر سکے۔ ان مباحثوں کے دوران قریش کو عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انداز اچھا لگا اور قریش اب کوئی ایسا حل تلاش کرنے میں دلچسپی لے رہے تھے جس سے بحران سے نجات ملے اور رسول اللہ ﷺ سے دشمنی کا خاتمہ ہو۔ اس دوران جب مکہ میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا قیام زیادہ طویل ہو گیا اور مکہ سے اُن کی کوئی خبر نہ آئی تو مسلمانوں کو یہ شبہہ ہوا کہ قریش نے عثمانؓ سے غداری کی ہے اور شاید اُنہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو بہت افسوس ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ خیال ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمان غصے میں تھے اور انہوں نے اپنی تلواریں میانوں سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیں تھیں اور وہ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پرامن حکمتِ عملی پر نظر ثانی کی کیونکہ موجودہ حالات کا یہی تقاضا تھا، کیونکہ بظاہر قریش نے عثمان رضی اللہ عنہ کو جو ایک سفیر کی حیثیت رکھتے تھے، ان حرمت والے مہینوں میں دھوکہ دے کر قتل کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اعلان فرمایا ''ہم اس قوم سے مقابلہ کئے بغیر نہیں جائینگے''۔ آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے اور صحابہ کو بلایا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ سب بیعت کریں۔ لہٰذا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پورے جوش، قوت ارادی اور صدقِ ایمان کے ساتھ اس

بات کی بیعت کی کہ وہ آخر دم تک لڑتے رہیں گے اور میدان چھوڑ کر نہیں جائینگے۔ جب یہ بیعت ہوگئی تو آپ ﷺ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت کی جیسے وہ ساتھ موجود ہوں۔ یہ بیعت، بیعتِ رضوان کہلائی جس کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِی قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِیْبًا﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں میں جو تھا اسے اس نے معلوم کرلیا اور ان پر اطمینان نازل فرمایا اور انہیں قریب کی فتح عنایت فرمائی''۔(الفتح:18)

ادھر بیعت ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے جنگ کی تیاری شروع کردی تھی، ادھر خبر آئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی اطلاع غلط تھی، اُنہیں قتل نہیں کیا گیا تھا، پھر عثمان رضی اللہ عنہ لوٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ کو قریش سے ہونے والے مذاکرات کے بارے میں تفصیل بتائی۔ اب رسول اللہ ﷺ اور قریش کے مابین مذاکرات پھر شروع ہوئے۔ قریش نے سہیل بن عمرو کو رسول اللہ ﷺ سے مذاکرات کے لئے بھیجا اور یہ مذاکرات حج اور عمرہ کے مسئلہ سے زیادہ وسیع معاملہ پر ہوئے۔ اِن مذاکرات کا دائرہ فریقین کے مابین صلح کا تھا، جس کیلئے شرط یہ تھی کہ مسلمان اس سال بغیر حج کئے ہی لوٹ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو تسلیم کرلیا، کیونکہ اس سے وہ غرض پوری ہو رہی تھی جو شروع سے زیارتِ کعبہ کے سفر میں کارفرما تھی، رسول اللہ ﷺ کو اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ حج اس سال کیا جائے یا آئندہ سال۔ حقیقی مقصد تو یہ تھا کہ اہل خیبر کو قریش سے الگ کر دیا جائے اور قریش سے معاہدہ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں دعوتِ اسلام مزید پھیلائی جا سکے اور اس لئے ضروری تھا کہ قریش سے قتال نہ ہو، رہی بات حج اور عمرہ کی، تو اس میں یہ اہم نہیں تھا کہ حج اس سال کیا جائے یا آئندہ۔ اب مذاکرات شروع ہوئے جو کافی طویل تھے، اس میں جنگ بندی اور اس کی شرائط زیرِ بحث تھیں۔ اِن مذاکرات کے دوران کئی ایسے مواقع آئے جب ایسا لگتا تھا کہ یہ

مباحث بغیر کسی نتیجہ تک پہنچے ہی ختم ہو جائینگے ،لیکن رسول اللہ ﷺ کی دور اندیشی، دقیق سیاسی بصیرت کے سبب ایسی نوبت نہیں آئی۔ ان مذاکرات کے دوران مسلمان رسول اللہ ﷺ کے آس پاس رہے اور وہ اِنہیں حج اور عمرہ کے متعلق مذاکرات سمجھتے رہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اِن کی نوعیت قتال کو روکنے کی تدابیر کی تھی۔ لہٰذا ان مذاکرات سے مسلمانوں کا دل تنگ ہو رہا تھا جبکہ رسول اللہ ﷺ ان مذاکرات کو خوشخبری سمجھ رہے تھے، کیونکہ یہ اُسی رخ پر ہوئے تھے جو رسول اللہ ﷺ نے خود طے فرمایا تھا، قطع نظر اُن وقتی فائدوں اور جزئیات کے جو بظاہر مسلمانوں کے مفاد میں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ بالآخر کچھ طے شدہ شرائط پر معاہدہ ہو گیا۔ البتہ مسلمان اس سے سخت ناراض اور غصہ میں تھے، اُنہوں نے کوشش کی کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ اسے ماننے سے انکار کر دیں اور قریش سے جنگ کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا ''ہم کیوں اِسے قبول کریں جبکہ اس میں ہمارا دین نیچا ہوتا ہے؟'' عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جا کر آپ ﷺ کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ معاہدے کی شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیں، جبکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کوشش یہ تھی کہ خود عمر رضی اللہ عنہ اس بات پر راضی ہو جائیں جس پر رسول اللہ راضی تھے، لیکن عمر رضی اللہ عنہ شدید غصہ کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے، لیکن اُن کی باتوں سے رسول اللہ ﷺ کے صبر یا اُن کے ارادے میں کوئی فرق نہیں آیا اور آپ ﷺ نے فرمایا:

((اني عبد الله و رسوله لن أخالف أمره و لن يضيعني))

''میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس کے حکم کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرونگا اور وہ مجھے کبھی ضائع نہیں کریگا''

پھر آپ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور کہا: ''لکھو، **بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم**'' لیکن سہیل نے ٹوک دیا اور کہا کہ میں نہیں جانتا کہ الرحمٰن الرحیم کون ہے، بلکہ ''لکھو **باسمک اللّٰھم**''، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''لکھو **باسمک اللّٰھم**''۔ پھر فرمایا ''لکھو (**اكتب هذا ما صالح عليه**

محمد رسول اللہ سھیل بن عمرو) ''یہ جس پر محمد، اللہ کے رسول ﷺ کا سہیل بن عمرو کے ساتھ معاہدہ ہوا''۔ سہیل نے پھر ٹوکا اور کہا کہ اگر میں یہ شہادت دیتا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو آپ ﷺ سے جنگ نہ کرتا، اپنے نام کے ساتھ والد کا نام لکھو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لکھو(**اکتب ھذا ما صالح علیہ محمدبن عبد اللّٰہ سھیل بن عمرو**) یعنی، جس پر محمد ﷺ بن عبداللہ کا سہیل بن عمرو سے معاہدہ ہوا''۔ پھر معاہدے کی تفصیلات لکھی گئیں جو اِن دفعات پر مشتمل تھیں:

(1) یہ معاہدہ جنگ بندی کا معاہدہ ہوگا جس کے تحت دونوں فریق ایک دوسرے سے قتال نہیں کرینگے۔

(2) اگر قریش کا کوئی شخص مسلمان ہو کر بغیر اپنے ولی کی اجازت سے مدینہ آجاتا ہے تو اسے واپس مکہ لوٹا دیا جائیگا لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص مرتد ہو کر مکہ آجاتا ہے تو اُسے لوٹایا نہیں جائیگا۔

(3) عرب کے ہر قبیلہ کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے جو چاہے رسول ﷺ کے ساتھ معاہدہ کرے اور جو چاہے قریش کے ساتھ معاہدہ کرے۔

(4) اس سال محمد ﷺ اور مسلمان مکہ سے (بغیر حج کئے) واپس لوٹ جائینگے اور اگلے سال اس طرح آئینگے کہ اُن کے پاس صرف اُن کی تلواریں ہونگی جو میانوں میں ہونگی، اس کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں ہوگا اور وہ تین دن تک قیام کریں گے۔

(5) یہ معاہدہ محدود مدت کیلئے ہوگا اور اس کی میعاد اس پر دستخط ہونے کے بعد سے دس سال ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو نے جس وقت اس معاہدے پر دستخط کیئے تو مسلمان شدید غصہ میں بھی تھے اور اس سے ناراض بھی تھے۔ سہیل اُٹھا اور مکہ کی طرف لوٹ گیا، رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے شدید غصہ اور ناراضگی کو دیکھا اور اُن میں قریش سے جنگ کرنے کی طرف میلان دیکھا تو فکرمند ہوئے اور ام سلمہؓ کے حجرے کی طرف چلے گئے، جو سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک تھیں اور اُنہیں مسلمانوں کا احوال بتایا تو آپؓ نے فرمایا ''اے اللہ کے رسول ﷺ مسلمان کبھی آپ کی حکم عدولی نہیں کرینگے، ہاں وہ اپنے دین، ایمان اور آپ کی رسالت کے اعتبار سے بہت پرجوش ہیں، آپ اپنے سر کے بال منڈوا دیجئے اور اپنے جانور ذبح کیجئے، آپ دیکھیں گے کہ مسلمان بھی یہی کریں گے، پھر آپ اُن کے ساتھ مدینہ لوٹ جایئے''۔ آپ باہر مسلمانوں کے پاس تشریف لائے اور جانور ذبح کیئے اور سر کے بال منڈوا دیے، پھر آپ ﷺ کو سکون محسوس ہوا۔ مسلمانوں نے جب آپ ﷺ کے پرسکون چہرے کو دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے جانور ذبح کر دیے اور سر کے بال منڈوا دیے، اس کے بعد رسول اللہ اور مسلمان مدینہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ اسی واپسی کے سفر میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ پر سورۂ فتح نازل فرمائی جو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو شروع سے آخر تک تلاوت فرما کر سنائی، اب ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ یہ معاہدہ اللہ جل جلالہ کی جانب سے مسلمانوں کے لیے کھلی فتح ہے، اور مسلمان مدینہ لوٹ آئے۔ اب مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے پہلے خیبر کے یہودیوں کا معاملہ صاف کرنے کے منصوبے کو نافذ کیا، پھر جزیرہ نمائے عرب کے باہر اسلام کی دعوت پھیلانے پر غور فرمایا اور عرب کے اندر اس دعوت کو مستحکم کرنے کیلیئے اقدامات کیئے۔ قریش سے کیئے ہوئے جنگ بندی کے معاہدے کے سبب اب آپ ﷺ کو یہ موقع میسّر آیا تھا کہ عرب کے اندر رہی سہی مخالفت کو ختم کریں اور خارجی رابطوں کی طرف دھیان دیں۔ یوں آپ ﷺ حج کے ارادے سے مکہ تشریف لے گئے اور اپنے اس منصوبہ کو نہایت دور اندیشی اور باریک بینی سے کئی مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود عملی جامہ پہنا دیا۔ اور اس طرح وہ

سیاسی مقاصد پورے ہوئے جو آپ ﷺ کو مطلوب تھے۔ لہٰذا حدیبیہ کا معاہدہ ایک عظیم الشان کامیابی تھی، جس کے بعض نتائج مندرجہ ذیل ہیں:

(1) اس معاہدے کے ذریعہ آپ ﷺ نے عربوں میں بالعموم اور مکہ اور قریش میں بالخصوص اسلام کی دعوت کے حق میں رائے عامہ پیدا کی ۔ اور مسلمانوں کے احترام میں جہاں اضافہ ہوا تو دوسری طرف قریش کی وقعت کو زبردست دھچکا لگا۔

(2) اس سے مسلمانوں کی ایمانی قوت اور آپ ﷺ پر مکمل اعتماد کا مظاہرہ ہوا تھا۔ یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ مسلمان موت سے نہیں ڈرتے اور ہر خطرہ سے نمٹنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔

(3) اس واقعہ سے مسلمانوں کو یہ سبق ملا کہ سیاسی تدابیر اسلامی دعوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہیں۔

(4) وہ مسلمان جو مکہ میں مشرکین کے درمیان ہی رہ گئے تھے، انہوں نے اب دشمن کے گھر کے اندر ایک مسلمان وجود کی موجودگی کی شکل اختیار کر لی۔

(5) یہ امر واضح ہوا کہ سیاست کا طریقہ اس کی فکر کے ہی مطابق ہوگا، اور یہ سچائی اور وعدہ وفائی پر مبنی ہوگا، لیکن ضروری ہے کہ وسائل اختیار کرنے میں تدبّر اور ذہانت سے کام لیا جائے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ اپنے حقیقی مقاصد اور ذرائع کو دشمن سے مخفی رکھا جائے۔

باب نمبر 22

پڑوسی ملکوں کو پیغام رسانی

جب رسول اللہ ﷺ کو تمام حجاز میں اسلامی دعوت کے حوالے سے اطمینان ہو گیا تو آپ ﷺ نے حجاز کے باہر دعوت کو پھیلانے کیلئے اقدامات کئے کیونکہ دینِ اسلام تمام انسانیت کیلئے ہے اور رسول اللہ ﷺ کو تمام لوگوں کیلئے مبعوث فرمایا گیا ہے۔ اللہ عزوجل نے سورۃ الانبیاء میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعَٰلَمِينَ﴾

"اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا" (الانبیاء: 107)

اور فرمایا:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾

"اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام بنی نوع انسان کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا" (سباء: 28)

اور سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

''اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے، اگر چہ مشرکوں کو یہ بات ناگوار ہی ہو'' (التوبہ:33)

اب ریاست اور دعوت کے استحکام پر اطمینان ہونے کے بعد آپ ﷺ نے خارجی رابطوں کی طرف قدم اُٹھایا اور قاصد روانہ فرمائے۔ خارجی رابطوں سے آپ ﷺ کی مراد دراصل ان کفار سے رابطہ تھا جو اب تک اسلامی ریاست کے اقتدار سے باہر تھے۔ جب آپ ﷺ کا اقتدار محض مدینہ تک محدود تھا تو خارجی رابطوں سے مراد قریش اور مدینہ کے باہر دیگر عرب قبائل تھے، پھر جب آپ ﷺ کا اقتدار وسیع ہو کر سارے حجاز پر محیط ہوا تو حجاز کے باہر کے علاقوں سے تعلقات خارجی تعلق بن گئے، بعد میں جب رسول اللہ ﷺ کا اقتدار پھیل کر پورے جزیرہ نمائے عرب پر محیط ہو گیا تو خارجی رابطوں سے مراد جزیرہ نمائے عرب سے باہر مثلاً فارس اور روم سے تعلقات تھے۔ صلح حدیبیہ اور اہل خیبر سے نمٹنے کے بعد قریب قریب سارے حجاز پر اسلامی ریاست کا اقتدار ہو گیا تھا اور اب قریش کی وہ طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے راستے میں حائل ہو سکیں۔ جب آپ ﷺ کو داخلی حالات پر اطمینان ہو گیا اور اس بات پر کہ اندرونی اقتدار اتنا مضبوط ہے کہ وہ نئی خارجہ پالیسی کا متحمل ہو سکتا ہے، تو آپ ﷺ نے دوسرے ممالک میں اپنے سفیر روانہ کئے۔ خیبر سے لوٹنے کے بعد آپ ﷺ ایک دن صحابہ سے ملے اور فرمایا:

((ان اللّٰہ قد بعثنی رحمةً و کافةً فلا تختلفوا عليَّ کما اختلف الحواریون علی عیس ابن مریم))

''بے شک اللہ عزوجل نے مجھے سارے لوگوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے سو تم میرے بعد میرے بارے میں اختلاف میں نہ پڑ جانا جیسے عیسیٰؑ کے بعد اُن کے حواری پڑ گئے تھے''

صحابہ ﷺ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! عیسیٰ کے حواری کس طرح اختلاف میں پڑ گئے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((دعاهم إلى الذى دعوتكم إليه فأما من بعثه مبعثاً قريباً فرضى و سلم وأما من بعثه مبعثاً بعيداً فكره وجهه و تثاقل))

''عیسیٰ نے وہی دعوت دی جو میں نے تمہیں دی، پھر جس کسی کو قریب کے علاقہ میں بھیجا گیا تو وہ راضی خوشی چلا گیا اور جس کسی کو دور دراز بھیجا تو اسے گراں گزرا اور اس نے سستی کی''

اس کے بعد آپ ﷺ نے اُنہیں بتایا کہ وہ روم کے بادشاہ ہرقل، فارس کے کسریٰ، مصر کے مقوقس، حیرۃ کے بادشاہ حارث الغسّانی، یمن کے بادشاہ حارث الحمیر ی، حبشہ کے نجاشی، عُمان، بحرین اور یمامہ کے بادشاہوں کے پاس سفیروں کو بھیجیں گے۔ صحابہ نے اپنی رضامندی ظاہر کی، اور آپ ﷺ کیلئے ایک چاندی کی انگوٹھی مُہر کے طور پر تیار کروائی جس پر 'محمد رسول اللّٰــہ' تحریر تھا۔ آپ ﷺ نے اِن بادشاہوں کے نام خطوط تحریر کروائے جن میں اُنہیں اسلام کی دعوت دی گئی تھی، پھر دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ہرقل کے پاس، عبداللہ بن حذیفہ سہمی رضی اللہ عنہ کو کسریٰ کے پاس، جبکہ نجاشی کے پاس عمرو بن امیہ ضمری کو، مقوقس کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو، عُمان کے بادشاہ کے پاس عمرو بن العاص سہمی رضی اللہ عنہ کو، اسی طرح سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ کو یمامہ کے بادشاہ کے پاس، العلاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین کے بادشاہ کے دربار میں، شجاع بن وھب الاسدی رضی اللہ عنہ کو حارث الغسانی تخومِ شام کے بادشاہ کے پاس اور یمن کے بادشاہ حارث الحمیر ی کے پاس مہاجر بن امیہ مخزومی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ یہ لوگ بیک وقت اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے، انہوں نے اپنے اپنے خطوط مقررہ بادشاہوں تک پہنچائے اور مدینہ لوٹے۔ جن بادشاہوں کو خطوط ارسال کئے گئے تھے قریب قریب سب کے جواب آئے اور یہ جوابات زیادہ تر مثبت تھے، گو کہ بعض جوابات منفی اور برے بھی تھے۔ عرب بادشاہوں میں عُمان اور یمن کے بادشاہوں کے جوابات برے تھے جبکہ بحرین کے بادشاہ کا جواب بہت اچھا تھا اور اس نے اسلام قبول بھی کرلیا۔

یمامہ کے بادشاہ نے لکھا کہ وہ اسلام قبول کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ اُسے ہی وہاں کا حاکم بنایا جائے ،اس خواہش پر رسول اللہ ﷺ نے اُس پر ملامت کی۔ غیر عرب بادشاہوں میں فارس کے بادشاہ کسریٰ کو جب رسول اللہ ﷺ کا خط دیا گیا تو وہ بہت غضبناک ہوا اور اُس نے خط پھاڑ دیا اور یمن میں اپنے گورنر باذان کو لکھا کہ حجاز کے اِس شخص کا سر اُسے بھیجا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: ((مزق اللّٰہ ملکہ)) یعنی ''اللہ اُس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے''۔ باذان کو جب کسریٰ کا یہ حکم ملا تو اُس نے اسلام کے بارے میں اپنی چھان بین کی اور دینِ اسلام قبول کرلیا اور اس کا اعلان کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے اُسے وہاں کا عامل بنائے رکھا۔ باذان اور یمن کے ایک اور علاقے کا بادشاہ حارث الحمیر ی دو مختلف شخص ہیں۔ قبطی عیسائیوں کے سربراہ مقوقس نے خط کا اچھا جواب دیا اور رسول اللہ ﷺ کیلئے تحفے بھی بھیجے۔ نجاشی نے بھی مثبت جواب بھیجا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کے اس خط پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ تو اپنی فوجیں بھیجیں اور نہ ہی کوئی اور بات کہی۔ جب حارث الغسانی نے ہرقل سے اجازت طلب کی کہ وہ نبوت کے اس دعویدار پر چڑھائی کرے تو ہرقل نے منع کر دیا اور حارث الغسانی کو اپنے پاس بیت المقدّس طلب کرلیا۔ اِن خطوط کے نتیجے میں عرب جوق در جوق اور فوج در فوج اسلام کے دائرہ میں آنے لگے، وہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آتے اور اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتے۔ رہے غیر عرب، تو اللہ کے رسول ﷺ نے اُن سے جہاد کیلئے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔

باب نمبر 23

غزوہ خیبر

حدیبیہ کے معاہدے سے فارغ ہو کر مسلمانوں کو مدینہ واپس آئے ابھی پندرہ راتیں ہی گزریں تھیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ خیبر کے یہودیوں سے جنگ کیلئے تیار ہو جائیں اور یہ بھی فرمایا کہ اس غزوہ میں صرف وہی اشخاص حصہ لے سکتے ہیں جو حدیبیہ میں ساتھ تھے۔ حدیبیہ جانے سے قبل آپ ﷺ کو یہ خبر ملی تھی کہ خیبر کے یہودی قریش کے ساتھ خفیہ سازش کر رہے ہیں کہ مدینہ پر چڑھائی کر کے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے قریش سے معاہدہ کر کے یہود کو الگ تھلگ کر دیا جائے پھر اُن کی خبر لی جائے۔ لہٰذا اپنے منصوبے کے پہلے حصے، یعنی قریش سے حدیبیہ کے معاہدے، کو مکمل کرنے کے بعد اب آپ ﷺ نے منصوبے کے دوسرے حصے کی تکمیل شروع کی یعنی خیبر کے یہودیوں کا قلع قمع۔ حدیبیہ سے واپسی کے بعد آپ ﷺ 1600 سپاہیوں کے ساتھ جن میں 100 گھڑسوار تھے، خیبر کی طرف بڑھے۔ اس فوج کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مدد و نصرت کا پوری طرح یقین تھا۔ انہوں نے مدینہ اور خیبر کا فاصلہ تین دن میں طے کیا اور اس دوران خیبر کے یہودی اِن کی آمد سے بے خبر تھے، اُن کی بے خبری اِس حد تک تھی کہ مسلمان فوج نے رات اُن ہی کے قلعہ کے باہر گزاری اور جب صبح کو یہودی اپنے بیلچے اور ٹوکریاں لے کر کھیتوں کی طرف نکلے تو تب اُن کی نظر مسلم فوج پر پڑی اور وہ سب پیٹھ پھیر کر چلاتے ہوئے بھاگے کہ ''محمد ﷺ اور اُن کے سپاہی آ پہنچے ہیں''۔ اللہ کے رسول

ﷺ نے جب یہ سنا تو فرمایا: ''اللہ اکبر! خیبر برباد ہو چکا، ہم جب لوگوں کے کسی ایسے علاقے میں آتے ہیں کہ جسے خبردار کیا جا چکا ہوتا ہے تو وہ دن اُس قوم کے لیے بُرا دن ہوتا ہے'' جب یہودیوں کو قریش کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدے کی خبر ملی تھی تو تب سے خیبر کے یہودیوں کو اندازہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اب خیبر پر حملہ کرینگے۔ اُن کے نزدیک قریش نے اُن کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو توڑ دیا تھا۔ چنانچہ نئی خطرناک صورتحال کے پیشِ نظر اُن کے بعض لوگوں نے یہ رائے دی تھی کہ وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں کے ساتھ مل کو دوسرے عرب قبائل کے بغیر ہی ایک فوج تیار کی جائے تاکہ مدینہ پر حملہ کیا جا سکے، کیونکہ اب قریش نے مسلمانوں سے معاہدہ کر لیا تھا۔ جبکہ یہود میں بعض کی رائے تھی کہ مسلمانوں سے معاہدہ کر لیا جائے تاکہ اُن کے دلوں سے یہودیوں کی نفرت کو زائل کیا جائے۔ یہ بات ان میں زیرِ بحث تھی کیونکہ وہ خطرے کو نزدیک آتا محسوس کر رہے تھے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ یہودی قریش کے ساتھ مل کر سازشیں کر رہے ہیں، پس رسول اللہ ﷺ لازماً حملہ کریں گے۔ تاہم انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ مسلمان حملہ کرنے میں اتنی جلدی کریں گے۔ لہٰذا وہ رسول اللہ کے لشکر کے آنے پر ہکا بکا رہے گئے۔ اُنھوں نے قبیلہ غطفان سے مدد طلب کی۔ یہودیوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کا مقابلہ کیا جائے اور اپنے قلعوں کو محفوظ رکھا جائے، لیکن مسلمانوں کا حملہ اتنا شدید اور چست تھا کہ اُن کی مزاحمت کام نہ آئی اور اُن کے تمام قلعے فتح ہو گئے۔ مایوس ہو کر یہودیوں نے صلح کی پیشکش کی کہ اُن کی جان بخش دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات قبول کر لی اور یہودیوں کو وہیں رہنے دیا۔ فتحِ خیبر کے بعد وہ علاقہ اور انگوروں کے باغ فتح کے قوانین کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے تھے، تاہم آپ نے یہودیوں کو وہیں رہنے دیا اور ان پر زمینوں کی آدھی پیداوار رسول اللہ ﷺ کو دینے کا حکم لاگو کیا۔ یہودیوں نے اس تقسیم کو قبول کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ لوٹ آئے اور عمرۂ قضاء کیلئے نکلنے تک مدینہ میں ہی رہے۔

اس طرح خیبر کے یہودیوں کی سیاسی حیثیت کو ختم کر کے اور اُنہیں مسلمانوں کے زیر

اقتدار لانے کے بعد اب شمال میں ملکِ شام تک کا علاقہ مسلمانوں کیلئے خطرے سے پاک ہو چکا تھا جیسا کہ اس سے قبل صلح حدیبیہ کے بعد جنوب کی طرف کا علاقہ پرامن ہو چکا تھا۔ اب اسلامی دعوت کو سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیلانے کیلئے صاف راستہ میسر ہو گیا تھا اور جزیرہ نمائے عرب سے باہر کا راستہ بھی مکمل طور پر کھل گیا تھا۔

باب نمبر 24

عمرۂ قضاء

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان امن قائم ہوگیا تھا۔ اس صلح کے بعد قبیلہ خزاعہ کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ ہوگیا اور وہ مسلمانوں کی پناہ میں آ گئے جبکہ قبیلۂ بنو بکر نے قریش کے ساتھ معاہدہ کیا اور وہ قریش کی پناہ میں چلے گئے۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے تھے۔ قریش نے اب اپنی توجہ تجارت کے فروغ کی طرف کی تا کہ پچھلے سالوں میں مسلمانوں کے ساتھ جنگوں کے دوران جو کچھ نقصان اُنہوں نے اُٹھایا تھا اُس کی کمی پوری کی جا سکے۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی توجہ اسلام کے پیغام کو تمام لوگوں تک پہنچانے، ریاستِ اسلامی کو سارے جزیرہ نما عرب میں مضبوط کرنے اور ریاست کے اندر امن کے قیام پر مرکوز فرمائی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا، مختلف ریاستوں کے بادشاہوں کو خطوط لکھے، خارجی رابطے کیے اور اسلامی ریاست کو مستحکم بنایا تا کہ وہ سارے جزیرہ نما عرب پر حاوی ہو سکے۔ پھر صلحِ حدیبیہ کے ٹھیک ایک سال بعد آپ ﷺ نے لوگوں میں اعلان کیا کہ وہ عمرۂ قضاء کی تیاری کریں جس کیلئے پچھلے سال اُنہیں روک دیا گیا تھا۔ اب دو ہزار افراد نے کوچ کیا جن کے پاس صرف اپنی تلواریں تھیں جنہیں میانوں میں رکھا گیا تھا، اس کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا جیسا کہ حدیبیہ کے معاہدہ میں طے کیا گیا تھا۔ البتہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اہلِ مکہ کے دھوکے کا خطرہ رہتا تھا اسلئے آپ ﷺ نے سو گھڑ سواروں کو محمد بن مسلمہ کی قیادت میں اپنے آگے

جانے کا حکم دیا اور یہ تاکید کردی کہ اُنہیں مکہ کی حرمت کا لحاظ رکھنا ہے۔ بہرحال مسلمان مکہ پہنچے اور بغیر کسی حادثہ کے عمرہ ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ لوٹ آئے۔ اِن کے واپس لوٹنے کے بعد اہلِ مکہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔ خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور کعبہ کے محافظ عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کرلیا۔ اہلِ مکہ میں سے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور یوں جہاں اسلام کی قوت اور دبدبے میں اضافہ ہوا، وہاں قریش کی صفوں میں کمزوری بھی بڑھتی چلی گئی۔

باب نمبر 25

غزوۂ موتہ

جیسے ہی جزیرہ نما عرب سے باہر مختلف بادشاہوں کو بھیجے ہوئے سفیر واپس لوٹے رسول اللہ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ فارس اور روم کی خبروں پر نظر رکھا کرتے تھے، جبکہ روم کی سرحد اسلامی ریاست سے ملی ہونے کی وجہ سے آپ اُس کے متعلق مسلسل معلومات حاصل کر رہے تھے۔ آپ ﷺ یہ دیکھ رہے تھے کہ دعوتِ اسلام جب جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر لوگوں تک پہنچے گی تو یہ دعوت بڑی تیزی سے پھیل سکے گی۔ آپ ﷺ کا اندازہ تھا کہ یہ سلسلہ شام سے شروع ہوگا۔ اب جبکہ یمن میں کسریٰ کے سابقہ عامل باذان کی طرف سے اطمینان تھا کیونکہ وہ پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے، لہٰذا اب آپ ﷺ نے رومیوں سے لڑنے کے لیے شام کی جانب فوج بھیجنے کا ارادہ فرمایا، چنانچہ جمادیٰ الاول 8 ہجری یعنی عمرۂ قضا کے چند ہی ماہ بعد مسلمانوں کے تین ہزار بہترین سپاہیوں کی فوج تشکیل دی گئی، جس کی قیادت آپ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اور فرمایا:

((إن أصيب زيد فجعفر ابن ابی طالب علی النّاس فإن أصيب جعفر فعبد اللّٰه ابن رواحة علی النّاس))

''اگر زید زخمی ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب قیادت کریں اور اگر جعفر بھی زخمی ہو جائیں تو عبداللہ

بن رواحہ قیادت کرینگے“

فوج روانہ ہوئی، اس میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جو صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ فوج کو روانہ کرنے کے لیے مدینہ کے باہر تک ساتھ آئے اور اُنہیں نصیحت فرمائی کہ وہ عورتوں، بچوں اور نابیناؤں کو قتل نہ کریں، گھروں کو مسمار نہ کریں اور درخت نہ کاٹیں۔ پھر آپ ﷺ نے فوج کے لیے دعا کی:

((صحبکم اللّٰه و دفع عنکم و رد ألینا سالمین))

”اللہ تمہارے ساتھ ہو، تمہاری حفاظت فرمائے اور تمہیں بحفاظت ہمارے پاس واپس لائے“

یہ فوج روانہ ہوئی اور اس کے قائدین جنگ کیلئے اپنا منصوبہ طے کرنے لگے اور طے کیا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ وہ اچانک حملہ کرتے تھے، انہوں نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ شام پر اچانک حملہ کیا جائے۔ لیکن جب یہ فوج شام میں معان کے مقام پر پہنچی تو خبر ملی کہ ہرقل کے مقامی والی مالک بن زافلہ نے عرب قبائل پر مبنی ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج تیار کر رکھی ہے اور خود ہرقل مزید ایک لاکھ سپاہی ساتھ لے کر جنگ کے لیے تیار ہے۔ اس خبر نے مسلمانوں کو حیران کر دیا، چنانچہ مسلمانوں نے دو راتوں تک معان میں ہی قیام کیا اور یہ سوچتے رہے کہ وہ اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ دشمن کی اس قدر بڑی فوج کا مقابلہ کیسے کر پائینگے۔ سب سے بہتر راستہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو مراسلہ بھیج کر دشمن کی تعداد بتائی جائے ممکن ہے کہ وہ مدد بھیجیں یا کوئی اور حکم دیں، لیکن عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ”اے لوگو! کیا تمہیں وہ چیز ہی مشکل لگ رہی ہے جس کیلئے ہم گھروں سے نکلے ہیں؟ یعنی شہادت! ہم دشمن سے قوت یا تعداد کے دم پر نہیں لڑتے بلکہ اُس دین کے دم پر لڑتے ہیں جس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں نوازا ہے۔ لہٰذا نکلو! ہمارے لئے دونوں ہی راستے اچھے ہیں، فتح یا شہادت“۔ اس خطاب نے مسلمانوں کے لشکر کو ایمانی جذبے سے سرشار کر دیا۔ فوج روانہ ہوئی اور آگے بڑھتی ہوئی مشارف کے مقام پر پہنچی جہاں رومی فوج کی ایک جماعت موجود تھی چنانچہ مسلمان وہاں سے ہٹ کر موتہ کے مقام پر پہنچے اور پڑاؤ

ڈالا۔ یہیں رومیوں سے جنگ ہوئی جونہایت خونریز اور شدید تھی، ہر طرف موت اور خون کا منظر تھا۔ یہ جنگ محض تین ہزار مسلمانوں، جوصرف شہادت کے متمنی تھے اور دو لاکھ رومیوں کے درمیان تھی، وہ رومی جو مسلمانوں کا کام تمام کرنے آئے تھے۔ معرکہ کے آغاز میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اسلام کا جھنڈا اُٹھایا اور آگے بڑھ کر عین دشمن کے بیچوں بیچ گھس گئے، وہ اپنے سامنے موت کو دیکھ رہے تھے لیکن اُس سے ڈرے نہیں کیونکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کے راستہ میں شہادت تھی۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایسی جرأت سے آگے بڑھے جو تصور نہیں کی جاسکتی یہاں تک کہ دشمن کے نیزے نے آپ کے جسم کو چیر دیا اور آپ شہید ہوگئے۔ اس کے بعد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جھنڈا سنبھالا جو ابھی محض 33 سال کے بہادر اور خوب شکل جوان تھے۔ وہ بڑی بہادری سے دشمن کی صفوں میں گھس گئے یہاں تک کہ دشمن نے اُن کے گھوڑے کو گھیر کر زخمی کر دیا، جعفر رضی اللہ عنہ گھوڑے سے اتر کر صرف اپنی تلوار سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ ایک رومی سپاہی نے اُنہیں کاری ضرب لگائی اور جسم کے ٹکڑے کر دیے اور آپ ؓ شہید ہو گئے۔ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اُٹھا کر فوج کی قیادت سنبھالی اور قدرے تردّد کے باوجود آگے بڑھتے رہے اور شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ثابت بن اقرم رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اُٹھا کر لوگوں سے کہا: اے لوگو! ایک شخص کے گرد جمع ہو جاؤ۔ فوج خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہوگئی۔ خالد بن ولید نے جھنڈا سنبھالا اور فوج کو منظّم کرنے کے لیے اُس کی مناسب صف بندی کی اور جنگ کو ہلکی جھڑپوں تک محدود کیا یہاں تک کہ شام ہوگئی اور دونوں فوجیں صبح تک کیلئے پیچھے ہٹ گئیں۔ اس رات خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنے کے لیے منصوبہ تیار کیا، کیونکہ دشمن ایک بہت ہی بڑی طاقت لے کر سامنے تھا۔ اس حکمتِ عملی کے بموجب اُنہوں نے اپنی فوج کی خاصی تعداد کو پابند کیا کہ وہ علی الصبح پیچھے ہٹ کر کچھ دور چلے جائیں اور شور کرتے ہوئے آگے بڑھیں، اس سے دشمن کو لگے گا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید کمک بھیج دی ہے۔ جب انہوں نے صبح ایسے کیا تو دشمن کو خوف ہوا اور وہ حملہ کرنے سے ہچکچایا۔ لیکن اب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حکمت عملی کے مطابق عملی حملہ نہیں کیا۔ اس سے دشمن کو اطمینان ہوا اور ادھر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حکمتِ عملی کے مطابق اپنی فوج کو لیکر

مدینہ لوٹ گئے۔ یوں اس منصوبہ کی بدولت مسلمان نہ جنگ جیتے اور نہ ہی ہارے، لیکن انہوں نے ایک کارنامہ انجام دیا۔

فوج کی پوری قیادت اور تمام اہلِ لشکر موت کو محسوس کر رہے تھے بلکہ اپنے سامنے دیکھ رہے تھے، لیکن پھر بھی انہوں نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کچھ شہید بھی ہوئے کیونکہ اسلام ایک مسلمان کو یہی حکم دیتا ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی راہ میں جہاد کرے یہاں تک کہ یا وہ خود قتل ہو جائے یا دشمن کو قتل کر دے اور یہ سودا نفع کا سودا ہے کیونکہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ اللہ ﷻ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

"بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں۔ اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے" (التوبہ: 111)

یہی وجہ تھی کہ یہ فوج بہادری سے لڑی حالانکہ موت یقینی تھی۔ جب قتال کرنا ضروری ہو تو مسلمان لڑنے سے پیچھے نہیں ہٹتا، خواہ موت یقینی ہو یا نہ ہو۔ جہاد میں معاملہ کی جانچ کا معیار دشمن کی طاقت یا تعداد نہیں ہوتا بلکہ اس سے قطع نظر جہاد سے حاصل ہونے والے نتائج پیشِ نظر ہوتے ہیں خواہ اُن میں جانی نقصان کچھ بھی ہو۔ مسلمانوں کے لیے موتہ میں رومیوں سے جنگ بہت اہم تھی۔ یہ سپہ سالاروں کے لیے لازم تھا کہ وہ جنگ لڑیں حالانکہ موت یقینی تھی۔ مسلمان اللہ ﷻ کے راستہ میں کسی بھی شے کو خاطر میں نہیں لاتا اور نہ ہی موت کو اہمیت دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس

سے اچھی طرح واقف تھے کہ رومیوں سے اُنہی کی حدود میں جا کر لڑنے میں کس قدر خطرہ ہے، لیکن بہر حال رومیوں کو یہ ڈراوا دینا ضروری تھا کہ مسلمان کس قدر بہادری اور دلیری سے لڑتے ہیں چاہے اُن کی تعداد کتنی ہی قلیل ہی ہو۔ یہ خطرہ مول لینا ضروری تھا تاکہ مسلمانوں کے سامنے اسلامی کی دعوت کو پھیلانے اور نئے علاقوں پر اسلام کو نافذ کرنے کے لیے جہاد کے طریقے کو واضح کر دیا جائے۔ اور یہی معرکہ پھر جنگِ تبوک کا پیش خیمہ بنا۔ نیز اس معرکے نے رومیوں کو مسلمانوں کا سامنا کرنے سے خوف میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ بالآخر شام فتح ہوا۔

باب نمبر 26

فتحِ مکہ

مسلمان جب مؤتہ کی لڑائی سے واپس آئے جس میں انہیں بہت زیادہ جانی نقصان اُٹھانا پڑا تھا تو قریش کو یہ خیال ہوا کہ اِن کی طاقت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے اپنے حلیف قبیلہ بنی بکر کو مسلمانوں کے خلاف اُکسایا اور ہتھیاروں سے مدد کی کہ وہ مسلمانوں کے حلیف قبیلے خزاعہ پر حملہ کریں۔ بنی بکر نے خزاعہ پر حملہ کر کے اُن کے کچھ لوگ قتل کر دیئے تو خزاعہ کے باقی لوگ پناہ کے لیے مکہ چلے گئے۔ اور اُن کا سردار عمرو بن سالم الخزاعی رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ آیا اور آپ ﷺ کو تمام احوال سے آگاہ کر کے آپ سے مدد چاہی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے عمرو بن سالم تمہاری مدد کی گئی“۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ قریش نے عہد شکنی کی ہے اور اب اس کا حل یہی ہے کہ مکہ فتح کر لیا جائے۔ ادھر قریش کو بھی اس عہد شکنی کی وجہ سے خوف تھا چنانچہ اُنہوں نے معاہدۂ حدیبیہ کو پکا کرنے اور اس کی مدت بڑھوانے کیلئے ابوسفیان کو بھیجا۔ ابو سفیان مدینہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ سے نہیں ملا بلکہ اپنی بیٹی امّ حبیبہؓ کے گھر کی طرف گیا جو ازواجِ مطہرات میں سے تھیں۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر بیٹھنے لگا تو امّ حبیبہؓ نے اس بستر کو لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ ”کیا تم نے یہ بستر اس لئے لپیٹ دیا کہ میں اس بستر کے لائق نہیں ہوں یا اس لئے کہ یہ بستر میرے لائق نہیں ہے؟“ امّ حبیبہؓ نے جواب دیا کہ ”یہ بستر رسول اللہ ﷺ کا ہے اور تم ایک ناپاک ونجس مشرک ہو، میں نہیں چاہتی کہ تم اس پر بیٹھو“۔ ابوسفیان غضبناک

حالت میں بیٹی سے یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا: ''اللہ کی قسم! جب سے تم نے مجھے چھوڑا ہے تم خراب ہوگئی ہو''۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور اُن سے معاہدے کی میعاد بڑھانے کی بات کی لیکن آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے بات کریں لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ اب وہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، عمر رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں جھڑک دیا اور کہا: ''بھلا میں تم لوگوں کی اللہ کے رسول ﷺ سے سفارش کروں! اللہ کی قسم! اگر میرے پاس معمولی سامان بھی ہو تو میں اُسی سے تم سے جہاد کرونگا''۔ اس کے بعد وہ علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جہاں فاطمہؓ بھی تھیں، ابوسفیان نے اپنے آنے کی غرض بتائی اور رسول اللہ ﷺ سے سفارش کرنے کو کہا۔ علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی بات کا فیصلہ کرلیں تو کوئی بھی انہیں اُس فیصلے پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتا۔ ابوسفیان نے اب فاطمہؓ کی طرف رجوع کیا اور درخواست کی کہ وہ اپنے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے درمیان ضامن بنائیں، جو ابھی بہت کم عمر تھے۔ فاطمہؓ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ایک تو حسن رضی اللہ عنہ بہت چھوٹے ہیں اور دوسرا یہ کہ اللہ کے رسول کے خلاف کوئی بھی ضامن نہیں بن سکتا۔ ابوسفیان ہر طرف سے مایوس ہو کر مکہ لوٹ گیا اور لوگوں کو اپنی روداد سنائی۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے فوراً لوگوں کو تیار ہونے کا حکم دیا اور اُن کے ساتھ مکہ کیلئے روانہ ہوئے۔ اس طرح آپ ﷺ کا منشاء یہ تھا کہ قریش کو اچانک گھیر لیا جائے اور وہ اس طرف سے غافل ہوں تا کہ بغیر کسی خونریزی کے وہ ہتھیار ڈال دیں۔ یہ فوج جس کی تعداد 10 ہزار تھی روانہ ہوئی اور مکہ سے تقریباً 5 کلومیٹر کے فاصلہ پر **مرّ الظھران** کے مقام تک پہنچی۔ ابھی تک قریش کو اس فوج کے آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی لیکن اُنہیں اس کا اندازہ تھا اور وہ اس کے بچاؤ کی تدبیروں پر آپس میں بحثیں کر رہے تھے۔ ابوسفیان جو مکہ کی حفاظت اور اس کو درپیش خطرات سے چوکس رہتا تھا اطراف میں گشت کر رہا تھا کہ اُسے عباس ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ملے جو اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے خچّر پر سوار تھے۔ عباس قریش کو خبردار کرنے جا رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کی پناہ حاصل کرلیں کیونکہ اُن کے پاس اب اور کوئی راستہ نہیں بچا۔ جب یہ دونوں ملے تو عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان سے کہا کہ اللہ کے

رسول آ پہنچے ہیں اور مجھے خدشہ ہے کہ اگر رسول اللہ بزورِ بازو مکہ میں داخل ہوئے تو قریش کے لئے محض ہلاکت ہی ہوگی۔ ابوسفیان نے عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا ''میرے ماں باپ تم پر قربان، اب کیا راستہ رہ گیا ہے''؟ جواباً عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو خچر کے پیچھے بٹھایا اور دونوں چل دیئے۔ راستہ میں عمر رضی اللہ عنہ نے جب انہیں آتے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ کے خچر کو اور ابوسفیان کو پہچان لیا اور سمجھ گئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پناہ کی غرض سے جارہے ہیں۔ چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خیمہ کی طرف دوڑے اور یہ مطالبہ کیا کہ ابوسفیان کی گردن اُڑادی جائے۔ ادھر عباس رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے اور کہا کہ انہوں نے ابوسفیان کو پناہ دی ہے۔ عباسؓ اور عمرؓ کے درمیان گرما گرم بحث ہوئی۔ تاہم رسول اللہ ﷺ نے عباس سے کہا کہ وہ ابوسفیان کو لے کر اپنے خیمہ میں چلے جائیں اور صبح کو اُن کے پاس لائیں۔ اگلی صبح جب ابوسفیان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا جارہا تھا تو انہوں نے اسلام قبول کیا اور جب رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ''ابو سفیان کو اپنی خودداری اور فخر عزیز ہے لہٰذا آپ ایسا کچھ کر دیجئے جس سے اس کی خودداری بنی رہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((نعم، من دخل دار ابی سفیان فهو آمن،و من أغلق بابه فهو آمن، ومن دخل المسجد فهو آمن))

''اچھا، جوکوئی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا وہ محفوظ ہوا، جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا وہ محفوظ ہوا اور جوکوئی مسجد (الحرام) میں داخل ہوگیا وہ بھی محفوظ ہوگیا''

پھر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ابوسفیان کو مکہ کے پہاڑ کے دامن کی تنگ وادی میں روکے رکھا جائے تاکہ وہ گزرنے والی مسلمان فوج کو دیکھ لے، اس کے ساتھ ساتھ کہیں وہ جلد پہنچ کر قریش کو اطلاع نہ دے سکے کہ جس کی وجہ سے کہیں قریش مزاحمت نہ کریں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ پوری احتیاط اور چوکس انداز سے مکہ میں داخل ہوئے اور ادھر ابوسفیان مکہ پہنچے اور اونچی آواز سے یہ اعلان کیا کہ اے قریش! محمد ﷺ مکہ میں داخل ہوگئے ہیں اور اب تمہارے پاس کوئی راہ نہیں بچی ہے، اب جوکوئی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا وہ محفوظ ہے، جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا

وہ محفوظ ہے اور جو کوئی مسجدِ حرام میں پہنچ گیا وہ محفوظ ہے۔ یہ سن کر قریش مزاحمت سے رُک گئے اور رسول اللہ ﷺ پوری احتیاط کے ساتھ مکہ میں داخل ہوگئے۔ آپ ﷺ نے اپنی فوج کو چار دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستے کو حکم دیا کہ وہ نہ قتال کریں اور نہ خون بہائیں جب تک کہ اُن کو شدید مجبور نہ کیا جائے۔ اس طرح چاروں دستے بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہوگئے، سوائے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستے کے، اور انہوں نے بھی مزاحمت پر جلد ہی غلبہ پا لیا۔ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ کے ایک اونچے مقام پر پہنچے، کچھ دیر وہاں رکے پھر کعبہ تشریف لائے اور سات طواف کیے۔ پھر عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلایا جنہوں نے آ کر کعبہ کا دروازہ کھولا۔ آپ ﷺ کعبہ کے دروازے میں کھڑے تھے، لوگ کی بڑی تعداد گرد جمع ہو چکی تھی، آپ ﷺ نے اُن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

((لا إله إلا اللّٰه وحده لا شريک له،صدق وعده ونصره عبده و هزم الأحزاب وحده الا کُل مأثرةٍ أو دمٍ أو مالٍ يدعى فهو تحت قدمي هاتين إلا سدانة البيت و سقاية الحاج الا و قتيل الخطاء شبه العمد بالسوط والعصا ففيه دية مغلظة مئة من الإبل منها أربعون فی بطونها اولادها .يا معشر القريش إن الله قد أذهب عنكم نخوة الجاهلية و تعظمها بالآباء الناس من آدم ،وآدم من تراب))

''نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا، جو اکیلا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی نصرت کی اور تمام احزاب کو تنہا شکست دی۔ سن لو بیت اللہ کی چابی سنبھالنے اور حاجیوں کو پانی پلانے کے سوا تمام فخر و اعزاز، مال اور خون آج میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ سن لو قتلِ خطا میں جو کوڑے اور ڈنڈے سے ہو سو اونٹوں کی دیت ہے، جن میں سے چالیس اونٹنیوں کے پیٹ میں ان کے بچے ہوں۔ اے قریش کے لوگو! اللہ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا پر فخر کا خاتمہ کر دیا۔ تمام لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے''

اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ

﴿اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ﴾

''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک (ہی) مرد وعورت سے پیدا کیا ہے، اور اس لئے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو تمہارے کنبے اور قبیلے بنا دیئے ہیں، بے شک اللہ کے نزدیک تم سب میں باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے یقین مانو کہ اللہ دانا اور باخبر ہے'' (الحجرات:13)

پھر آپ ﷺ قریش سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ اہلِ قریش تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ لوگوں نے کہا ''خیر کا معاملہ، آپ ایک مہربان بھائی اور ایک مہربان بھائی کے بیٹے ہیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إذهبوا فأنتم الطلقاء))

''جاؤ تم سب آزاد ہو''

آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے اس ایک کلمہ سے تمام قریش اور اہلِ مکہ کو معافی مل گئی۔ اب آپ ﷺ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور دیکھا کہ اس کی دیواروں پر نبیوں اور فرشتوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ آپ ﷺ کے حکم سے اُن تصاویر کو وہاں سے مٹا دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہاں ایک مٹی سے بنی کبوتری دیکھی جسے خود اُٹھایا اور اپنے ہاتھ سے توڑ کر زمین پر پھینک دیا۔ پھر اپنے ہاتھ کی چھڑی سے بتوں کی طرف یہ کہتے ہوئے اشارہ فرمایا:

﴿وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا﴾

''اور اعلان کر دو کہ حق آ چکا اور باطل نابود ہو گیا، یقیناً باطل نابود ہونے والا ہی تھا'' (الاسراء: 81)

تمام بت گرا دیے گئے اور بیت اللہ کو بتوں سے پاک کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں پندرہ دن قیام فرمایا اور اس دوران مکہ کے معاملات کا انتظام کیا، اور اہلِ مکہ کو دین سمجھایا۔ اس طرح مکہ کی فتح مکمل ہوئی اور اسلام کی دعوت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ختم ہو گئی۔ چنانچہ مزاحمت کے اعتبار سے اب کچھ ہی علاقے باقی رہ گئے تھے جیسے حنین اور طائف، جن پر قابو پانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

باب نمبر 27

غزوۂ حنین

قبیلہ ٔہوازن کو جب فتح مکہ کی خبر ہوئی تو اُنہیں ڈر ہوا کہ مسلمان اب اُن پر حملہ کرنے آ ئینگے۔ چنانچہ اُنہوں نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے پہلے ہی سے تیاریاں شروع کردیں۔ مالک بن عوف النصري نے ہوازن اور ثقیف کو جمع کیا اور اُنہیں لیکر وادیٔ اوطاس پہنچا۔ مسلمانوں کو اس کی اطلاع فتحِ مکہ کے پندرہ دن بعد ملی اور وہ ہوازن سے مقابلہ کی تیاری کرنے لگے۔ ادھر مالک بن عوف اوطاس اپنی فوج کو نکال کر حنین کی چوٹیوں پر چلا گیا جس کے درمیان ایک تنگ وادی تھی۔ یہاں اُس نے اپنی فوج کو منظّم کیا اور یہ حکم دیا کہ جب مسلمان یہاں پہنچیں تو اُن پر ایک ساتھ مل کر بڑی شدّت سے حملہ کریں، جس سے اُن کے صفیں ٹوٹ کر بکھر جائیں اور وہ غلطی سے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں اور اُنہیں بری ہار کا سامنا کرنا پڑے۔ اپنے اس منصوبہ کو طے کر کے اب وہ مسلمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ فتح مکہ میں شریک دس ہزار سپاہیوں اور دو ہزار مکہ کے مسلمانوں، جو ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے تھے، کے ساتھ مدینہ سے نکل کر شام کے وقت حنین پہنچے اور اگلی صبح فجر سے قبل تک وہیں رہے۔ اس وقت جب ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا یہ فوج وادی کی طرف بڑھی اور رسول اللہ ﷺ اپنے سفید خچر پر فوج کے پچھلے حصہ میں تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو پتہ بھی نہ چلا اور دشمن نے اپنے قائد کے حکم پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں ہر جانب سے مسلمانوں پر تیروں کی بوچھار ہونے لگی اور وہ خوف زدہ ہو کر ادھر

اُدھر بھاگنے لگے۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں اُن کے دلوں پر دشمن کا رعب چھا گیا،شکست اُن پر حاوی ہوگئی اور وہ ایک دوسرے کی بھی سنے بغیر بس بھاگنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ اس بھگدڑ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے بھی بغیر رکے گزرتے گئے اور صرف عباس رضی اللہ عنہ، انصار اور مہاجر صحابہ کی ایک بہت تھوڑی سی جماعت اور اہلِ بیت ہی رہ گئے جو آپ ﷺ کو گھیرے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو پکارتے تھے کہ ''اے لوگو! کہاں جارہے ہو''۔ لیکن اُن پر موت کا خوف اور دشمن کی دہشت ایسی طاری تھی کہ وہ یہ بھی نہیں سن پارہے تھے۔ ہوازن اور ثقیف ان پر ہر طرف سے تیروں کا مینہ برسا رہے تھے، اور جہاں انہیں پاتے قتل کررہے تھے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی کہ پوری کی پوری فوج بھاگی جارہی تھی، اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے اور وہ بھی جو حال ہی میں اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اُن کو پکار رہے تھے اور وہ بغیر سنے بھاگے جارہے تھے۔ بعض وہ لوگ جو ابھی ابھی ایمان لائے تھے، اُن کے دلوں کی حقیقت بھی سامنے آرہی تھی اور وہ اس شکست سے خوش ہورہے تھے۔ کلدہ بن حنبل کہہ رہا تھا کہ ''آج یہ جادو ٹوٹ گیا ہے'' ،شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کہہ رہا تھا ''آج میں رسول اللہ ﷺ سے بدلہ لے پاؤنگا، آج میں اُنہیں قتل کردونگا''، ابوسفیان کی زبان پر یہ کلمات تھے ''ان کی یہ ہار اِن کا سمندر تک پیچھا کرتے کرتے ہی ختم ہوگی''۔ یہ کلمات اور یہ باتیں کرنے والے لوگ وہ تھے جو ابھی مکہ میں اسلام میں داخل ہوئے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ لڑنے چلے آئے تھے، لیکن اس شکست نے اُن کے دلوں کی حالت کو ظاہر کردیا تھا۔ اِن کے ساتھ ساتھ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی گھبرائے ہوئے بھاگ رہے تھے جو مخلص تھے۔ اب اس جنگ کے جیتنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ گھڑی رسول اللہ ﷺ پر بڑی سخت اور شدید آزمائش والی اور پرخطر گھڑی تھی۔ اس مشکل ترین وقت میں اللہ کے رسول ﷺ نے فیصلہ کیا کہ میدان ہی میں ٹکے رہنا ہے چنانچہ آپ اپنا سفید خچر دشمن کی طرف بڑھاتے گئے۔ آپ ﷺ کے ساتھ اس وقت آپ ﷺ کے چچا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ تھے جو آپ ﷺ کے خچر کی نکیل پکڑے ہوئے تھے کہ وہ بھاگنے نہ لگے۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بڑی پرزور آواز میں لوگوں کو پکارا: اے انصار کے

لوگوں، اے اصحابِ سمرہ۔ عباس ﷛ نے دوبارا پکارا اور آپ کی آواز سے وادی گونج اٹھی۔ بالآخر لوگوں نے اُن کی آواز پر توجہ کی اور اُنہیں رسول اللہ ﷺ اور جہاد کی یاد آئی اور ا کا ادراک کیا کہ اگر آج وہ مشرکین سے شکست کھا کر مغلوب ہو گئے اور شرک کو فتح ہوگئی تو اُن کے دین اور مسلمانوں کا کیا انجام ہوگا۔ انہوں نے عباس ﷛ کی آواز پر لبیک کہا، اب لوگ آگے بڑھنے لگے، اِن میں بہادری اور جانبازی کا جذبہ جاگ اُٹھا اور وہ رسول اللہ ﷺ کے گرد جمع ہونے لگے اور ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہ لوگ دشمن پر حملہ آور ہوئے اور جنگ میں شدّت آ گئی۔ اب اللہ کے رسول ﷺ کو قدرے اطمینان ہوا، آپ ﷺ نے اپنی مٹھی میں کنکریاں لے کر دشمن کی طرف یہ کہتے ہوئے پھنکیں کہ ''تمہارے چہرے بگڑ جائیں''۔ اب مسلمان دشمن کی طرف شہادت کے جذبہ سے بڑھ رہے تھے۔ قتال اتنی شدت سے ہو رہا تھا کہ ہوازن اور ثقیف بوکھلا اُٹھے اور اُنہیں یقین ہوگیا کہ اب اُن کی موت یقینی ہے۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ اپنے مال اور عورتوں کو مسلمانوں کیلئے بطورِ غنیمت چھوڑ کر بھاگ اُٹھے۔ اُن کی ایک بڑی تعداد قتل ہوئی اور کافی بڑی تعداد کو مسلمانوں نے پکڑ کر قید کرلیا تھا۔ مسلمانوں نے جواب دل جمعی سے لڑ رہے تھے، اُن کا پیچھا کیا یہاں تک کہ وہ وادیٔ اوطاس تک بھاگے جہاں اُن کی مزید تعداد ہلاک ہوئی اور انہیں شرمناک ہار کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کا سرغنہ مالک بن عوف بھاگ کر طائف پہنچا اور اُن کی پناہ حاصل کرلی۔ اس طرح اللہ ﷯ نے مسلمانوں کو عظیم الشان فتح سے ہمکنار فرمایا اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمہیں فتح دی ہے اور حنین کی لڑائی والے دن بھی جب کہ تمہیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا، لیکن اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی

کے تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ پھر اللہ نے اپنی تسکین اپنے نبی پر اور مومنوں پر اتاری اور اپنے وہ لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھ نہیں رہے تھے اور کافروں کو پوری سزا دی۔ ان کفار کا یہی بدلہ تھا'' (التوبہ : 26-25)

مسلمانوں کو بھاری مقدار میں مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا، جب اس کا حساب کیا گیا تو 22 ہزار اونٹ، 40 ہزار بکریاں، 4 ہزار اوقیہ چاندی، مشرکین کی ایک بڑی تعداد قتل ہو چکی تھی، قیدیوں، عورتوں اور بچوں کی تعداد 6 ہزار تک تھی، جنہیں مسلمان اپنی حفاظت میں وادیٔ جعرانہ تک لے گئے۔ مسلمانوں میں کتنے لوگ شہید ہوئے یہ تفصیل نہیں ملتی البتہ اتنا ضرور ہے کہ ایک خاصی بڑی تعداد میں جانی نقصان ہوا، سیرت کی کتابوں میں درج ہے کہ مسلمانوں کے دو قبیلے پوری طرح فنا ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اِن قیدیوں اور مالِ غنیمت کو جعرانہ میں چھوڑا اور طائف کے محاصرے کیلئے بڑھ گئے جہاں مالک بن عوف اپنی شکست کے بعد پناہ میں تھا اور اس پر اپنا گھیرا کس دیا، لیکن طائف ایک ایک قلعہ بند شہر تھا جہاں قبیلہ ثقیف آباد تھا۔ ثقیف والے بہت مال دار تھے اور محاصرے والی لڑائی اور تیر اندازی کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے بڑھتے ہوئے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کی اور کئی کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں کیلئے اُن کی قلعہ بندی کو توڑ دینا آسان نہیں تھا لہٰذا وہ دشمن کے قلعوں سے دور خیمہ زن ہوئے اور انتظار میں تھے کہ اب رسول اللہ ﷺ کیا قدم اُٹھاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ بنی دوس سے مدد طلب کی جو محاصرے کے چار دن بعد اپنی منجنیق اور دیگر سامان لے کر پہنچے۔ اب طائف پر منجنیق سے پتھر برسائے گئے اور مسلمان بکتر بند ہو کر آگے بڑھے تا کہ قلعوں کی دیواروں کو جلایا جائے۔ لیکن اہلِ طائف نے دھاتوں کے گرم اور جلتے ہوئے ٹکڑے برسائے جس نے ان کے بکتر کو جلا دیا اور مسلمان اس کے نیچے سے نکل آئے۔ دشمن نے موقع پا کر ان مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی اور ان میں سے کچھ مسلمان شہید ہو گئے۔ چنانچہ اب مسلمانوں نے طائف میں داخل ہونے کی کوششوں کو ترک کر کے ثقیف کے انگوروں کے باغات کا رخ کیا جنہیں کاٹ کر جلا دیا گیا تا کہ دشمن ہتھیار ڈالنے پر

مجبور ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ادھر ذیقعد کا حرمت والا مہینہ شروع ہوگیا پس رسول اللہ ﷺ واپس مکہ آ گئے۔ راستے میں آپ ﷺ جعرانہ کے مقام پر رُکے جہاں مالِ غنیمت اور قیدیوں کو چھوڑا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اعلان کیا تھا کہ اگر مالک بن عوف مسلمان ہو کر لوٹ آئے تو اسے اُس کے اہل اور مال واپس کر دیا جائیگا اور سو اونٹ علیحدہ دیے جائینگے۔ مالک ابن عوف کو خبر ملی تو وہ واپس آیا اور اپنے اسلام میں آنے کا اعلان کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ لوگوں کو یہ خدشہ ہوا کہ اگر رسول اللہ ﷺ اسی طرح ہوازن میں مالِ غنیمت تقسیم کرتے رہے تو اُن کا حصہ بہت تھوڑا رہ جائیگا، لہٰذا اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ مالِ غنیمت کو اُن تقسیم کر دیا جائے تا کہ ہر ایک اپنا اپنا حصہ لے لے۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان اسی موضوع پر سرگوشیاں ہونا شروع ہوگئیں جن کی خبر رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ ایک اونٹ کے پاس آ کر کھڑے ہوئے اور اُس کا ایک بال نکال کر اپنی انگلیوں میں پکڑ کر فرمایا:

((یا أیھا الناس و اللّٰہ ما لي من فیئکم و لا ھذہ الوبرۃ إلا الخمس و الخمس مردود علیکم فأدوا الخیاط و المخیط فإن الغلول یکون علی اھلہٖ عاراً و ناراً و شناراً یوم القیامۃ))

''اے لوگو! اللہ کی قسم تمہارے اس مال میں سے میرا پانچواں حصہ ہے اور وہ بھی تم میں لوٹا دیا جائیگا، جو کوئی اس مال میں سے بے ایمانی سے سوئی دھاگے برابر بھی لے گا تو قیامت کے دن یہ اُس کیلئے شرم، آگ اور رسوائی کا باعث ہوگا''

پھر یہ حکم دیا کہ جس کسی نے بھی جو کچھ اس مال میں سے لیا ہو وہ اسے واپس رکھ دے تا کہ پھر اسے برابری سے تقسیم کیا جا سکے۔ چنانچہ تمام مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، ایک حصہ آپ ﷺ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا اور باقی تمام اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ذاتی حصہ میں سے اُن لوگوں کو دیا جو اب سے پہلے آپ ﷺ کے بدترین دشمن رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ابوسفیان، ان کے بیٹے معاویہ، حارث بن حارث، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو،

حویطب بن عبد العزی، حکیم بن حزام، العلاء بن جاریہ ثقفی، عیینہ بن حصن، الاقرع بن حابس، صفوان بن امیہ اور مالک بن عوف النصری میں سے ہر ایک کو حصہ کے علاوہ سوسو اونٹ اضافی دیے۔ یہ مال اُنہیں تألیفِ قلب یعنی اُن کا دل جیتنے کیلئے دیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں کو اُن کے حصہ کے علاوہ پچاس پچاس اونٹ دئے گئے، تا کہ اُن کی تمام ضروریات پوری ہوسکیں۔ مال کی اس تقسیم میں جہاں رسول اللہ ﷺ نے نہایت فراخدلی اور مہربانی کا مظاہرہ کیا وہیں آپ ﷺ کی سیاسی بصیرت اور تدبر وفہم بھی بدرجہ اُتم عیاں تھا۔ لیکن وہاں ایسے بھی مسلمان تھے جو رسول اللہ ﷺ کے اس فہم اور کمال تدبر کی تہہ کونہیں سمجھ پائے تھے۔ مالِ غنیمت کی اس تقسیم پر بعض انصار نے ایک دوسرے سے کہا: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ اپنی قوم سے جا ملے ہیں''، اور یہ بات اُن کے دلوں پر اثر انداز ہورہی تھی۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی انہی حضرات میں سے تھے، اِنہوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچادی۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے پوچھا:

((فأين أنت من ذلک يا سعد))

''اے سعد اس معاملہ میں تمہارا کیا موقف ہے؟''

سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں بھی اپنی قوم کا ایک فرد ہوں۔ اور آپؓ نے اپنی قوم کی بات کی تائید کی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اُن سے فرمایا کہ وہ اپنی قوم یعنی انصار کو اس احاطے میں جمع کریں، جب لوگ جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو مخاطب فرمایا:

((يا معشر لأنصار ما قالة بلغتنی عنكم و جِدَةٌ وجدتموها عليّ فی أنفسكم،ألم آتكم ضُلّالاً فهداكم الله و عالة فأغنا كم الله ، و أعداء فألّف اللّٰه بين قلوبكم))

''اے قومِ انصار! جو کچھ تم نے کہا وہ مجھ تک پہنچا ہے۔ تم مجھے اپنے دلوں میں کیسا پاتے ہو؟ کیا میں تمہارے پاس اُس وقت نہیں آیا تھا جب تم گمراہ تھے تو اللہ نے تمہیں سیدھا راستہ دکھایا؟ تم عسرتوں میں تھے تو اللہ نے تمہیں غنی کر دیا اور تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو آپس میں ملا دیا؟''

لوگوں نے کہا ''بجا ہے، اللہ اور اُس کا رسول سب سے بہتر اور مہربان ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ''اے انصار جواب دو''۔ لوگوں نے پوچھا کہ ''اے اللہ کے رسول ﷺ بھلا ہم کیا جواب دیں؟ کیونکہ مہربانی اور فضیلت اللہ اور اُس کے رسول کے لیے ہی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا:

((أما واللّٰه لو شئتم لقلتم فلصدقتم ولصدقتم أتيتنا مكذباً فصدقناک، ومخذولاً فنصرناک، وطريداً فآويناک، وعائلاً فآسيناک، أوجدتم يا معشر الأنصار في أنفسكم في لعاعة من الدنيا تألفت بها قوماً ليسلموا وكلتكم إلى اسلامكم ألا ترضون يا معشر الأنصار أن يذهب الناس بالشأة والبعير و ترجعوا برسول اللّٰه إلى رحالكم ،فوالذى نفس محمد بيده لو لا الهجرة لكنت أمراً من الأنصار و لو سلک الناس شعباً و سلكت الأنصار شعباً لسلكت شعب الأنصار ،اللهم ارحم الأنصار و أبناء الأنصار و أبناء أبناء الأنصار.))

''اللہ کی قسم اگر تم چاہتے تو یوں کہتے، اور یہ سچ تھا اور اس پر یقین کیا جاتا، کہ آپؐ اُس وقت ہمارے پاس آئے تھے جب آپ کو جھٹلایا جا چکا تھا اور ہم نے آپ کی تصدیق کی؛ آپ بے یار و مددگار تھے اور ہم نے آپ کی مدد کی؛ آپ کو ٹھکرایا جا چکا تھا اور ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا؛ آپ مفلس تھے اور ہم نے آپ کی غم خواری کی، اے انصار کیا تم اس بات پر نالاں ہو کہ میں نے دنیا کی حقیر سی چیزیں لوگوں کو دے دیں تا کہ اُن لوگوں کے دل اسلام کی طرف مائل ہو جائیں، جبکہ میں نے تمہیں تمہارے اسلام کے حوالے کر دیا۔ اے قوم انصار! کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ وہ لوگ بکریاں اور گائیں لے جائیں، اور تم اللہ کے رسول ﷺ کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ؟ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں خود انصاری ہی ہوتا، اگر تمام لوگ ایک طرف چلیں اور انصار دوسری طرف، تو میں انصار کی راہ اختیار کرونگا۔ اے اللہ! انصار پر

رحم فرما اور اُن کی اولادوں پر، اور اُن کی اولادوں کی اولادوں پر رحم فرما‘‘

ادھر اللہ کے رسول ﷺ کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ انصار زار و قطار رو رہے تھے، وہ اس قدر روئے کہ آنسوؤں سے اُن کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور انہوں نے کہا ’’ہم اللہ کے رسول ﷺ سے راضی ہیں اور اُس حصہ سے جو اُس نے ہمیں دیا ہے‘‘، پھر انصار اپنے خیموں کو لوٹ گئے۔ اب رسول اللہ ﷺ اپنی فوج کے ساتھ جعرانہ سے نکلے اور عمرہ کیلئے مکہ کا رخ کیا۔ عمرہ کرنے کے بعد آپ ﷺ نے عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا والی مقرر فرمایا اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری سونپی کہ وہ اہلِ مکہ کی تربیت کریں اور اُنہیں اسلام کا فہم دیں۔ پھر آپ ﷺ اپنے انصار اور مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ واپس مدینہ تشریف لے گئے۔

باب نمبر 28

غزوۂ تبوک

رسول اللہ ﷺ کو رومیوں کے متعلق خبر ملی کہ وہ عرب کے شمالی علاقوں پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں، ایسا حملہ جو مسلمانوں کو مؤتہ کے معرکہ میں چالاکی سے پیچھے ہٹنے کی یاد کو مٹا دے۔ آپ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ وہ بذاتِ خود اِس جنگ میں شریک ہونگے اور رومیوں کے سرداروں کو وہ سبق سکھائیں گے کہ وہ مسلمانوں سے لڑنے یا اُن پر حملہ کرنے کا خیال بھی دل میں دوبارہ نہ لائیں۔ موسمِ گرما کے اختتام اور خریف کے آغاز کا وقت تھا اور گرمی اپنے جوبن پر تھی، پھر مدینہ سے شام تک کا اس شدید گرمی میں سفر نہایت دشوار گزار تھا، اس سفر میں کھانے پینے اور رسد کے ساتھ ساتھ اپنی جان پر جبر کی ضرورت تھی۔ لٰہذا یہ ضروری تھا کہ لوگوں اس چیز کا مطالعہ کرلیں اور ان سے صورتِ حال کو چھپایا نہ جائے۔ اور یہ ضروری تھا کہ انہیں واضح طور پر بتا دیا جائے کہ روم کی سرحد پر جا کر لڑنا ہے، جبکہ یہ بات اللہ کے رسول ﷺ کی عادت اور طریقہ کے خلاف تھی، جو آپ ﷺ نے سابقہ غزوات میں اپنائی تھی جن میں آپ ﷺ اپنے منصوبے اور منزل دونوں کو نہ صرف راز میں رکھتے تھے بلکہ اکثر اوقات ایسے راستے پر سفر کرتے تھے کہ دشمن اُن کی منزل کے بارے میں دھوکہ میں رہے۔ لیکن اس بار آپ ﷺ نے پہلے دن سے لوگوں کو بتا دیا کہ روم کی سرحدوں پر جا کر لڑنا مقصود ہے اور قبائل سے کہا گیا کہ وہ تیاری کریں اور جتنی بڑی فوج تیار کرنا ممکن تھا، تیار کی گئی۔ مسلمانوں میں جو لوگ صاحبِ حیثیت تھے، ان سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل

سے اُنہیں دیا ہے وہ اُس میں سے اس بڑی فوج کی تیاری کیلئے مہیا کریں۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس فوج میں شامل ہونے کیلئے ترغیب دینا شروع کی۔ اس ترغیب پر لوگوں کا ردِّعمل مختلف تھا، وہ لوگ جنہوں نے اسلام کو صدقِ دل سے قبول کیا تھا اور اُن کے سینے ہدایت ونور سے پُر تھے، اُنہوں نے تو فوراً اس پر لبیک کہا۔ اِن میں ایسے غریب لوگ بھی تھے جن کے پاس اپنے لئے ایک سواری بھی نہ تھی اور اِن میں ایسے دولت مند لوگ بھی تھے جنہوں نے برضا ورغبت اپنا مال رسول اللہ ﷺ کے سامنے لا کر ڈال دیا، تاکہ اللہ کی راہ میں کام آئے۔ یہ لوگ اللہ کے راہ میں شہادت کے شوق میں اپنے آپ کو پیش کر رہے تھے۔ اِن کے برعکس وہ لوگ جو لالچ یا خوف کے سبب اسلام میں بادلِ ناخواستہ داخل ہوئے تھے یعنی مالِ غنیمت کا لالچ یا مسلمانوں کی قوت کا خوف، تو ایسے لوگ اب بہانے تراش رہے تھے اور اُن کے قدم نہیں اُٹھ رہے تھے۔ یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے کہ اتنی دور اس شدید جلتی تپتی گرمی میں لے جا کر لڑایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ منافق تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اس گرمی میں نہ نکلو، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾

''اور اُنہوں نے کہا کہ اس گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دیجئے کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ سخت اور گرم ہے، کاش کہ وہ سمجھتے ہوتے۔ پس اُنہیں چاہئے کہ بہت ہی کم ہنسیں اور بہت زیادہ روئیں، اس کے بدلے میں جو یہ کرتے ہیں'' (التوبہ: 81)

اِن ہی بہانہ بنانے والوں میں سے ایک بنی سلمہ قبیلے کے جد بن قیس سے اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا کہ ''اے جد! کیا تم بنی اصفر لڑنا چاہو گے؟'' تو اُس نے جواب دیا، ''اے اللہ کے رسول ﷺ، آپ مجھے رہنے دیجئے، امتحان میں نہ ڈالئے میرے سارے لوگ جانتے ہیں کہ میں عورتوں کے معاملے میں کچا ہوں، وہاں بنی اصفر کی رومی عورتیں دیکھوں گا تو خود کو روک نہ پاؤں گا''۔ آپ ﷺ نے اُس سے منہ پھیر لیا۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّیْ وَلَا تَفْتِنِّیْ ؕ اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ

لَمُحِيۡطَةٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ۝

''ان میں سے کوئی تو کہتا ہے مجھے اجازت دیجئے، مجھے فتنے میں نہ ڈالئے، آگاہ رہو وہ تو فتنے میں پڑ چکے ہیں اور یقیناً دوزخ کافروں کو گھیر لینے والی ہے'' (التوبہ: 49)

اِن منافقوں نے اس بات پر ہی اکتفاء نہیں کیا کہ خود لڑائی میں نہ جانے کے بہانے بنائیں بلکہ یہ دوسروں کو بھی ترغیب دیتے تھے کہ جنگ کے لیے نہ نکلو۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ اِن منافقین سے سختی سے نمٹ کر انہیں سبق سکھایا جائے۔ چنانچہ جب یہ خبر ملی کہ منافقین سویلم نام کے ایک یہودی کے گھر جمع ہو رہے ہیں تا کہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر اُنہیں لڑائی پر جانے سے روکا جائے۔ تو آپ ﷺ نے طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو کچھ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ وہاں بھیجا، جنہوں نے اس گھر کو جلا دیا اور وہاں جمع لوگوں کو اپنی جان بچا کر بھاگ جانا پڑا، ان میں ایک منافق گھر کے پچھلے دروازے سے بھاگتا ہوا اپنا پیر تڑا بیٹھا۔ چنانچہ اس عمل سے باقی منافقین کو سبق ملا کہ اس قسم کی حرکتوں سے باز آئیں۔ جس شدّت اور مضبوطی سے رسول اللہ ﷺ نے یہ فوج جمع کی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ایک بہت بڑی تعداد اکٹھی ہوگئی جس کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس فوج کو ''جیش العسر ۃ'' کہا گیا کیونکہ اس فوج کا مقابلہ روم کی بہت بڑی فوج سے تھا اور اسے مدینہ سے بہت دور جا کر سخت گرمی میں لڑنا تھا اور اس فوج کی تیاری کے لیے بڑی مقدار میں مال درکار تھا۔ فوج منظّم انداز میں مدینہ سے باہر تیار کھڑی تھی جبکہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں جلدی جلدی وہاں کے معاملات نبٹا رہے تھے جبکہ آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فوج کی نماز کی امامت کی۔ آپ ﷺ نے مدینہ پر محمد بن مسلمہ ؓ کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور علی رضی اللہ عنہ کو اپنے اہل وعیال کی ذمہ داری سونپی اور حکم دیا کے وہ اُنہی کے ساتھ رہیں۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ نے اپنی غیر موجودگی کے دوران کاموں کیلئے موزوں احکام دیئے اور فوج کی طرف لوٹ آئے اور اس کی قیادت سنبھال لی۔ پھر آپ نے آگے بڑھنے کا حکم دیا اور فوج نہایت وقار کے ساتھ آگے بڑھی جسے تمام اہلِ مدینہ نے دیکھا، عورتیں گھروں کی چھت پر چڑھ کر صحراء میں فوج کے شام کی جانب

روانہ ہونے کا شاندار نظارا دیکھ رہی تھیں۔ فوج اللہ تعالیٰ کے راستہ میں بھوک، پیاس اور گرمی سے بے خوف شام کی طرف رواں تھی۔ چنانچہ مسلم افواج کا پر ہیبت منظر دیکھ کر کہ جس میں دس ہزار گھوڑے آگے آگے تھے، اُن لوگوں میں بھی ہمت آئی جنہوں نے فوج میں شامل ہونے میں سستی کی تھی اور وہ بھی مسلمان فوج میں شامل ہوگئے اور یہ فوج تبوک کی طرف بڑھنے لگی جہاں رومیوں کی فوج خیمہ زن تھی اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ رومیوں کو جب مسلم فوج کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں آرہے ہیں، تو اُنہیں مؤتہ کی جنگ یاد آگئی جب مسلمانوں نے تعداد اور قوت کی کمی کے باوجود نہایت بہادری اور چالاکی سے مقابلہ کیا تھا اور اس بار تو خود رسول اللہ ﷺ مسلم فوج کی قیادت فرما رہے تھے۔ اس سے دشمن اتنا خوف زدہ ہوا کہ اُس نے تبوک سے پیچھے ہٹ کر شام کے اندر واقع اپنے قلعوں میں محصور ہونے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔ اورانہوں نے شام کی حدود پر اپنی تمام چوکیاں خالی کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبر ملی کہ عیسائی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے ہیں، تو آپ ﷺ آگے بڑھتے رہے اور تبوک پہنچ کر اُس پر قبضہ کر لیا۔ آپ ﷺ نے اِن حالات میں دشمن کا تعاقب کرنا ضروری نہیں سمجھا اور وہیں تبوک میں خیمے نصب کر لئے گئے۔ تقریباً ایک مہینہ تک وہیں قیام رہا جس دوران وہاں کے اُن قبائل سے نمٹا گیا جنہوں نے مزاحمت کی۔ اپنے قیام کے دوران آپ ﷺ نے رومی سلطنت کے تابع فرمان قبائل اور شہروں کے سرداروں کو مراسلے بھیجے، اِن میں ایلہ کے سردار یوحنہ بن رؤبہ، جرباء اور اذرح کے سردار شامل تھے۔ اِن کو لکھا گیا تھا کہ یا تو وہ اطاعت قبول کریں یا پھر لڑائی کیلئے تیار ہو جائیں، ان سب نے اطاعت قبول کی اور اسلامی حکومت کی تابعداری میں آگئے اور صلح کر کے جزیہ دینا قبول کر لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اسلامی فوج کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے۔ اس دوران مدینہ میں منافقین نے رسول اللہ ﷺ کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر لوگوں میں اپنا زہر پھیلانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی، اور مسلمانوں کو تقسیم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ منافقین نے مدینہ سے قریب ایک گھنٹہ کی مسافت کے فاصلہ پر ذی اوان کے مقام پر ایک مسجد بنا لی تھی جہاں سے وہ اپنی کاروائیاں کرتے تھے، اور اللہ کے کلام کی تاویلیں کر کے لوگوں میں

اختلاف ڈالنے لگے تھے۔ ان لوگوں نے تبوک کیلئے روانگی سے قبل رسول اللہ ﷺ سے گزارش کی تھی کہ وہ اُس مسجد میں نماز پڑھیں لیکن آپ ﷺ نے انہیں اپنی واپسی کا انتظار کرنے کا کہہ دیا تھا۔ جب واپسی پر آپ ﷺ کو منافقوں کی حرکتوں کی خبر ملی اور مسجد بنانے کی حقیقت وحی کے ذریعہ معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے مسجد جلا دینے کا حکم دیا اور منافقین پر اب سختی شروع کردی، جس سے وہ خوفزدہ ہو گئے اور ان کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے۔

غزوۂ تبوک کے ذریعے سارے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا کلمہ بلند ہو چکا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے اقتدار کو کوئی چیلنج کرنے والا نہ تھا۔ عرب قبائل کے وفود رسول اللہ ﷺ کے پاس آ رہے تھے اور اپنی اطاعت اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔

اسلامی ریاست کا جزیرہ نمائے عرب پر غلبہ

غزوہ تبوک کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو خارجہ پالیسی کے لحاظ سے ریاست کی سرحدوں کو محفوظ کیا اور دوسری طرف دشمنوں کے دلوں میں مسلمانوں کا دبدبہ قائم کر دیا۔ ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے اپنے بعد مسلمانوں کیلئے اسلام کی دعوت کو جزیرہ نمائے عرب کے باہر پھیلانے کی حکمتِ عملی بھی وضع کر دی۔ غزوہ تبوک کے فوراً بعد ہی جنوبی علاقے یعنی یمن، حضرموت اور عُمان نے بھی اپنے اسلام قبول کرنے کا اور اسلامی ریاست کے زیر اقتدار آنے کا اعلان کر دیا۔ ہجری کے نوویں سال یکے بعد دیگرے مختلف قبیلے آتے گئے اور اپنی اطاعت اور قبولِ اسلام کا اعلان کرتے رہے۔ اب مکمل جزیرہ نما عرب ریاستِ اسلام کے تابع ہو چکا تھا اور روم کی طرف سے بھی ابھی کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ البتہ کچھ مشرکین رہ گئے تھے جنہیں اپنے بتوں کی عبادت کرنے کی چھوٹ تھی اور وہ کعبۃ اللہ میں اپنے طریقہ سے حج بھی کر سکتے تھے کیونکہ معاہدے یہ تھا کہ کعبہ سب کیلئے کھلا ہوگا اور حرام مہینوں میں کسی کو جنگ کا خوف نہیں ہوگا۔ لیکن جب سارا عرب اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اسلامی ریاستِ کے زیر اقتدار آ گیا اور صرف یہ مشرکین بچے جو غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے، تو کیا ایسے میں اِن مشرکین کو اِسی حال پر چھوڑ دیا جاتا اور کعبۃ اللہ میں دو باہم مخالف اور متضاد دین کے پیروا اپنی اپنی عبادات کرتے؟ ایک طرف تو ایسا دین جس میں بُت توڑ دیئے جاتے ہیں اور دوسری طرف ایسا مذہب جس میں اُنہی

بتوں کی بندگی کی جاتی ہے۔ چنانچہ اب یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ ان مشرکین کی سارے عرب میں سرکوبی کی جائے اور اُنہیں کعبۃ اللہ میں داخلہ سے روک دیا جائے۔ اس وقت، یعنی جنگِ تبوک کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ نازل فرمائی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ حج کیلئے ایک جماعت کی قیادت کرتے ہوئے روانہ ہو چکے تھے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ حج کی اُس جماعت سے جا ملیں اور اُنہیں سورۂ توبہ کی تلاوت کر کے سنائیں۔ جب لوگ منیٰ میں جمع ہوئے تو علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تھے اور علی نے لوگوں کو یہ آیات پڑھ کر سنائیں:

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ...﴾

''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اُن تمام مشرکین کے بارے میں جن سے آپ نے عہد و پیماں کیا تھا، بیزاری اور جنگ کی تیاری ہے...'' (التوبہ:1)

سے لے کر یہاں تک:

﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾

''اور تم تمام مشرکوں سے جہاد کرو جیسا کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں۔ اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے'' (التوبہ : 36)

علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیات پڑھ کر کچھ دیر توقف کیا، پھر پکار کر کہا: ''اے لوگو! کوئی کافر جنت میں داخل نہیں ہوگا، اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کریگا، نہ ہی کوئی بیت اللہ کا عریانی کی حالت میں طواف کریگا، جس کسی کا اللہ کے رسول ﷺ سے معاہدہ ہے، وہ ایک معین مدّت تک ہے''۔ علی نے یہ چار احکام اعلان کیے اور پھر لوگوں کو چار ماہ کا وقت دیا جس کے دوران اُنہیں اپنے گھروں کو لوٹ جانا تھا۔ اس کے بعد کسی مشرک نے حج نہیں کیا اور نہ ہی عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کیا گیا۔ اس حکم کے نزول کے بعد عرب کے پورے علاقہ پر اب صرف اللہ ہی کا کلمہ بلند تھا۔ تمام علاقوں پر اب اسلامی ریاست ہی کا اقتدار تھا جس کی بنیاد اسلامی عقیدہ پر تھی۔ سورۂ توبہ کے نازل ہونے

اور جزیرہ نما عرب سے مشرکین کا قلعہ قمع کر دینے کے بعد اسلامی ریاست کی تشکیل مکمل ہو گئی اور ہر فکر جو اسلام کے علاوہ تھی اُس کا خاتمہ کر دیا گیا اور ریاست کے وجود کے علاوہ ہر اکائی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب اسلام کی یہ ریاست اسلام کے پیغام کو سارے عالم میں پہنچانے کیلئے پوری طرح تیار تھی۔

باب نمبر 30

اسلامی ریاست کا ڈھانچہ

جب اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ میں قدم رکھا، اس وقت سے ہی آپ ﷺ مسلمانوں پر حکمرانی کی ذمہ داری سرانجام دے رہے تھے، ان کے امور کی دیکھ بھال اور معاملات کا اہتمام کررہے تھے اور آپ ﷺ نے اسلامی معاشرہ تشکیل دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے معاہدہ کیا پھر بنی ضمرہ اور بنی مدلج سے پھر قریشِ مکہ سے، اس کے بعد ایلہ، جرباء اور اذرح سے معاہدات طے کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں سے یہ وعدہ کیا گیا کہ حج کیلئے کسی کو روکا نہیں جائیگا اور نہ ہی حرام مہینوں کی حرمت ختم ہوگی۔ آپ ﷺ نے حمزہ بن عبدالمطلب، عبیدہ بن حارث اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کی قیادت میں قریش سے مقابلہ کیلئے فوجی مہمات بھیجیں۔ پھر رومیوں سے مقابلہ کیلئے زید بن حارث، جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کی قیادت میں فوجی مہمات بھیجیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو قبیلۂ دومۃ الجندل سے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ علی بن ابی طالب اور پھر بشیر بن سعد رضی اللہ عنہم کو فدک کی مہم پر بھیجا، ابوسلمہ بن عبدالاسد کو نجد میں قطنا کی مہم کی ذمہ داری سونپی، زید بن حارث رضی اللہ عنہ کو پہلے بنی سلیم پھر جذام، وادی قریٰ میں بنی فزارہ اور پھر مدین بھیجا، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بنی عذراء کے علاقے ذات سلاسل بھیجا، اس کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں کو مختلف مہمات پر مختلف علاقوں کی طرف روانہ کیا اور بذاتِ خود بھی کئی غزوات میں لشکر کی قیادت کی اور انتہائی خونریز لڑائیاں لڑیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ریاست کے مختلف حصوں پر والی

اور شہروں پر عامل بطورِ حکمران مقرر کیے۔ مثلاً فتح مکہ کے بعد وہاں عتاب بن اسیدؓ کو والی مقرر کیا، باذان بن ساسان نے جب اسلام قبول کیا تو انہیں یمن کا والی مقرر کیا، معاذ بن جبل الخزرجی رضی اللہ عنہ کو جند کا والی بنایا، خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو صنعاء کا، زیاد بن لبید ثعلبہ الانصاری رضی اللہ عنہ کو حضرموت کا عامل متعین کیا۔ ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کو زبید پر اور پھر عدن پر مقرر کیا، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو عُمان پر، المہاجر ابن ابی امیہ رضی اللہ عنہ کو صنعاء پر عامل مقرر فرمایا، عدي بن حاتم الطائی رضی اللہ عنہ کو طی ء کا عامل بنایا، علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین کا والی بنایا اور مدینہ پر رسول اللہ ﷺ نے ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو عامل متعین کیا۔ رسول اللہ والی بنانے کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب فرماتے جو اس کام کو احسن طریقے سے سرانجام دیں اور لوگوں کے دلوں کو ایمان سے لبریز کر دیں۔ آپ ﷺ اُن لوگوں سے یہ پوچھتے تھے کہ وہ کس انداز سے حکمرانی کریں گے؟ جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنے لگے تو آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا کہ وہ کس چیز سے حکمرانی کرینگے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب سے، پھر پوچھا کہ اگر اللہ کی کتاب میں اس بارے میں کچھ نہ ملے تو؟ جواب دیا: اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے، پھر پوچھا کہ اگر اُس میں بھی نہ ملے؟ تو ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر میں اپنی سمجھ کے مطابق اجتہاد کرونگا۔ اس جواب سے رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے اور فرمایا: ''الحمد للہ کہ اُس نے اپنے رسول کے والی کو وہ فہم دیا جس سے اللہ اور اُس کا رسول راضی ہے'' اسی طرح مروی ہے کہ جب آپ ﷺ نے ابان بن سعید رضی اللہ عنہ کو بحرین کا والی بنایا تو اُنہیں نصیحت فرمائی کہ وہ عبد قیس کے لوگوں کا خیال رکھیں اور اُن کے ساتھ احترام و اکرام سے پیش آئیں۔

اللہ کے رسول ﷺ لوگوں میں سے مثالی شخص کو ولایت کی ذمہ داری سونپتے اور اِن والیوں کو نصیحت کرتے کہ جو لوگ اسلام میں داخل ہوں اُنہیں دین سکھائیں اور اُن سے صدقات وصول کریں۔ اکثر اوقات آپ ﷺ کا یہ معمول رہا کہ والی کو ہی لوگوں سے اموال وصول کرنے کی ذمہ داری سونپا کرتے تھے۔ آپ ﷺ والیوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ لوگوں کو اچھی باتیں

بتائیں، قرآن کی تعلیم دیں اور دین سمجھائیں۔ اُن کے ساتھ حق کے معاملہ میں نرمی برتیں اور اگر کوئی ظلم کرے تو اس کے ساتھ سختی کریں۔ لوگوں کے درمیان اگر کوئی معاملہ کھڑا ہو تو لوگوں کو اس معاملے کے لیے قبیلوں اور برادریوں کو بلانے سے روکیں اور صرف اللہ کے احکامات سے اُس کا فیصلہ کریں۔ اُن کے اموال میں سے پانچواں حصہ اور وہ صدقات کہ جن کا ادا کرنا مسلمانوں پر واجب ہے، وصول کریں۔ اور جو یہودی یا عیسائی صدقِ دل سے دین میں داخل ہو جائے اور اسلام کو اپنے دین کے طور پر اختیار کر لے وہ اب مومنوں میں شمار ہوگا اور اُس کے حقوق اور ذمہ داریاں مسلمانوں جیسی ہی ہوں گی۔ اسی طرح والیوں کو ہدایت کرتے کہ کسی یہودی یا عیسائی کو اس کے دین کے سبب ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ جیسا کہ جب آپ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا والی مقرر کیا تو فرمایا:

((إنک تقدم على قوم أهل كتاب فليكن أول ما تدعوهم إليه عبادة الله عزّ و جلّ فإذا عرفوا الله تعالى فأخبرهم أن الله قد فرض عليهم زكاة تؤخذ من أغنيائهم فترد على فقرائهم فإذا أطاعوا فخذ منهم و توقّ كرائم أموالهم))

”تمہیں اہلِ کتاب پر مقرر کیا جا رہا ہے، سو سب سے پہلے اُنہیں اللہ عزوجل کی عبادت کی طرف بلاؤ، جب وہ اللہ کو جان لیں تو اُنہیں بتاؤ کہ اللہ نے اُن پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو اُن کے امیروں سے وصول کی جائیگی اور اُن کے غرباء میں بانٹی جائیگی، اگر وہ یہ مان لیں تو اُن سے (زکوٰۃ) اکٹھی کرو اور اُن کے مال کے بہتر حصہ کو چھوڑ دو اور مظلوم کی بد دعا سے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی آڑ نہیں“

بسا اوقات آپ ﷺ کسی خاص شخص کو صرف اموال کا حساب کرنے اور اسے وصول کرنے کیلئے بھیجتے تھے۔ آپ ﷺ ہر سال عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو خیبر کے یہود کے پاس بھیجتے جو اُن کے پھلوں اور کاشت کی پیداوار کا حساب کرتے اور مقررہ حصہ وصول کرتے تھے۔ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ

سے شکایت کی کہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ حساب میں بہت سخت ہیں، پھر اُنہیں رشوت دینے کی بھی کوشش کی، چنانچہ انہوں نے ایک دن اپنی عورتوں کے کچھ زیورات عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے سامنے لاکر رکھ دیئے اور کہا کہ یہ آپ کیلئے ہیں اور درخواست کی کہ وہ پیداوار کا حساب آسان کریں۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اے اہلِ یہود! اللہ کی مخلوقات میں تم لوگ مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہو لیکن میں اس چیز کو تمہارے معاملے پر اثر انداز نہیں ہونے دونگا، اور یہ جو تم نے رشوت کی پیشکش کی ہے تو یہ حرام ہے اور ہم یہ نہیں کھاتے۔'' اس پر اُن لوگوں نے جواب دیا: ''آپ کے اِس انصاف سے زمین و آسمان قائم ہیں''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقرر کئے ہوئے والیوں اور عاملوں کے احوال سے باخبر رہتے تھے اور اِن کے متعلق جو خبریں آتی تھیں اُنہیں بغور سنتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے عامل علاء بن حضرمی کو برطرف کر دیا کیونکہ اُن کے خلاف عبد قیس کے وفد نے شکایت کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عاملوں سے مکمل حساب لیا کرتے تھے اور ان کے جمع کردہ محاصل اور اوران کے خرچ کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو صدقات وصول کرنے کی ذمہ داری دی، جب وہ واپس آیا اور آپ نے اُس سے حساب طلب کیا تو اُس نے کہا: یہ مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور یہ مجھے ہدیہ کے طور پر ملا ہے۔ تو اِس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ما بال الرجل استعمله على عمل بما و لانا الله فيقول هذا لكم و هذا أهدي إلي ،أفلا قعد في بيت ابيه و امه فننظر أيهدى إليه أم لا؟))

''اس شخص کو کیا ہوا ہے کہ جسے ہم نے ایسے کام پر رکھا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سونپا تھا، وہ شخص آ کر کہتا ہے یہ آپ کیلئے ہے اور یہ مجھے تحفتاً ملا ہے۔ تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہی بیٹھے پھر ہم دیکھیں گے کہ اسے ہدیہ ملتا ہے یا نہیں''

پھر فرمایا:

((من أستعملناه على عمل فرزقناه رزقا فما أخذ بعد ذلک فهو غلول.))

''جس کسی کو ہم نے کسی کام پر رکھا اور اسے کچھ اجرت دی، پھر اس نے اس کے بعد جو کچھ (اضافی)

لیا وہ غبن ہے“

اسی طرح جب ایک بار یمن کی عوام نے معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی کہ وہ نمازیں لمبی پڑھاتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی سرزنش کی اور فرمایا:

((من أم في النّاس فليخفف))

”جو لوگوں کی امامت کرے، سو اُسے چاہیئے کہ وہ نماز سہولت سے پڑھائے“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قاضیوں کا بھی تقرر فرمایا، چنانچہ آپ نے علی رضی اللہ عنہ کو یمن پر قاضی مقرر فرمایا اور اسی طرح عبداللہ بن نوفل کو مدینہ پر قاضی مقرر فرمایا۔ اسی طرح آپ نے ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا اور اُن سے پوچھا تھا:

((بِمَا تحكمان، فقالا: إنْ لَّمْ نجد الحكم في الكتاب و لا في السنة،قسنا الاَمر بالامر ،فما كان أقرب إلى الحق عملنا به))

”تم کس چیز سے فیصلے کرو گے، تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اگر قرآن اور سنت میں حکم نہ ملا تو ہم ایک معاملے کو دوسرے معاملے پر قیاس کرینگے اور جو حق کے قریب تر ہوگا، اُس پر عمل کرینگے“

چنانچہ آپ نے اُن کے طریقے کو منظور کیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قاضیوں کا تقرر بھی فرماتے اور اُن کے طریقہ عمل کی جانچ بھی فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض قاضیوں کے تعین اور اُن کے حالات سے باخبر رہنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ آپ ریاستی مظالم پر بھی نظر رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عوام کے معاملات کی نگہداشت فرماتے تھے چنانچہ آپ نے ہر نوعیت کے شعبہ کے لیے ایک شخص کو بحیثیت افسر اُس کام پر نگران مقرر کیا، جس کی حیثیت اس شعبے کے ڈائریکٹر کی تھی۔ مثلاً معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسي رضی اللہ عنہ کو اپنی مہر اور مالِ غنیمت پر ذمہ دار بنایا، حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو علاقہ حجاز میں پھلوں کی پیداوار کے حساب کی ذمہ داری دی، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ صدقات کے اموال کا حساب رکھتے تھے، مغیرہ بن شعبہ قرضوں اور دیگر معاملات کا حساب رکھتے تھے، علی بن طالب رضی اللہ عنہ کے ذمہ صلح اور دیگر معاہدات کے لکھنے کا کام تھا۔ شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ

بادشاہوں سے خط وکتابت پر ذمہ دار تھے۔ اس طرح جس قدر بھی مفادِ عامہ کے کام ہوتے اُن کا ذمہ دار ایک متعین شخص کو بنایا جاتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کثرت سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ اہلِ رائے اور عقل وفہم رکھنے والے لوگوں سے مشورہ کرنے اور ان لوگوں سے رائے لینے سے ہرگز گریز نہ فرماتے جن میں آپ مضبوطی، ایمان اور اسلام کے لیے جانثاری دیکھتے۔ ان اہلِ مشورہ میں سے سات مہاجرین میں سے اور سات انصاری تھے، جن میں حمزہ، ابوبکر، جعفر، عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، سلیمان، عمار، ابوذر، حذیفہ، مقداد اور بلال رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ ان کے علاوہ دیگر افراد سے بھی مشورہ کیا کرتے تھے لیکن چونکہ اِن ہی افراد سے اکثر رائے لیا کرتے تھے چنانچہ یہ آپ ﷺ کی مجلسِ شوریٰ کی مانند تھے۔

آپ ﷺ نے زمین کی دو اقسام، پھلوں کی پیداوار اور مویشوں پر، خواہ وہ مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے، ٹیکس مقرر فرمایا، یہ زکوٰۃ، عُشر، خراج، فئے اور جزیہ کی مدوں میں تھا۔ انفال اور مالِ غنیمت بیت المال میں جاتی تھی، زکوٰۃ کا مال صرف اُن آٹھ مدوں پر ہی خرچ ہوتا تھا جو قرآن میں متعین کر دی گئیں ہیں۔ ان کے علاوہ زکوٰۃ اور کسی مد میں خرچ نہیں کی جاتی تھی اور نہ ہی حکومت کے مصارف اس سے پورے کئے جاتے تھے۔ حکومت چلانے اور لشکر تیار کرنے کیلئے فئے، جزیہ، خراج اور مالِ غنیمت کا پیسہ کافی ہوا کرتا تھا اور ریاست کو کبھی بھی ضروریات پوری کرنے کے لیے اضافی ٹیکس نہیں لگانا پڑا۔

اس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے بذاتِ خود اسلامی ریاست کا ڈھانچہ کھڑا کیا اور اپنی زندگی ہی میں اس کی تکمیل فرما دی، آپ ﷺ ریاست کے سربراہ تھے، آپ ﷺ کے معاونین تھے، والیان، قاضی، فوج، مختلف کاموں کیلئے مخصوص افسر اور انتظامی اور دیگر امور میں رائے ومشورے کیلئے مجلسِ شوریٰ تھی۔ ریاست کا یہ ڈھانچہ اپنی شکل واختیارات کے اعتبار سے واجب الِا تباع ہے۔ اور اس ڈھانچے کا ثبوت اجمالی طور پر تواتر سے منقول ہے۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ

تشریف لانے کے فوراً بعد سے اپنے وصال تک اس ریاست کے سربراہ رہے۔ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے معاونین یعنی وزراء رہے اور آپ ﷺ کے بعد تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اجماع رہا کہ آپ ﷺ کے بعد ریاست کا ایک سربراہ ہو جو بحیثیت سربراہِ ریاست رسول اللہ ﷺ کا وارث ہو، نہ کہ بحیثیتِ نبی جانشین ہو، کیونکہ نبوت و رسالت آپ ﷺ پر ختم ہوگئی ہے۔ اس طرح آپ ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں حکومت کا ایک مکمل نظام تشکیل دیا اور حکمرانی کی ایک واضح شکل اور ریاست کا واضح اور معروف ڈھانچہ اپنے پیچھے اتباع کیلئے چھوڑا۔

باب نمبر 31

اسلامی ریاست کی طرف یہودیوں کا طرز عمل

رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہودی کوئی خاص چیلنج کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، بلکہ اسلامی ریاست کو خطرہ دراصل عمومی طور پر عربوں سے اور خاص طور پر قریش سے تھا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے یہود سے صرف ایسے معاہدے کئے تھے جن کی رو سے یہودی ایک طرف تو اسلامی ریاست کے زیر اطاعت ہوں اور دوسری طرف اُنہیں اِن معاہدوں کی ذریعے اسلامی ریاست کی کسی بھی حریف قوت کی طرف جھکنے سے دور رکھا جائے۔ لیکن یہودی اسلامی ریاست کی طاقت کو روز افزوں بڑھتا اور مسلمانوں کے اقتدار کو وسیع ہوتا دیکھتے تھے اور مسلمانوں سے تکرار اور بدکلامی کرتے تھے۔ جب بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو یہودیوں کی بدکلامی شدید تر ہوگئی اور وہ اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ جب ان سازشوں کی خبریں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں تک پہنچی تو پھر مسلمانوں اور یہود کے درمیان نفرت اور غصہ کی فضاء پہلے سے زیادہ گہری ہوگئی اور اب دونوں فریق ایک دوسرے کی تاک میں رہنے لگے۔ یہودیوں کی جسارتوں میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، جیسا کہ ابوعفک جس کا تعلق بنی عمرو بن عوف قبیلے سے تھا، یہ شخص رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اشعار لکھتا تھا جن میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف طعن وتشنیع کی جاتی تھی، اسماء بنت مروان بھی اسلام کی برائیاں کرتی اور رسول اللہ ﷺ کی ذات کو تضحیک کا

نشانہ بناتی اوراسی طرح کعب بن اشرف مسلمان عورتوں کوراہ چلتے تنگ کرتا اوراُن پرفقرے کستا اور مکہ جا کر وہاں توہین آمیز اشعار پڑھتا اوراہلِ مکہ کومسلمانوں کے خلاف بھڑکا تا تھا۔ مسلمان اب مزید صبر نہیں کر سکتے تھے اوراُنہوں نے ایسے لوگوں کواس لئے قتل تک کیا تا کہ یہودیوں کوسبق ملے اوروہ ایسی حرکتوں سے باز آئیں۔ اس سے یہودی ڈرتو گئے لیکن اپنی حرکتوں سے پھربھی باز نہیں آئے اوراُن کی حرکتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں خبردار کیا کہ وہ ایذا رسانی سے باز آجائیں یا پھرقریش جیسے انجام کیلئے تیار رہیں۔ یہودیوں نے اس تنبیہ سے کوئی خاص اثر نہیں لیا بلکہ بڑے تکبر سے جواب دیا کہ: ''اے محمد (ﷺ) دھوکہ میں نہ رہنا،تم نے اُن لوگوں سے مقابلہ کیا تھا جوفنِ حرب سے نابلد تھے، اگرہم تم سے بھڑ گئے توتم جان جاؤ گے کہ ہم ہی حقیقی مرد ہیں''۔ اب مسلمانوں کے پاس اُن سے لڑنے کے سوا اورکوئی راستہ نہ بچا تھا چنانچہ مسلمان بنوقینقاع پہنچے اوراُن کا محاصرہ کرلیا جومسلسل پندرہ دن جاری رہا، اِس دوران نہ وہ باہر آسکتے تھے اورنہ ہی کوئی غذا اُن تک پہنچ سکتی تھی۔ آخر یہ لوگ مجبور ہوگئے اورخودکوآپ ﷺ کے حوالے کردیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اِنہیں مدینہ سے جلاوطن کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنی قینقاع مدینہ سے نکل کروادی قریٰ پہنچے جہاں وہ کچھ عرصہ تک رکے اور پھرشمال کی جانب آگے بڑھتے بڑھتے شام کی سرحد پرواقع اذرعات کے مقام پہنچ گئے۔ اس واقعہ سے یہود کی حیثیت کوزک پہنچی اورجو باقی بچ گئے وہ بدلے کےخوف سے واضح طور پرمسلمانوں کے تابع ہوگئے، البتہ یہ مسلمانوں کی قوت اورگرفت سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے تھا۔ اور جیسے ہی اُنہیں موقع ملا، انہوں نے پھروہی حرکتیں شروع کردیں۔ چنانچہ جنگِ احد میں جب مسلمانوں کوشکست کا سامنا ہوا، تو یہودیوں کی نفرت پھردکھائی دینے لگی، حتیٰ کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کوقتل کرنے کی سازش کی۔ آپ ﷺ نے اُن کے ارادوں کومحسوس کیا چنانچہ آپ ﷺ نے مناسب سمجھا کہ معاملہ کی تہہ تک پہنچا جائے۔ ایک دن آپ ﷺ دس جلیل القدر صحابہ جن میں ابوبکر، عمراورعلی رضی اللہ عنہم شامل تھے، کے ہمراہ بنونضیر کے پاس گئے۔ یہودیوں نے بظاہر بڑی خوش اخلاقی اورتپاک سے آپ ﷺ کا خیر مقدم کیا لیکن جلد ہی اللہ

کے رسول ﷺ نے محسوس کرلیا کہ یہودی کسی سازش میں مشغول ہیں۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص اُٹھ کر باہر نکلا جبکہ دوسرا اُس جانب سے داخل ہوا جس دیوار کے ساتھ آپ ﷺ تشریف فرما تھے، تو آپ ﷺ کے شک میں اور اضافہ ہوا کہ جو خبریں یہود کی سازشوں کے بارے میں آ رہی تھیں وہ درست ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ یہودیوں کی طرف سے ممکنہ دغابازی کے سبب وہاں سے ایسے اُٹھ کر چلے گئے جیسا کہ ابھی واپس آ جائیں گے، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہیں رہے اور یہودیوں نے سوچا کہ شاید آپ کو کوئی کام پڑ گیا ہو، لیکن جلد ہی اُنہیں شبہہ ہوا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ نے اُن کی نیت نہ بھانپ لی ہو لہٰذا اب وہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہایت خوش اخلاقی سے اُنہیں خوش رکھنے کی غرض سے باتیں کرنے لگے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کی غرض سے باہر آنے کا فیصلہ کیا اور انہیں رسول اللہ ﷺ مسجد میں نظر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں یہودیوں کی دغابازی کے متعلق بتایا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے محمد بن مسلمہ کو بھیج کر یہودیوں کو یہ حکم دے دیا کہ وہ علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں، اس کام کیلئے اُن کو دس دن کی مہلت دی گئی اور اس مہلت کے بعد اُن کا محاصرہ کرلیا گیا اور اُنہیں زبردستی وہاں سے نکال دیا گیا۔ اِن میں کچھ لوگ خیبر جا کر وہیں رُک گئے اور بعض آگے بڑھ کر شام میں اذرعات کے مقام چلے گئے۔ اس طرح مدینہ اُن کے شر سے پاک ہوا، اب یہودیوں میں سے صرف بنو قریظہ کا قبیلہ مدینہ میں باقی رہ گیا کیونکہ اُنہوں نے اپنے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی تھی لہٰذا اُن سے اللہ کے رسول ﷺ نے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ بنی قینقاع اور بنی نضیر کا انجام دیکھ کر بنی قریظہ کے یہود اب مسلمانوں سے بڑی دوستی سے پیش آنے لگے، اگرچہ یہ بھی مسلمانوں کے خوف کے سبب ایک وقتی ضرورت کے طور پر تھا، چنانچہ جیسے ہی بنی قریظہ نے دیکھا کہ تمام احزاب مسلمانوں سے نمٹنے کیلئے آ گئے ہیں تو اُنہوں حیی بن اخطب کی بات مان لی اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی سازش میں شامل ہو کر مسلمانوں کے ساتھ اپنے معاہدے کو توڑ دیا اور ان کی خباثت اور غداری ظاہر ہوگئی۔ چنانچہ جب احزاب کا مدینہ پر محاصرہ ختم ہوا تو رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ وہاں پہنچے اور بنی

قریظہ کا محاصرہ کرلیا جو پچیس دن تک جاری رہا اور اس دوران وہ اپنے قلعے سے نکلنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جب اُنہیں یہ یقین ہو گیا کہ وہ اپنا قلعہ اس طرح محفوظ نہیں رکھ پائینگے تو اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو اُن کے پاس بھیجا جائے تا کہ وہ اُن سے اپنے اس معاملہ میں مشورہ کرسکیں۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ قبیلۂ اوس سے تھے اور زمانۂ جاہلیت میں یہودیوں کے حلیف رہ چکے تھے۔ ابولبابہ جب یہودیوں کے پاس پہنچے تو وہ لوگ اُن سے ملنے کیلئے آگے آئے اور اُن کی عورتیں اور بچے روتے ہوئے آئے۔ اُنہوں نے ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ''کیا اُنہیں خود کو رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کے حوالہ کر دینا چاہئے؟'' ابولبابہؓ نے جواب دیا کہ ''ہاں'' اور ساتھ ہی گردن کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب واضح تھا کہ گردنیں قلم کر دی جائینگی، اس کے بعد ابولبابہؓ واپس آ گئے۔ کعب ابن اسد نے کچھ مشورے دیے جنہیں یہودیوں نے نامنظور کر دیا تو کعب نے اُن سے کہا کہ ''اب تمہارے پاس خود کو محمد ﷺ کے حوالے کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے''۔ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ اُنہیں اذرعات جانے دیا جائے اور وہ اپنا مال و متاع یہیں چھوڑ کر چلے جائینگے، اس کو آپ ﷺ نے مسترد کر دیا، اب یہودیوں کے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد یہودیوں نے اپنے سابقہ حلیف یعنی قبیلۂ اوس کی مدد چاہی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہودیوں کی سفارش کریں، جب اوس نے رسول اللہ ﷺ سے رجوع کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((ألا ترضون يا معشر الأوس أن يحكم فيهم رجلٌ منكم؟))

''اے قوم اوس! کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا ہی ایک شخص اُن کا فیصلہ کرے؟''

قبیلۂ اوس اس بات راضی تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا کہ وہ اوس کی طرف سے یہودیوں کا فیصلہ کریں۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے پہلے دونوں فریقوں سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اُن کا فیصلہ مان لینگے اور اُس پر راضی ہونگے، دونوں نے جب اس پر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی تو یہودیوں سے مطالبہ کیا کہ پہلے وہ اپنے ہتھیار ڈال کر باہر آ جائیں، جب یہودیوں نے اس پر عمل

کر لیا تو سعد رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ سنایا کہ یہودیوں کے آدمی قتل کر دیئے جائیں، اُن کا مال تقسیم کر دیا جائے اور اُن کی عورتیں اور بچے قید کر لئے جائیں۔ آپ ﷺ نے جب یہ فیصلہ سنا تو فرمایا:

((لقد حکمت فیهم بحکم اللّٰه من فوق سبعة أرقعة))

''تم نے وہ فیصلہ کیا جو سات آسمانوں پر سے اللہ کا فیصلہ تھا''

اس کے بعد مدینہ کے بازار کے پاس خندقیں کھودنے کا حکم دیا گیا اور یہودیوں کو قتل کر کے اُس میں دفن کر دیا، عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا اور مالِ غنیمت میں سے خمس یعنی پانچواں حصہ اور کچھ مزید نکال لینے کے بعد اُسے بھی مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اُس نکالے ہوئے حصے کو سعد بن زید الانصاری رضی اللہ عنہ کو دیا گیا تا کہ وہ نجد جا کر وہاں سے گھوڑے اور ہتھیار خریدیں جس سے مسلمانوں کی قوت میں اضافہ کرنا مقصود تھا۔

اس طرح بنی قریظہ کا کام تمام ہوا لیکن ابھی بھی خیبر کے یہودی باقی تھے جو ان میں سے سب سے زیادہ مضبوط بھی تھے اور مسلمانوں سے اُنہوں نے کوئی صلح یا معاہدہ بھی نہیں کر رکھا تھا، یہی وہ یہودی تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ سے قبل قریش کے ساتھ مل کر سازشوں کی منصوبہ بندی کی تھی اور اِن کا وجود اسلامی ریاست کے پہلو میں ایک کانٹے کی مانند تھا۔ چنانچہ حدیبیہ کا معاہدہ ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ نے فوج تیار کر کے خیبر پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا اور لوگوں کو خیبر کے ساتھ جنگ کی تیاری کا حکم دیا تا کہ وہاں کے یہود سے نمٹا جائے۔ 1600 مجاہدین پر مشتمل فوج تیار کی گئی جس کے ساتھ سو گھڑ سوار تھے۔ یہ فوج خیبر پہنچ کر اُن کے قلعوں کے باہر پوری تیاری کے ساتھ اور اللہ کی مدد پر مکمل یقین کرتے ہوئے خیمہ زن ہوئی۔ یہودی آپس میں مشورے کرنے لگے، سلام بن مشکم کا مشورہ تھا کہ یہودی اپنے مال اور عیال کو سلالم اور وطیح کے قلعوں میں محفوظ کریں اور ناعم کے قلعے میں اسلحہ رکھیں۔ پھر سلام بن مشکم اپنے سپاہیوں کو جنگ کیلئے ترغیب دلاتا ہوا نطاۃ کے قلعے کی طرف گیا۔ اسی قلعے کے باہر مسلمانوں اور یہود کے مابین شدید خونریز جنگ ہوئی جس میں ایک ہی دن میں پچاس مسلمان زخمی ہو گئے۔ ادھر سلام مارا گیا اور فوج کی

کمان الحارث بن ابی زینب نے سنبھالی ، الحارث نے بہت شدت سے مسلمانوں پر حملہ کیا لیکن مسلمانوں کے اہل خزرج نے نہایت دلیری سے مزاحمت کی اور یہودیوں کو پیچھے ہٹ کر قلعوں میں پناہ لینا پڑی۔ مسلمان حملے کرتے رہے لیکن یہودی قلعہ بند رہ کر مزاحمت کرتے رہے اور یوں دن پہ دن گزرتے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ قلعہ کو فتح کر سکیں لیکن اُنہیں کامیابی نہیں ہوئی، پھر عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور اُن کے ساتھ بھی وہی معاملہ رہا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لأعطين الراية غداً رجلاً يحب اللّٰه و رسوله يفتح اللّٰه على يده ليس بفرّار))

''کل جھنڈا اُس شخص کو دیا جائیگا جو اللہ اور اُس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اُس کے ذریعے فتح دیگا''

پھر رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا:

((خذ هذاه الراية فأمض بها حتى يفتح اللّٰه عليك))

''یہ جھنڈا لو اور اُس وقت تک ثابت قدم رہو جب تک اللہ فتح دیدے''

علی رضی اللہ عنہ جب قلعے پر پہنچے تو کچھ یہودیوں نے باہر آ کر اُن کا مقابلہ کیا اور ایک یہودی کی تلوار ایسی لگی کہ علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے اُن کی ڈھال گر گئی، اُنہوں نے ہاتھ بڑھا کر قلعے کا ایک دروازہ اُٹھا لیا جو وہیں پڑا تھا اور اُسی کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور آگے بڑھتے رہے۔ جب وہ قلعے میں پہنچ گئے تو اُسی دروازے کو اس طرح زمین پر بچھا دیا کہ مسلمان اُس پر سے پل کی طرح گزر کر قلعے میں داخل ہو گئے۔ اس طرح قلعہ نٔاعم فتح ہوا اور پھر ایک ایک کر کے باقی قلعے بھی فتح ہوتے گئے یہاں تک کہ اخیر میں وطیح اور سلالم کے قلعے بھی ہاتھ آ گئے۔ یہود کے دلوں پر مایوسی چھا گئی اور اُنہوں نے صلح کی پیشکش کی کہ اُن کی جان بخش دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے قبول کر لیا اور انہیں اجازت دیدی کہ وہ خیبر میں رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ خیبر کی زمین اب فتح کے بعد مسلمانوں کی ہو گئی تھی۔ اس لیے اب یہودی اُس پر کاشت کی محنت کے عوض آدھی پیداوار کے حقدار ہونگے۔

اس طرح جب خیبر اسلامی حکومت کے تابع ہو گیا تو فدک کے یہودی بھی خوفزدہ ہوئے اور صلح کی پیشکش کی، یوں فدک بھی ریاستِ اسلامی کے تابع ہو گیا اور وہاں کے آدھی پیداوار جنگ کے بغیر مسلمانوں کی ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ وادی القریٰ کے راستے سے ہوتے ہوئے مدینہ لوٹ رہے تھے، راستے میں وادی تیماء کے یہود نے بھی بغیر کسی لڑائی کے اسلامی حکومت کی تابعداری قبول کرلی۔ اب یہودیوں کے سارے قبائل سے نمٹا جا چکا تھا اور یہودیوں کی اتھارٹی کا مکمل خاتمہ ہو چکا تھا اور رسول اللہ ﷺ کو ریاست کے داخلی امن کی جانب سے مکمل اطمینان ہو گیا تھا۔

باب نمبر 32

اسلامی ریاست کی بقاءاور دوام

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات پر اجماع کیا کہ ریاست کی سربراہی میں رسول اللہ کے جانشین کے طور پر، خلیفہ کو بیعت کے ذریعے منتخب کیا جائے۔ چنانچہ مسلمان اسی طرح 1342ھ مطابق 1924ء تک ریاست کا سربراہ منتخب کرتے رہے، جسے کبھی خلیفہ، کبھی امیر المؤمنین، کبھی امام اور کبھی سلطان کے نام سے پکارا جاتا رہا اور کسی شخص کو بیعت کے بغیر خلیفہ نہیں چنا گیا۔ اسلامی ریاست آخری خلیفہ تک یعنی اپنے اختتام تک اسی طرح چلتی رہی کہ کوئی بھی شخص بیعت کے بغیر خلیفہ نہیں بنا۔ البتہ بیعت کی نوعیت مختلف رہی، چنانچہ کسی کو براہِ راست عوام کی طرف سے بیعت دی گئی، یا پھر کسی خلیفہ نے ایسے شخص کو نامزد کیا جو اُس کا عزیز یا رشتہ دار نہ تھا، اور بعض نے اپنے اقارب میں سے یا اپنے بیٹے کو نامزد کیا، جبکہ بعض نے اپنے اقارب میں سے ایک سے زیادہ افراد کو بھی نامزد کیا، تاہم کوئی بھی خلیفہ فقط نامزدگی سے بیعت لیے بغیر خلیفہ نہیں بنا، بلکہ نامزدگی کے بعد مسلمانوں کی طرف سے بیعت دینے پر ہی خلیفہ کے انعقاد کا عمل مکمل ہوتا تھا۔ اسی طرح بیعت حاصل کرنے کا طریقہ کار بھی مختلف ادوار میں مختلف رہا، یعنی کبھی یہ بیعت اہل حل وعقد سے لی گئی، کبھی عوام سے اور کبھی فقط 'شیخ الاسلام' سے لی جاتی تھی۔ اِسی طرح بعض اوقات بیعت غلط طریقے سے بھی لی گئی، لیکن بہرحال منصبِ خلافت کیلئے ہمیشہ بیعت کا ہی طریقہ اپنایا گیا، اور محض ولی عہدی سے کبھی کوئی خلیفہ نہیں بنا۔ اِسی طرح ہر خلیفہ

نے اپنے معاونین مقرر کئے جنہیں بعض ادوار میں 'وزیر' کا نام بھی دیا گیا۔ ہر دور میں خلیفہ نے والی، قاضی القضاۃ اور فوج کے قائدین اور مختلف محکموں کے سربراہ مقرر کئے۔ ہر دور میں حکومت کی یہی شکل قائم رہی اور کسی تغیر کے بغیر اُس وقت تک چلتی رہی جب کافر استعمار نے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر کے عالمِ اسلام کو کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔

اس طویل تاریخ میں داخلی طور پر کئی واقعات رونما ہوئے جو کسی بیرونی اقدام کے باعث نہیں بلکہ اُس وقت کے حالات پر اسلامی سمجھ یا فہم کا نتیجہ تھے۔ چنانچہ اُن میں سے ہر ایک نے اُس وقت کے حالات کو اپنے فہم وادراک کے لحاظ سے بدلنے کی کوشش کی۔ اوران تمام مجتہدین نے صورتِ حال سے نمٹنے کا طریقہ صورتِ حال کے متعلق اپنے فہم کے مطابق سمجھا۔ چنانچہ یہ مختلف آراء بہرحال اسلامی ہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ تنازعہ یا اختلاف کا محور خلیفہ کی ذات تھی نہ کہ اختلاف خلافت کے ہونے یا نہ ہونے کے موضوع پر ہوا ہو، یعنی اختلاف کی نوعیت یہ رہی کہ خلیفہ کون ہو، اور اس بات پر کبھی اختلاف نہیں ہوا کہ حکومت کی شکل کیا ہو۔ اور یہ اختلاف اصول اور بنیادی ڈھانچے کے متعلق نہیں بلکہ احکامات کی فروعات یا ان کی تفصیلات پر ہوا۔ اور اِسی طرح مسلمانوں کے درمیان اختلاف کبھی بھی اللہ کی کتاب یا سنتِ رسول ﷺ پر نہیں ہوا بلکہ اِن کے متعلق اُن کا فہم ہی موضوع اختلاف رہا ہے۔ چنانچہ خلیفہ ہونا چاہیے یا نہیں اس پر مسلمان کبھی مختلف نہیں ہوئے بلکہ اختلاف اس بات پر ہوا کہ آیا خلیفہ کون ہو اور اسی طرح اسلام کا مکمل نفاذ اور پوری دنیا تک اسلام کی دعوت کو لے جانا کبھی بھی امت میں اختلاف کا موضوع نہیں بنا، بلکہ ہمیشہ یہی ہوا کہ اسلام ہی کو نافذ کیا گیا اور اسلام کی دعوت کو پوری دنیا تک پہنچانے کے اقدامات کئے جاتے رہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اسلام کے بعض احکامات کے نفاذ میں غلطیاں ہوئیں، جو کبھی اسلام کے حکم کو غلط سمجھنے کے باعث ہوئیں تھیں تو کبھی جان بوجھ کر ان احکامات کو غلط طور پر نافذ کیا گیا، لیکن جو چیز ہمیشہ نافذ کی گئی وہ صرف اسلام ہی تھا نہ کہ کچھ اور۔ چنانچہ ہر دور میں دوسرے ممالک، اقوام اور لوگوں سے اسلامی ریاست کے تعلقات کی بنیاد صرف اسلام اور پوری دنیا تک اسلام کے پیغام کو پہنچانا ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اندرونی اختلافات کے باوجود نئی فتوحات ہوتی

رہیں اور اسلام پھیلتا رہا۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں نئی فتوحات کا سلسلہ گیارہویں صدی ہجری بمطابق سترھویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ ایران، ہندوستان اور وسط ایشیاء کے علاقے اِن فتوحات میں سے ہی ہیں یہاں تک کہ اسلامی ریاست کی سرحدیں پھیلتی ہوئی مشرق میں چین اور روس تک، یہاں تک کہ بحرِ قزوین (Caspian Sea) تک جا پہنچیں۔ جبکہ شمال میں شام فتح ہوا۔ اسی طرح مغرب کی جانب مصر، شمالی افریقہ اور اندلس یعنی اسپین فتح ہوئے۔ اسی طرح مسلمان ترکی، بلقان اور یورپ کے مشرقی اور جنوبی حصوں کو فتح کرتے ہوئے بحرِ اسود تک پہنچ گئے جس میں کریمیا اور یوکرائن کے جنوبی حصے بھی شامل تھے۔ حتیٰ کہ اسلامی فوجیں آگے بڑھتے ہوئے آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا کے دروازوں تک پہنچ گئی تھیں۔ مسلمان فوج کبھی بھی فتوحات اور دعوت کو پہنچانے سے نہیں رکے، بلکہ ایسا صرف اُس وقت ہوا جب امت کا اسلام کے ساتھ تعلق کمزور ہو گیا اور امت کے ذہنوں میں اسلام کا فہم بگڑ گیا۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے آخری ادوار میں اسلام کا فہم امت میں اس قدر کمزور ہو گیا کہ اس کا نفاذ متاثر ہونے لگا اور امت نے اسلام سے مخالف نظاموں سے افکار و قوانین کو یہ سمجھ کر اپنا لیا کہ یہ اسلام سے متصادم نہیں ہیں اور یہی چیز بالآخر اسلامی ریاست کی بربادی پر منتج ہوئی۔

اسلامی ریاست کی ترقی و خوشحالی ہمیشہ مسلمانوں کی فکری بلندی، تخلیقی مہارت اور اجتہاد کے ساتھ ہم قدم رہی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں فتوحات بہت پھیلیں تو اجتہاد میں بھی وسعت آئی اور نئے علاقوں میں پیش آنے والے نئے مسائل کا حل اسی اجتہادی طریقے سے کیا گیا۔ چنانچہ نئے مفتوحہ علاقوں جیسے شام، مصر، ایران، ہندوستان، اسپین، عراق اور وسط ایشیاء میں نئے مسائل پر شریعتِ اسلامی کی تطبیق کی گئی اور اِن علاقوں کے لوگ اسلام کے سائے میں آتے چلے گئے جو کیے جانے والے استنباط کے صحیح ہونے، قوتِ اجتہاد اور تخلیقی قوت کا ثبوت ہے۔ اسلام کا حق ہونا قطعی ہے اور اسلام کا صحیح فہم اس بات کو ممکن اور یقینی بناتا ہے کہ لوگ احکامات کیلئے اسلام کی طرف رجوع کریں اور اس کے احکامات کی تعلیم دیں۔ یہ خصائص یعنی مسلمانوں کی قوتِ تخلیق اور قوتِ استنباط و اجتہاد پانچویں صدی ہجری بمطابق گیارھویں صدی عیسوی تک موجود رہا، پھر تخلیقی قوت

میں کمزوری آنے لگی اوراجتہاد شاذ ونادر ہوگیا، نتیجتاً اسلامی ریاست کا وجود کمزور ہونے لگا۔ پھر صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا، مسلمان اِن جنگوں میں مصروف رہے اور بالآخر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی، پھر مملوک حکمران بن گئے جو نہ تو اجتہاد کی استطاعت رکھتے تھے اور نہ ہی اُنہوں نے اسلام کے فکری پہلوؤں پر توجہ دی، جس کے باعث اسلامی ریاست کی فکری کمزوری میں اضافہ ہوا اور اس کے بعد سیاسی کمزوری رونما ہوئی۔ تاتاریوں کے حملے نے صورتِ حال کو مزید سنگین کر دیا، جب انہوں نے بے شمار اسلامی کتب دریائے دجلہ میں بہا دیں جس سے امت کے فکری ورثے کو شدید نقصان پہنچا۔ فکری کمزوری ہی اجتہاد کے فقدان کی وجہ تھی۔ اب مسائل کے متعلق بحث محض فتوے جاری کرنے اور نصوصِ شرعیہ کی تاویلیں کرنے تک محدود ہوگئی، نتیجتاً ریاست کی فکری سطح گرتی چلی گئی اور یہ امر سیاسی گراوٹ پر منتج ہوا۔ اس کے بعد عثمانی آئے اور انہوں نے اسلامی ریاست کی حکمرانی حاصل کر لی۔ عثمانیوں نے فوجی طاقت اور فتوحات پر توجہ مرکوز کی، انہوں نے استنبول اور بلقان کو فتح کیا اور یورپ کے اندر تک چلے گئے، انہوں نے اسلامی ریاست کو دنیا کی سب سے بڑی ریاست اور قوت بنا دیا لیکن فکری گراوٹ برقرار رہی۔ یہ فوجی ترقی فکری بلندی کی بناء پر نہیں تھی اور یہ فوجی قوت وقت کے ساتھ ساتھ ماند پڑتی گئی یہاں تک کہ اس کا اختتام ہوگیا۔ البتہ ریاست اب بھی اسلامی دعوت کی علمبردار تھی اور اسلام کی دعوت دے رہی تھی، اور مفتوحہ علاقوں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے اور آج بھی وہ مسلمان ہی ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ اسلام کے متعدد فہم اور خلیفہ کی طرف سے نظامِ حکومت کیلئے احکامات کو تبنی (adopt) نہ کیا جانا، گو کہ بعض معاشی احکام تبنی کئے گئے تھے، وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے بعض خلفاء اور والیوں نے اس انداز سے حکمرانی کے معاملات چلائے کہ جس کے نتیجے میں ریاست کی وحدت اور قوت مجروح ہوئی، لیکن یہ امر ریاست کے برقرار رہنے پر اثر انداز نہیں ہوا۔ خلیفہ کی طرف سے والیوں کو ولایتِ عامہ کا دیا جانا اور وسیع اختیارات عطا کرنا، والیوں میں خود مختاری کے جذبات اُبھارنے کا باعث بنا۔ اب اِن والیوں کی حیثیت قریب قریب آزاد سلطانوں کے مانند ہوگئی تھی جو خلیفہ کو محض بیعت دینے پر اکتفاء کرتے تھے، یا منبروں پر اُن کے نام

کے خطبے پڑھواتے یا پھر اُن کے نام کے سکے ڈھلواتے تھے جبکہ اصل حکومت وفرمانروائی اِن والیوں ہی کے ہاتھوں میں تھی، اس سے اِن علاقوں کی حیثیت خودمختار ممالک جیسی ہوگئی تھی۔ جیسا کہ حمدانی اور سلجوقی حکمرانوں کا حال تھا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صرف ولایتِ عامہ دینے سے ریاست کی وحدت پارہ پارہ ہوئی تھی جیسا کہ عمرو بن العاص کی مصر میں ولایتِ عامہ تھی اور معاویہ بن ابوسفیان شام میں والی تھے، لیکن انہوں نے ریاست سے علیحدگی اختیار نہیں کی اور خلفاء کے قوی ہونے کے باعث ریاست کی وحدت برقرار رہی تھی۔ تاہم جب خلفاء خود ہی کمزور پڑ گئے اور اُنہوں نے والیوں کی خودمختار صورتِ حال کو ہی قبول کرلیا تو والیوں کی خودمختاری کے رجحان نے جڑ پکڑی اور ہر ولایہ ایک ریاست کے انداز میں معاملات چلانے لگی، تاہم یہ ولایات اسلامی ریاست کے وجود کا حصہ اور اسلامی ریاست کے ماتحت ہی رہیں۔ پس ریاست ہمیشہ ایک ہی رہی اور خلیفہ ہی والیوں کی تقرری کرتے رہے اور انہیں معزول کرتے رہے اور کوئی والی خواہ کتنا ہی بااثر اور مضبوط ہوگیا ہو، اس نے کبھی بھی خلیفہ کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی اسلامی ریاست نے کسی بھی دور میں مختلف ولایات کے وفاق کی صورت اختیار کی۔ حتیٰ کہ جس وقت والیوں کی خودمختاری اپنے عروج پر تھی، اُس وقت بھی یہ ریاستِ واحدہ ہی رہی جس کا ایک ہی خلیفہ تھا جو مرکز، ولایات، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کے متعلق ہر نوعیت کے اختیارات کا مالک تھا۔

اور جہاں تک اسپین کی خلافت اور مصر میں فاطمی ریاست کا تعلق ہے تو اِن کا معاملہ والیوں کے معاملہ سے مختلف نوعیت کا تھا۔ اسپین کے والی نے خودمختار خلافت کا اعلان کیا تھا لیکن وہاں کے والی کو کبھی تمام مسلمانوں کے خلیفہ کے طور پر بیعت نہیں دی گئی۔ اور وہ صرف اسپین کے لوگوں کا خلیفہ کہلایا گیا نہ کہ تمام مسلمانوں کا، جبکہ مسلمانوں کا خلیفہ ایک ہی رہا جس کے پاس حکومت تھی۔ اس لیے اسپین کی حیثیت ہمیشہ ایک ایسی ولایت کی رہی جو خلیفہ کے دائرے سے باہر تھی۔ یہی صورتِ حال خلافتِ عثمانیہ کے دوران ایران کی بھی رہی، وہاں کا حکمران مسلمانوں کا دوسرا خلیفہ نہیں تھا اور ایران خلافتِ عثمانیہ سے الگ ایک آزاد ولایت تصور کی جاتی تھی۔ جہاں تک فاطمی ریاست کا تعلق ہے تو اس کی بنیاد اسماعیلی فرقے نے ڈالی تھی جو ایک کافر فرقہ ہے جن

کے افعال کی اسلام کے نقطۂ نظر سے کوئی حیثیت نہیں ہے، چنانچہ فاطمی ریاست نہ تو اسلامی ریاست تھی اور نہ ہی یہ خلافت تھی۔ اور عباسی خلافت کے ہوتے ہوئے فاطمی ریاست کے وجود کو ایک سے زیادہ خلافت ہونے پر تعبیر نہیں کیا گیا کیونکہ یہ کوئی شرعی خلافت تھی ہی نہیں۔ فاطمی حکومت کی حیثیت یہ تھی کہ یہ باطنی فرقہ کی باطل کوشش تھی کہ وہ اسلامی ریاست کو اپنے ہاتھ میں لے کر اُس میں اپنے باطل نظریات سے حکومت کرے۔ لہٰذا اسلامی ریاست ایک ہی ریاست رہی جو مختلف ریاستوں کا مجموعہ نہیں تھی بلکہ ایک واحد اکائی تھی۔ اور ایسی کوششیں کی گئی کہ حکومت حاصل کی جائے اور ریاست میں اسلام کے کسی خاص فہم کو نافذ کر کے حکمرانی کو اس کے مطابق چلایا جائے، پھر یہ کوششیں دم توڑ گئیں اور خلافت ایک واحد ریاست کے طور پر ہی باقی رہی۔ اس بات کی ایک اور دلیل، کہ اسلامی ریاست ایک ہی ریاست تھی، یہ حقیقت بھی ہے کہ ایک مسلمان پوری طرح آزاد تھا کہ وہ اسلامی علاقوں میں مشرق سے مغرب تک بلا کسی روک ٹوک آ جا سکتا تھا اور کوئی اس کے مقام کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اسے اس نقل مکانی کیلئے کسی کی اجازت درکار تھی کیونکہ وہ ایک ہی اسلامی ریاست کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں منتقل ہو رہا ہوتا تھا۔ اس طرح اس اسلامی ریاست تمام مسلمانوں کو وحدت کی لڑی میں پروئے ہوئے تھی۔ یہ ریاست ایک مضبوط قوت کے طور پر باقی رہی یہاں تک کہ 1924ء میں کافر سامراج نے اس خلافتِ اسلامیہ کو اپنے ایجنٹ مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) کے ہاتھوں نیست و نابود کر دیا، اس بنا پر کہ یہ اسلامی ریاست تھی۔

باب نمبر 33

اسلامی ریاست کی داخلہ پالیسی

اسلامی ریاست کی داخلہ پالیسی کا ہدف ریاست کے اندر اسلامی احکامات کا نفاذ ہوتا ہے۔ یہ ریاست ہمیشہ اُن علاقوں میں اسلامی احکامات کا نفاذ کرتی رہی جو اس کی اتھارٹی تلے موجود تھے۔ اسلامی ریاست نے معاملات کو اسلامی احکامات کے تحت منظّم کیا، حدود قائم کیں، عقوبات نافذ کیں، لوگوں کو اعلیٰ اخلاق کا پابند بنایا، عبادات اور دیگر شعائرِ اسلامی کی پابندی کو یقینی بنایا اور عوام کے تمام معاملات کی نگہداشت اسلام کے احکامات کے ذریعے ہی کی۔ اسلام نے وہ انداز بیان کر دیا ہے جس کے مطابق اسلام کے احکامات کو اُن لوگوں پر نافذ کیا جاتا ہے، جو اسلامی ریاست کی اتھارٹی تلے موجود ہوں خواہ وہ لوگ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ اسلامی ریاست نے اسلام کے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا کیونکہ اسلام میں جس طرح مسائل و معاملات کا حل حکمِ شرعی ہے اسی طرح اُن کے نفاذ کا طریقہ بھی حکمِ شرعی ہی ہے۔ اسلام کے مخاطب تمام انسان ہیں کیونکہ اللہ جلّ جلالہ نے اسلام کے ذریعے بنی نوعِ انسان کو صرف انسان ہونے کے ناطے مخاطب کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

''اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ'' (البقرۃ: 21)

اور فرمایا:

﴿يَآَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾
''اے انسان! تجھے اپنے ربِ کریم سے کس چیز نے بہکایا؟'' (انفطار:6)

علمائے اصولِ فقہ کے نزدیک شریعت کے قوانین کا مخاطب ہر عاقل شخص ہے جو ان قوانین کو سمجھ سکتا ہو، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ امام غزالی اپنی کتاب 'المستصفیٰ فی علم الاصول' میں لکھتے ہیں: ''ہر محکوم علیہ مکلّف ہے بشرطیکہ وہ اتنی عقل رکھتا ہو کہ (اللہ کے) خطاب کو سمجھے... جو چیز کسی انسان کو شرعی احکامات پر عمل پیرا ہونے کا مکلّف بناتی ہے وہ اُس کا محض انسان ہونا ہے، جس بنا پر اس میں وہ عقل موجود ہے کہ جس کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا ادراک کرتا ہے'' لہٰذا اسلام کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں اور یہ خطاب اُن کیلئے ایک پکار بھی ہے اور عمل کیلئے اُنہیں مکلّف بھی بناتا ہے۔ خطاب کا پکار ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ خطاب لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت ہے جبکہ عمل کے لیے مکلّف بنانے سے مراد یہ ہے کہ یہ خطاب لوگوں کو اسلام کے احکام کا پابند کرتا ہے۔ یہ بات تمام انسانوں کیلئے باعتبار انسان ہے۔ رہی بات اُن لوگوں کی جو اسلامی ریاست کے تابع ہوں یعنی اُسکے شہری ہوں تو اسلام اُنہیں ایک ایسی جماعت کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس پر اس کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ اس میں اُن لوگوں کی قومیت یا نسل کی کوئی اہمیت نہیں، دیکھنے کی ضرورت صرف یہ ہے کہ وہ ریاست کے شہری ہوں یعنی ریاست کا حصہ اور اُس کے قانون کے تابع ہوں۔ اس ریاست میں کسی گروہ کے اقلیت ہونے کا کوئی تصور نہیں ہوتا بلکہ تمام لوگ انسان ہونے کے اعتبار سے ریاست کے شہری ہوتے ہیں، جب تک کہ وہ اس کے تابع رہیں۔ لہٰذا جو کوئی اس ریاست کے تابع ہوتا ہے قطعِ نظر اس سے کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم، اُس کے حقوق وہی ہوتے ہیں جو شریعت نے طے کئے ہیں۔ مثلاً ایک مسلم شخص جو اس ریاست کا شہری ہے، اُس کی والدہ عیسائی اور ریاست کی شہری ہو، لیکن اُس شخص کا والد مسلمان ہو لیکن ریاست کا شہری نہ ہو، ایسی حالت میں وہ عیسائی والدہ بیٹے کی طرف سے نفقہ پانے کی حقدار ہوگی جبکہ والد کو نفقہ کا حق نہیں ہوگا۔ اگر ماں نفقہ کا مطالبہ کرتی ہے تو قاضی اس کے حق میں فیصلہ دیگا کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی طرح اسلامی ریاست کی شہری ہے جبکہ اسکے والد کی جانب سے نفقہ کی

درخواست کو قاضی اس بناء پر مسترد کر دیگا کہ وہ ریاست کا شہری نہیں ہے۔ یہاں قاضی کے فیصلے میں یہ بات ملحوظ ہے کہ وہ لوگ جو اسلام کی حکمرانی تلے ہیں وہ سب ریاست کے شہری ہیں۔ اور اسلامی ریاست کی تابعداری ان میں قدرِ مشترک ہے جو انہیں اس بات کا حق دار بناتی ہے کہ ان کے معاملات کی دیکھ بھال اسلام کے ذریعے کی جائے اور انہیں دارالاسلام کے شہری کی حیثیت حاصل ہو۔

یہ ہے وہ مؤقف جو اسلامی ریاست، رعایا کے معاملات کی نگہداشت اور اُن پر حکومت کرنے کے متعلق سے رکھتی ہے۔ اور جہاں تک اسلام کے قوانین کے نفاذ کا معاملہ ہے تو اِسے قانونی نقطہ نظر سے دیکھا جائے گا نہ کہ مذہبی نقطہ نظر سے، کیونکہ اسلام لوگوں پر نافذ نظام کو قانونی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ مذہبی و روحانی نقطۂ نظر سے، یعنی اسلام نظام کو اس اعتبار سے دیکھتا ہے کہ یہ لوگوں کے معاملات کے متعلق شرعی احکامات ہیں۔ لہٰذا شرعی نصوص کا قانونی پہلو ملحوظِ خاطر ہونا چاہیے کیونکہ نصوص مسائل و معاملات کے حل کے طور پر نازل ہوئی ہیں اور شارع کا منشاء یہ ہے کہ نازل کردہ نصوص کے معانی کا اتباع کیا جائے نہ کہ محض نصوص کے الفاظ پر اکتفاء کر لیا جائے۔ چنانچہ احکام کے استنباط میں حکم کی عِلّت (شرعی وجہ) قابلِ لحاظ ہوتی ہے، یعنی نصوص سے احکام اخذ کرنے میں اُن کا قانونی پہلو زیرِ غور ہوتا ہے۔ خلیفہ جب ایسے ماخوذ احکام نافذ کرے تو یہ قانون بن جاتے ہیں جن کی اتباع کرنا ہر ایک پر لازم ہوتی ہے اور اُن کا نافذ کیا جانا واجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے ہر شہری پر شرعی احکام کی تابعداری حتمی اور لازمی امر ہے۔ پس جو لوگ اس عقیدے کے ماننے والے یعنی مسلمان ہونگے، وہ اپنے اس اعتقاد کے باعث ان احکامات کے پابند ہونگے کیونکہ عقیدے کو مان لینے کا مطلب اس سے نکلنے والے ہر حکم کو ماننا ہے اور ایک مسلمان کا عقیدہ اُس پر اِس بات کو حتمی طور پر لازم کرتا ہے کہ وہ اس عقیدہ سے ماخوذ ہر حکم کی پابندی کرے۔ پس ایک مسلمان کیلئے شریعت اسلام کا جزو ہے جو قوانین پر مشتمل ہے یعنی اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں سے قانون نکلتا ہے۔ چنانچہ مسلمان اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اسلام کے تمام احکامات کی اتباع کریں، خواہ یہ احکامات مسلمانوں کے اللہ سے تعلق کے

متعلق ہوں، یعنی عبادات یا ان احکامات کا تعلق اُن کی اپنی ذات سے ہو جیسے اخلاق اور طعام یا پھر ان احکامات کا تعلق اُن کے دیگر انسانوں کے ساتھ تعلقات سے متعلق ہو یعنی معاملات اور عقوبات۔ تمام مسلمان اسلامی عقیدہ پر متفق ہیں اور اس بات پر کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ ادلّہ شرعیہ، شرعی قواعد اور شرعی احکامات کے ماخذ ہیں اور کسی کو اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اجتہاد کے حکم کے باعث مسلمانوں میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کا فہم مختلف ہے۔ قرآن وسنت کے فہم میں اس اختلاف کے سبب مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر اُبھرے، کیونکہ اسلام نے ہی مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ احکامات کو اخذ کرنے کے لیے اجتہاد کریں۔ چنانچہ فہم وادراک کی صلاحیت میں قدرتی فرق کے باعث عقیدہ سے متعلقہ افکار میں اور احکام کو اخذ کرنے کے طریقے میں اور خود احکام وآراء میں اختلاف پیدا ہوا اور متعدد مکاتبِ فکر اور مسالک وجود میں آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود مسلمانوں کو اجتہاد کی طرف راغب فرمایا اور یہ واضح کر دیا کہ حاکم جب اجتہاد کرے اور اس سے خطا سرزد ہو جائے تو اسے ایک اجر ملتا ہے اور اگر اس کا اجتہاد صحیح ہو تو وہ دو اجر کا مستحق ہے۔ اس طرح اسلام نے اجتہاد کا باب کھول دیا۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اسلام میں مختلف مکاتبِ فکر جیسے اہل السُنہ، شیعہ اور معتزلہ وجود میں آئے۔ اسی طرح شافعی، مالکی، حنفی، حنبلی، زیدی، جعفری اور دیگر مسالک کا وجود بھی کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ یہ تمام مسالک اور مکاتبِ فکر ایک ہی عقیدۂ اسلامی کو ماننے والے تھے۔ چنانچہ یہ تمام مسالک و مکاتب فکر اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اتباع اور نواہی سے اجتناب کے مخاطب ہیں اور احکامِ شرعیہ پر عمل کے پابند ہیں نہ کہ اپنے مسالک پر عمل کے۔ کیونکہ درحقیقت مسلک کسی شرعی حکم کا ایک مخصوص فہم ہے جس کی ایک ایسا شخص تقلید کرتا ہے جو بذاتِ خود مجتہد نہیں ہے کیونکہ وہ اجتہاد کی استطاعت نہیں رکھتا۔ ایک مسلمان شرعی حکم کا پابند ہوتا ہے نہ کہ مخصوص مسلک کا، چنانچہ اگر ایک شخص مجتہد ہو تو وہ اس حکم کو اپنے اجتہاد سے اخذ کرتا ہے اور اگر وہ مجتہد نہ ہو تو کسی دوسرے مجتہد کی تقلید کرتے ہوئے اس حکم پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ ہر وہ مکتبہ فکر اور مسلک جو عقیدۂ اسلام پر یقین رکھتا ہے، کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر یقین رکھتا ہے اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ ہی ادلۂ شرعیہ، قواعدِ شرعیہ اور احکام شرعیہ کے ماخذ ومصدر ہیں، تو

ایسا ہر مکتبہ فکر اور مسلک مسلم ہے چنانچہ اُن پر اسلام کے احکامات ہی نافذ کئے جائینگے۔ اور اسلامی ریاست پر یہ لازم ہے کہ وہ ایسے اسلامی مکاتبِ فکر میں اور فقہی مسالک پر چلنے والوں میں دخل اندازی نہ کرے جب تک کہ وہ عقیدۂ اسلام کے پابندر ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ عقیدۂ اسلام سے خروج کرتا ہے تو یہ اسلام سے پھر جانا ہے اور ان پر مرتدین کے احکام نافذ ہوں گے۔ ایک مسلمان سے تمام اسلامی احکامات کی پابندی کا مطالبہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض احکامات ایسے ہیں جو کہ قطعی ہیں جن میں ایک سے زیادہ درست رائے نہیں ہیں جیسا کہ چور کا ہاتھ کاٹنا، سود کا حرام ہونا، زکوٰۃ کا فرض ہونا، پانچ وقت کی نمازوں کا فرض ہونا وغیرہ، یہ احکامات ایک ہی فہم کے مطابق تمام مسلمانوں پر نافذ کئے جائینگے کیونکہ یہ احکامات نوعیت کے اعتبار سے قطعی ہیں۔

جبکہ بعض ایسے احکام، افکار اور آراء ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کے فہم میں اختلاف ہے اور ایک مجتہد کی رائے دوسرے مجتہد سے فرق ہے، مثال کے طور پر خلیفہ بننے کے لیے درکار صفات، خراجی زمین پر عشر کا معاملہ، زمین کو کرایہ پر دینا وغیرہ، ایسے احکامات میں خلیفہ تبنی (مخصوص رائے کو اختیار) کریگا چنانچہ خلیفہ جس حکم کی تبنی کر لے گا، اُس حکم کی اطاعت ہر شخص پر لازم ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسی صورت میں جس شخص کی رائے خلیفہ کی تبنی سے مختلف ہو، وہ بھی اس بات کا پابند ہے کہ اپنی رائے کو ترک کر کے صرف خلیفہ کی رائے پر ہی عمل کرے، کیونکہ امام کا حکم اختلاف کو دور کرتا ہے اور ایسے معاملے میں امام کی اطاعت واجب ہوتی ہے اور مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ خلیفہ کے تبنی کئے ہوئے تمام احکامات ظاہری اور باطنی طور پر نافذ کریں یعنی خلوت و جلوت میں ان احکامات کی پابندی کریں۔ جو کوئی خلیفہ کے تبنی کئے ہوئے حکم شرعی کے علاوہ کسی اور شرعی حکم پر عمل کرے یا اُس کا حکم دے تو وہ گنہگار ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خلیفہ جس حکم کو تبنی یا اختیار کر لیتا ہے وہ ایک مسلمان کیلئے حکم شرعی ٹھہرتا ہے اور اس کے علاوہ حکم مسلمان کیلئے حکم شرعی نہیں کیونکہ ایک معاملہ میں ایک مسلمان کیلئے حکمِ شرعی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ البتہ خلیفہ عقائد کے معاملے میں تبنی نہیں کرتا کیونکہ یہ تبنی مسلمانوں کو تنگی اور جبر میں مبتلا کرے گی۔ لیکن اگر لوگ دین میں نئی نئی باتیں شامل کرنے لگ جائیں اور لوگوں کے عقائد اُن کی خواہشات پر مبنی ہونے لگیں

اور غلط عقائد جنم لینے لگیں تو ریاست اُن کی سرزنش کریگی، اگر یہ عقائد ایک شخص کو کفر تک نہ لے جائیں۔ تاہم اگر ایسے عقائد کو اختیار کرنے سے وہ لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں تو ایسی صورت میں اُن سے مرتدین والا معاملہ کیا جائے گا۔ اسی طرح خلیفہ عبادات کے معاملات میں بھی احکامات کی تبنی نہیں کرتا کیونکہ اس سے مسلمان اپنی عبادات کے معاملے میں مشقت میں مبتلا ہوں گے۔ لہٰذا جب تک لوگوں کے عقائد اسلامی ہیں خلیفہ اس باب میں کوئی معین حکم تبنی نہیں کرتا اور نہ ہی زکوٰۃ، جہاد اور عیدین کے تعین کے سوا عبادات کے باب میں کسی مخصوص حکم کو اختیار کرتا ہے، جب تک کہ یہ عبادات احکامِ شرعیہ کے مطابق ہوں۔ اس کے علاوہ خلیفہ تمام معاملات میں قوانین کی تبنی کرتا ہے جیسا کہ خرید و فروخت، کرایہ داری، نکاح و طلاق، نان نفقہ، کمپنی سازی و کفالت وغیرہ، اور عقوبات میں حدود و تعزیرات، نیز طعام، ملبوسات، اخلاقیات وغیرہ اور ہر مسلمان پر اُن تبنی شدہ قوانین کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ خلیفہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عبادات نافذ کرے، چنانچہ وہ نماز اور رمضان کے روزے ترک کرنے والے کو سزا دیتا ہے اور اسی طرح وہ عبادات کے تمام احکامات اسی طرح نافذ کرتا ہے جیسا کہ عبادات کے علاوہ دیگر احکام نافذ ہوتے ہیں اور انہیں نافذ کرنا ریاست پر فرض ہے کیونکہ نماز کی فرضیت کسی اجتہاد کا موضوع نہیں اور نہ ہی یہ عبادات کے احکامات کی تبنی کرنا ہے بلکہ یہ ایسے حکم شرعی کو نافذ کرنا ہے جو تمام مسلمانوں کیلئے قطعی ہے۔ چنانچہ جس طرح دیگر احکام کے متعلق عقوبات (سزائیں) نافذ کی جاتی ہیں، اُسی طرح عبادات کے ترک کرنے پر بھی عقوبات ایک شرعی معاملہ ہے جس پر عمل کرنے کے عوام پابند ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر بحث مسلمانوں پر اسلام کے نفاذ کے حوالے سے تھی، اور جہاں تک ریاست کے دیگر شہریوں کا تعلق ہے جن کا عقیدہ اسلام نہیں ہے، تو اُن کی مختلف اقسام ہوتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) ایسے لوگ جو کسی مرتد کی اولاد ہوں اور اُن کی پیدائش باپ کے ارتداد کے بعد ہوئی ہو، اِن کے ساتھ غیر مسلم کا معاملہ ہوگا جو اُن کی حقیقت کی مناسبت سے ہوگا یعنی آیا وہ اہلِ کتاب ہیں یا مشرکین۔

(2) ایسے لوگ جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوں لیکن اُن کا عقیدہ اسلام کے متضاد ہو، تو اُن کے ساتھ مرتدین جیسا سلوک کیا جائیگا۔

(3) وہ غیر مسلم جو اہلِ کتاب ہیں۔

(4) مشرکین جو بتوں کو پوجتے ہوں، اور صابی، مجوسی، ہندو وغیرہ، اور وہ تمام کفار جو اہلِ کتاب نہیں ہیں۔

مؤخر الذکر دونوں اقسام کو اُن کے مخصوص عقائد اور عبادات کی چھوٹ ہوگی، اور اُن کے نکاح وطلاق کے معاملات اُن کے دین کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ اُن کیلئے ریاستی عدالتوں میں اُن ہی میں سے قاضی ہوتا ہے جو اُن کے معاملات کے فیصلے کرتا ہے۔ اُن کی غذاء اور لباس سے متعلق معاملات اُن ہی کے دین کے مطابق شریعت کے دائرے کے تحت طے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق اہلِ کتاب کے علاوہ دیگر کفار کے ساتھ معاملات بھی اہلِ کتاب ہی کی طرح ہوتے ہیں، آپ ﷺ نے مجوسیوں کے بارے میں فرمایا: **((سنو بهم سنة اهل الكتاب))** ''اُن کے ساتھ وہی معاملہ کرو جو اہلِ کتاب کے ساتھ ہوتا ہے''۔ جبکہ معاملات اور عقوبات کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم سب کیلئے یکساں ہوتا ہے۔ جس طرح سزاؤں کا اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے بعینہ غیر مسلموں پر بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ غیر مسلموں پر معاملات اسی طرح نافذ اور فسخ ہوتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں پر اور اس معاملے میں قوم، رنگ ونسل اور مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جاتی کیونکہ ہر وہ شخص جو ریاست کا شہری ہو خواہ اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو وہ معاملات اور عقوبات میں شریعتِ اسلامی کا مخاطب ہوتا ہے اور شرعی احکامات کی اتباع اُس پر لازم ہوتی ہے، ماسوائے کہ یہ اتباع قانونی پہلو سے ہوتی ہے نہ کہ روحانی و دینی پہلو سے۔ پس انہیں ان احکامات پر اعتقاد رکھنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا کیونکہ اسلام کو قبول کرنے کے لیے ان پر کوئی زبردستی نہیں ہے، اللہ جل جلالہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ﴾

''دین (کو قبول کرنے میں) میں کوئی زبردستی نہیں'' (البقرة: 256)

نیز رسول اللہ ﷺ نے دین کی بنیاد پر اہلِ کتاب پر جبر کرنے یا انہیں ستانے سے منع فرمایا ہے۔ البتہ شرعی احکامات کا نفاذ ریاست پر فرض ہوتا ہے اور شرعی احکام کی بطورِ قوانین پابندی پر غیر مسلموں کو مجبور کیا جاتا ہے۔

مختصراً یہ کہ اسلامی ریاست کی داخلہ پالیسی یہ ہے کہ شریعت کے احکامات ہر ایک پر، جو ریاست کی اتھارٹی کے تحت ہو، نافذ کئے جاتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ چنانچہ شرعی قوانین کے نفاذ کی شکل اس طرح ہوتی ہے:

(1) مسلمانوں پر اسلام کے تمام احکامات نافذ کئے جاتے ہیں۔
(2) غیر مسلم اپنے عقیدے اور عبادات میں آزاد ہوتے ہیں۔
(3) غیر مسلموں سے مطعومات وملبوسات کے معاملات ان کے دین کے مطابق، نظامِ عام کے دائرے کے ضمن طے پاتے ہیں۔
(4) غیر مسلموں کے نکاح وطلاق کے معاملات اُن کے قاضی اُن کے دین کے مطابق ریاستی عدالتوں میں طے کرتے ہیں، نہ کہ اُن کی کسی عدالت میں۔ اس قسم کے معاملات اگر مسلمان اور غیر مسلموں کے مابین ہوں تو یہ معاملات شریعتِ اسلامی کے مطابق مسلمان قاضیوں کے ذریعے طے پاتے ہیں۔
(5) ریاست اسلامی شریعت کے باقی تمام احکامات جن میں معاملات وعقوبات، نظامِ حکومت و نظامِ معیشت وغیرہ شامل ہیں، ہر فرد پر نافذ کرتی ہے، اور اس تنفیذ میں کسی کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔
(6) ہر وہ شخص جو اسلامی ریاست کی اتھارٹی کے تحت زندگی بسر کرتا ہو، ریاست پر یہ واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کے ہر معاملے کی نگہداشت کرے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔

باب نمبر 34

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کسی ریاست کے دنیا کے دیگر ممالک واقوام سے تعلقات کا نام ہے۔ یہ تعلق امت کے بیرونی معاملات کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی یعنی دیگر ریاستوں اوراقوام کے ساتھ اس کے تعلقات ایک مستحکم اور دائمی فکر پر مبنی ہوتے ہیں، جس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ فکر دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم میں اسلام کی دعوت کو پھیلانا ہے۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور یہ بنیاد کبھی تبدیل نہیں ہوتی خواہ حکومت کرنے والے اشخاص کتنے ہی تبدیل ہوتے رہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے مدینۂ منورہ میں اسلامی ریاست قائم کرنے سے خلافتِ عثمانیہ کے اختتام تک خارجہ پالیسی کی یہی بنیاد رہی اور اس بنیاد میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ میں ریاست قائم کی تو اس ریاست نے بیرونی دنیا سے اسلام کو پھیلانے کی بنیاد پر تعلقات قائم کیے۔ پس آپ ﷺ نے یہود سے معاہدہ اس غرض سے کیا کہ اُن کی جانب سے فارغ ہوسکیں اور حجاز میں دعوت کے کام پر توجہ کی جائے۔ پھر قریش سے حدیبیہ میں اس لئے صلح کی کہ حجاز سے باہر سارے جزیرہ نما عرب میں اسلام کی دعوت کو مضبوط بنایا جائے۔ پھر آپ ﷺ نے عرب کے اندر اور باہر بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے خطوط لکھے کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور یوں ان کے ساتھ اسلام کی دعوت کی بنیاد پر تعلق بنایا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد آنے والے خلفاء نے بھی بیرونی دنیا سے اسی

بنیاد پر رشتہ استوار کیا کہ اسلام کی دعوت کو فروغ حاصل ہو۔ مسلم حکمران نئے علاقے فتح کرنے اور اسلام کی دعوت کو پھیلانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے، مثلاً اموی خلفاء نے فتوحات اور نشرِ دعوت میں عباسی خلفاء سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اسی طرح عثمانی اس معاملے میں مملوک حکمرانوں سے آگے رہے۔ اِن کامیابیوں میں فرق اس وجہ سے تھا کہ مختلف ادوار میں ریاست نے خارجہ پالیسی کو اپنی ترجیحات میں مختلف مقام پر رکھا، البتہ ہر دور میں بیرونی ممالک سے تعلقات کی بنیاد ہمیشہ نشرِ اسلام ہی رہی اور اس معاملہ میں ہر خلیفہ کا نقطۂ نظر یکساں رہا۔ کیونکہ اسلامی ریاست کا وجود ہی اس غرض سے ہوتا ہے کہ اسلام کو داخلی طور پر مکمل نافذ کیا جائے اور خارجی طور پر اس کی دعوت سارے عالم تک پہنچائی جائے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کا خارجی نصب العین اسلامی دعوت کو ساری دنیا تک پہنچانا ہے۔ یہ نصب العین اس بناء پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام انسانیت کیلئے مبعوث کیا گیا ہے، اللہ ﷻ نے فرمایا:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَنَذِيۡرًا﴾ (سبا: 28)

''ہم نے آپ ﷺ کو تمام تر انسانیت کیلئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے''

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ (یونس: 57)

''اے بنی نوع انسان! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے''

﴿قُلۡ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا﴾

''آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں'' (اعراف: 158)

﴿وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ﴾

''اور میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے بھیجا گیا ہے تا کہ میں اس قرآن کے ذریعہ سے تمہیں اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں'' (الانعام: 19)

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسٰلَتَهٗ﴾

''اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے، اسے پہنچا

دے دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے رسالت کا حق ادا نہ کیا'' (المائدہ: 67)

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اللہ کے پیغام کی متواتر تبلیغ کی، چنانچہ آپ ﷺ کے وصال تک مسلمان اس پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ پس اسلام کی دعوت کو پہنچانا آپ ﷺ سے مسلسل ثابت ہے۔ اسی طرح بعد میں بھی مسلمانوں نے اسلام کی دعوت کا پرچم اٹھائے رکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا:

((لیبلغ الشاهد الغائب،فرب مبلغ اوعیٰ من سامع))

''جو یہاں موجود ہے وہ اُس تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہے، ممکن ہے سننے والا پہنچانے والے سے زیادہ ہوش مند ہو''

اور فرمایا:

((نصّر اللّٰه امرءاً سمع مقالتی فوعاها ثم أداها إلى من لم يسمعها))

''اللہ ﷻ اُس کو کامیاب فرمائے جو میری بات سنے پھر سمجھ کر اسے اُس تک پہنچائے جس نے نہ سنی ہو''

چنانچہ اسلام کی دعوت کو دیگر ممالک اور اقوام تک پہنچانا، رسول اللہ ﷺ اور پھر آپ ﷺ کے بعد خلفاء کے دور میں اسلامی ریاست کے خارجی تعلقات کی اساس رہا ہے۔ نیز یہ حکم شرعی ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ثابت ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کی خارجہ سیاست کی بنیاد اسلامی دعوت کو پہنچانا ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ حکمران بدلتے رہے، اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی ایک ہی طریقے کے ذریعے نافذ ہوتی رہی جو کہ جہاد ہے، اور یہ طریقہ کبھی تبدیل نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کے وقت سے اسلامی ریاست کے خاتمے تک یہی طریقہ ثابت ہے اور یہ طریقہ ہرگز تبدیل نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ریاست قائم کرتے ہی فوج کی تشکیل شروع کر دی اور جہاد کا آغاز کر دیا تا کہ دعوتِ اسلام کی راہ میں حائل کسی بھی مادی رکاوٹ کو دور کیا جائے۔ قریش

اسلام کی دعوت کے راستے میں رکاوٹ تھے، آپ ﷺ نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کا فیصلہ کیا اور قریش کی جڑ کاٹ دی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے دیگر طاقتوں کو بھی ایک ایک کر کے ختم کیا جو دعوت کی راہ میں حائل تھیں، یہاں تک کہ تمام جزیرہ نما عرب اسلام کی تابعداری میں آ گیا۔ اس کے بعد اسلامی ریاست نے اسلام کو پھیلانے کے لیے دوسری اقوام اور ممالک کے دروازوں پر دستک دی لیکن اُن سب کا معاملہ یہ تھا کہ وہاں پر موجود حکومتی ڈھانچے اس دعوت کی راہ میں حائل تھے جن کا ختم کیا جانا دعوت کے فروغ کیلئے ناگزیر تھا۔ چنانچہ یہی کیا گیا تاکہ اسلام کی حکمرانی کے ذریعے براہِ راست عوام تک پہنچا جائے اور وہ خود اسلام کی بھلائیوں کو دیکھیں، اس کے بہتر عدل و انصاف کو محسوس کریں اور اس کے سائے میں چین وسکون، ترقی اور خوشحالی سے رہ سکیں اور کسی بھی جبر و اِکراہ کے بغیر لوگوں کو اسلام کی دعوت ہو سکے۔ چنانچہ جہاد اسلام کے فروغ کا طریقہ کار رہا، جہاد کے ذریعے نئے ممالک، ریاستیں اور علاقے فتح ہوئے، اسلام نے اقوام پر حکمرانی کی، اسلام کی اشاعت ہوئی اور اسلام کے تحت زندگی بسر کرنے کے نتیجے میں کروڑوں کی تعداد میں لوگوں نے دین قبول کیا۔ اسلامی ریاست نے اپنی خارجہ سیاست کو نافذ کرنے کیلئے جہاد ہی کو طریقہ بنائے رکھا، اور اس طریقہ میں کوئی تغیر وتبدل واقع نہیں ہوا۔ جہاد اسلام کی راہ میں دعوت اور اللہ کے راستے میں قتال ہے خواہ یہ براہِ راست ہو یا پھر مالی وسائل یا اپنی آراء اور تحریروں کے ذریعے جہاد میں مدد فراہم کرنا ہو۔ جہاد مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کی فرضیت قرآن اور سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ مسلمان لڑائی کا آغاز اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ دشمن کو اسلام قبول کرنے کی دعوت نہ دے دیں یا ان کے سامنے جزیہ کی پیشکش نہ رکھ دیں۔ جہاد میں شریعت کا حکم یہی ہے کہ جب کفار کا محاصرہ کر لیا جائے تو اُنہیں اسلام کی دعوت پیش کی جائے، اگر وہ اسے قبول کر لیں تو وہ امتِ مسلمہ کا جزو بن جاتے ہیں اور اب اُن سے قتال حرام ہو گا۔ اور اگر وہ اسلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیں تو اُن سے جزیہ کا مطالبہ ہو گا، چنانچہ اگر وہ قبول کر لیں تو اُن کی جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں اور اُن کا ملک دارالاسلام بن جاتا ہے جس پر اسلام کی حکومت ہو گی۔ اب عدل وانصاف کے معاملے میں اُن کے حقوق مسلمانوں ہی کی طرح ہونگے، اُن کی حفاظت اور اُن

کے معاملات کی دیکھ بھال مسلمانوں کے معاملات ہی کی طرح ہوگی اور اُن کی زندگی کے تمام معاملات کی ضمانت ہوگی۔ ان کی طرف سے ریاست اور نظام کی تابعداری مسلمانوں ہی کی طرح ہوگی۔ لیکن اگر وہ اسلام کی دعوت قبول نہیں کرتے اور جزیہ ادا کرنے سے بھی انکار کردیتے ہیں تو پھر اُن سے قتال جائز ہوجاتا ہے۔ لہٰذا قتال جائز ہونے کیلئے کسی ملک کے باشندوں پر اسلام کی دعوت کا پہنچا دیا جانا شرط ہے، بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ ہمارے لئے کسی ایسے سے قتال کرنا حلال نہیں جسے اسلام کی دعوت نہ دی جا چکی ہو۔ چنانچہ قتال سے پہلے یہ لازم ہے کہ اُس ملک میں اسلام کے لیے رائے عامہ پیدا کیا جائے، وہاں کے باشندوں کو اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے، اور یہ کوشش کی جائے کہ عوام تک اسلام کے احکام پہنچیں، تاکہ وہ یہ محسوس کرسکیں کہ اسلام اُنہیں اُن پر چھائی ہوئی ظلمتوں سے نجات دلاتا ہے، خواہ یہ اجمالی طور پر ہو۔ چنانچہ اسلامی حکومت پر یہ واجب ہے کہ وہ اسلام کی طرف دعوت دے اور ایسے سیاسی اقدامات کرے جن سے وہاں کے عوام کو اسلام کی واضح معلومات فراہم ہوں اور اسلام کے افکار کو فروغ ملے۔ اس میں یہ امر بھی شامل ہے کہ اسلامی ریاست کی طاقت وقوت کا مظاہرہ کیا جائے اور مسلمانوں کی دلیری و جانبازی کی جھلک دکھائی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے کئی اعمال سرانجام دیے، آپ نے اسلام کے داعیوں کو شرک کرنے والے معاشرے کے قلب کی طرف روانہ کیا، پس آپ ﷺ نے چالیس افراد کو اسلام کی اشاعت کیلئے نجد بھیجا، اسی طرح آپ ﷺ نے غزوہ تبوک پر روانگی سے قبل فوج کو مدینہ کے گلی کوچوں سے گزارا اور ریاست کی قوت وطاقت کا اظہار کیا، اور اسی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

((نصرت بالرعب من مصيرة الشهر))

''مجھے ایک مہینہ کی مسافت سے دشمن پر رعب کے ذریعے مدد دی گئی ہے''

مسلمان فوج ہر زمانے میں دشمن کو ہلا دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ یورپ کو اس بات کا یقین تھا کہ مسلمان فوج کو کبھی شکست نہیں دی جاسکتی اور یہ سوچ صدیوں تک اُن کے اذہان پر چھائی رہی۔

پس ایسے سیاسی اقدامات کرنا لازمی ہے جن سے اسلام کے افکار کو فروغ حاصل ہو اور ریاست کی قوت کا مظاہرہ ہو، تب قتال کیا جائے۔ گو کہ جہاد اسلام کی اشاعت کا ایسا طریقہ ہے جس میں کبھی کوئی رد و بدل نہیں ہوا تاہم یہ بھی ناگزیر ہے کہ قتال سے قبل مطلوبہ سیاسی اقدامات کئے جائیں۔ یہ ریاستِ اسلامی کے دوسرے ممالک سے تعلقات کو مضبوط کرنے میں بنیادی امر ہے، خواہ یہ اقتصادی تعلقات ہوں، یا بہتر ہمسائیگی کے تعلقات ہوں، یہ تعلقات اسلام کو پھیلانے کو سہل بناتے ہیں۔

لہٰذا وہ سیاسی فکر جس کی بنیاد پر اسلامی ریاست دیگر ممالک اور قوموں سے رابطے رکھتی ہے وہ یہی اسلام کی دعوت کو ان تک پہنچانا ہے، جس کا طریقہ جہاد ہے۔ البتہ اسلامی ریاست اس کیلئے منصوبہ بندی کرتی ہے اور اسلوب کا تعین کرتی ہے اور وسائل و ذرائع مہیا کرتی ہے۔ مثلاً اسلامی ریاست اپنے کچھ دشمنوں سے اچھی ہمسائیگی کا معاہدہ کرے اور بعض ممالک سے قتال کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آتے ہی کیا، یا اسلامی ریاست تمام دشمنوں سے بیک وقت جنگ کا اعلان کرے جیسا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا کہ ایک ہی وقت عراق اور شام دونوں کیلئے فوجیں روانہ کیں یا اسلامی ریاست معینہ مدت کے معاہدے کرے تا کہ دعوت کے حق میں رائے عامہ قائم کی جا سکے جیسا کہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں کیا۔ اسلامی ریاست یہ اسلوب بھی اپنا سکتی ہے کہ وہ کچھ علاقائی جھڑپیں کرے تا کہ دشمن دہشت زدہ کیا جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر سے پہلے فوجی مہمات بھیج کر کیا تھا، یا جس طرح اموی خلافت میں رومی سلطنت کے خلاف موسم سرما اور موسم گرما میں اُن کی سرحدوں پر کیا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دعوت کے فائدے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بعض ممالک سے تجارتی معاہدات کیے جائیں اور بعض دوسروں سے معاہدات نہ کیے جائیں کہ کچھ ممالک سے رشتے بڑھائے جائیں اور بعض دوسروں سے نہ بڑھائے جائیں اور یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ دعوت پہنچانے کیلئے کیا منصوبہ بندی اختیار کی گئی ہے۔ ریاست یہ بھی کر سکتی ہے کہ بعض ممالک کے ساتھ دعوت پھیلانے کے لیے تشہیر کا اسلوب اختیار

کرے اور بعض دشمن مما لک کی خفیہ سازشوں کو بے نقاب کرے یا اُن سے سرد جنگ چھیڑ دے۔
اس طرح ریاست مختلف اسالیب اور منصوبے استعمال کرسکتی ہے جو اسلام کے فروغ اور جہاد کو آسان بنانے کے لیے موزوں اور معاون ہوں۔ پس منصوبے اور اسلوب خارجی سیاست میں اہم ہیں، اسی طرح دنیا میں اسلام اور اسلامی ریاست کے حق میں رائے عامہ کا قیام بھی اہم ہے۔
البتہ یہ تمام وسائل، اسالیب اور منصوبے متعین کردہ طریقے کے ذریعے اسلام کو پھیلانے کی ضرورت ہیں اور یہ متعین طریقہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

باب نمبر 35

اسلامی فتوحات سے مقصود اسلام کو پھیلانا ہے

امتِ مسلمہ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ اسلام کی دعوت کو تمام لوگوں تک پہنچائے، اس مقصد کے حصول کیلئے یہ لازم ہے کہ وہ ساری دنیا سے رابطے میں رہے۔ اسی طرح ریاست پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ دعوت کو پھیلانے کے لیے تعلقات استوار کرے اور اس طریقہ کار کو اختیار کرے جو اسلام نے اس دعوت کو پھیلانے کے لیے مقرر کیا ہے۔ لہٰذا یہ طے شدہ اور حتمی امر ہے کہ اسلامی ریاست مما لک کو فتح کرتی ہے۔ ان فتوحات کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں پر جو واجب ہے اسے پورا کیا جائے یعنی لوگوں تک اسلام کو اس انداز میں پہنچایا جائے کہ وہ دین کی طرف متوجہ ہو جائیں، یعنی اُن پر اسلام کے احکامات کو نافذ کیا جائے اور اُن میں اسلام کے افکار کو پھیلایا جائے۔ ان مما لک کو فتح کرنے کا مقصد اُنہیں اپنی نوآبادیات بنالینا، اُن کا استحصال کرنا یا وہاں کے قدرتی وسائل و ذخائر پر قبضہ کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ان فتوحات کا مقصد محض ان تک اسلام کی دعوت کو پہنچانا ہوتا ہے، تاکہ اُنہیں اُن کی مشکلات اور فاسد نظام سے چھٹکارا ملے۔ اور یہ حقیقت اسلامی ریاست کے قیام، اسلامی فتوحات کے عمل اور جہاد کی فرضیت سے ظاہر ہے۔

اسلامی ریاست نہایت قوی اور مستحکم اساس پر قائم تھی۔ اس میں وسعت اور ترقی ہوئی، پھیلاؤ اور فتوحات ہوئیں۔ اس ریاست کا بیج ایک عالمی ریاست کے قیام کا بیج تھا نہ کہ ایک

محدود مقامی ریاست کا، کیونکہ اس ریاست کا عقیدہ ایک عالمی عقیدہ تھا جو کہ تمام انسانوں کیلئے ہے، اس کا نظام عالمگیر نوعیت کا ہے جو تمام انسانیت کیلئے ہے، لہٰذا اس ریاست کا پھیلنا اور فتوحات کا ہونا فطری امر تھا۔ یہ ایک حتمی اور ناگزیر امر تھا کہ یہ ریاست پھلے پھولے اور وسعت پزیر ہو۔ یہی وہ چیز تھی جس پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے بیعتِ عقبہ ثانیہ لی تھی۔ یہ بیعت ہر گورے اور کالے کے خلاف لڑنے کی بیعت تھی، خواہ اس میں اُن کے مال و دولت تباہ ہو جائیں یا اُن کے سردار ہلاک ہو جائیں، چنانچہ اُنہوں نے بیعت کی کہ وہ خوشحالی ہو یا تنگدستی، دونوں صورتوں میں اطاعت کرینگے، ہر وقت صرف حق کی حمایت کرینگے اور اللہ کے راستے میں کسی سے ذرّہ برابر خوفزدہ نہیں ہونگے، انہوں نے بیعت کی کہ وہ اسلامی دعوت کی حمایت میں موت کو بھی قبول کریں گے، اور اس کے عوض اُن سے صرف اور صرف جنت کا وعدہ تھا۔ یہ اسلامی ریاست کے لشکر کا مرکزہ تھے جو اسلام کے علمبردار بنے تھے۔ آخر اس لشکر نے ایسی بیعت کیوں دی؟ اس لشکر کو تشکیل دینے کا کیا مقصد تھا؟ اور اس بیعت کے بعد شروع ہونے والی جنگی مہموں کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ اسلام کے پیغام کو پھیلانے کے لیے نہیں تھا؟ کیا یہی وہ واحد مقصد اور مشن نہ تھا جس کی خاطر یہ لشکر بنا، اور انہوں نے بیعت دی اور اپنی موت تک اللہ کی راہ میں لڑنے کو تیار ہو گئے؟

اللہ کے رسول ﷺ نے خود اپنی وفات سے قبل ان فتوحات کا منصوبہ تیار کر لیا تھا، آپ ﷺ نے تمام جزیرہ نمائے عرب پر محیط اسلامی ریاست کے قائم ہونے کے بعد ہجرت کے ساتویں سال روم کے قیصر، فارس کے کسریٰ اور دیگر بادشاہوں کو خطوط لکھے اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی۔ آپ ﷺ نے مؤتہ اور تبوک میں معرکہ آرائیاں کیں اور اُسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر تیار کیا۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے اس منصوبے کو جاری رکھا اور اُن ممالک کی فتح سے شروعات کی جنہیں اللہ کے رسول ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس کے بعد بھی اسلامی فتوحات اسی بنیاد پر جاری رہیں۔ اِن فتوحات میں کسی ملک کے قدرتی وسائل، مال و دولت اور اُس کو فتح کرنے میں آسانی

یا مشکلات پیش نظر نہیں ہوتیں تھیں، مثلاً مصر قدرتی وسائل کے اعتبار سے خوشحال تھا اور اسے فتح کرنا نسبتاً آسان تھا، جبکہ اس کے برعکس افریقہ کا شمالی علاقہ اِن قدرتی وسائل کے لحاظ سے خالی تھا، اس کے صحراء کے سبب اس کا فتح کرنا بھی دشوار تھا اور وہاں اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچانا بہت مشکل تھا، لیکن اِس قسم کا فرق اسلامی ریاست کے مدِّ نظر نہیں رہا، کیونکہ ان فتوحات کا مقصد اسلام کو پھیلانا اور اسلام کی دعوت کو ان علاقوں میں لے کر جانا تھا، وہ علاقے خواہ غریب ہوں یا مال و ثروت والے ہوں، انہیں فتح کرنا آسان ہو یا وہاں کے لوگ شدید مزاحمت کریں، کیونکہ اسلام کو پھیلانا اور اس کی دعوت کا علمبردار بننا اس بات کو خاطر میں نہیں لاتا کہ کسی جگہ کے لوگ مفلس ہیں یا غنی، وہ لوگ اسے قبول کرتے ہیں یا ردّ، یہاں تو بس ایک ہی چیز قابلِ لحاظ ہے کہ اسلام کی دعوت کو ایک ایسی فکری قیادت کے طور پر پہنچایا جائے کہ جس سے زندگی کے لیے نظام جنم لیتا ہے اور یہ دعوت پوری دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قتال کے اسباب اور جہاد کی فرضیت کو بیان فرمایا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ جہاد صرف اسلام کی راہ میں اسلام کی دعوت کو پہنچانے کیلئے ہی کیا جاتا ہے۔ قرآن میں متعدد آیات وارد ہوئیں ہیں جن میں مسلمانوں کو اسلام کے لیے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

''اور تم ان سے اس حد تک لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ ہی کا ہو جائے'' (الانفال: 39)

اور فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾

''ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین غالب نہ آ جائے، اگر یہ رک جائیں تو

سختی سوائے ظالموں کے کسی پر نہیں‘‘ (البقرۃ: 193)

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُونَ﴾

’’ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور جو اللہ اور اس کے رسول کے حرام کردہ امور کو حرام نہیں جانتے اور اہلِ کتاب سے لڑو جو دینِ حق کو قبول نہیں کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ماتحت ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں‘‘ (البقرۃ: 193)

یہ اور ان جیسی دیگر آیات میں جہاد کا حکم آیا ہے اور یہ آیات مسلمانوں کیلئے فتوحات کے مقصد کا تعین کرتی ہیں اور مسلمانوں کو ان فتوحات کے لیے متحرک ہونے پر ابھارتی ہیں۔

پس اسلام کی دعوت کا علمبردار بننا ہی درحقیقت وہ مقصد اور غایت ہے جس کیلئے اسلامی ریاست قائم ہوئی، فوج تیار کی گئی اور جہاد فرض کیا گیا۔ یہی دعوت تمام فتوحات کا سبب تھی اور اسلام کی دعوت کا علمبردار بننا ہی مسلمانوں کو ان کی ریاست واپس دلائے گا۔

باب نمبر 36

فتوحاتِ اسلامی میں استحکام

مسلمانوں نے کئی ممالک فتح کئے اور اسلام کے ذریعے اُن پر حکومت کی۔ مسلمانوں پر اسلام نے فرض کیا ہے کہ وہ دنیا کی حکومت سنبھالیں اور قیادت کریں، یہ جائز نہیں کہ اُن پر غیر مسلم حاکم بنیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۂ نساء میں فرمایا:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾

''اور اللہ نے کافروں کو مؤمنوں پر ہرگز کوئی راستہ (اختیار یا غلبہ) نہیں دیا'' (النساء: 141)

اور اسلام نے عزت کو مسلمانوں کیلئے خاص کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

''اور عزت تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کیلئے ہے، لیکن منافق یہ بات نہیں جانتے'' (المنافقون: 8)

لیکن اللہ نے مسلمانوں کو عزت، حکمرانی اور دنیا کی قیادت سے اُس وقت نوازا جب اُن میں اسلامی نفسیت پختہ ہو چکی تھی، پس حکومت و اقتدار اُن کیلئے شوق و شہوت نہ رہا بلکہ وہ اسے اسلام کے احکام نافذ کرنے اور اس کی دعوت نشر کرنے کا ذریعہ سمجھنے لگے؛ اور جب ان کی عقلیہ بھی اسلامی بن چکی گئی، پس وہ شرع کی طرف سے عائد کردہ حکم کو سمجھتے تھے اور اللہ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا

ادراک کرتے تھے۔ چنانچہ حکمرانوں کے اعمال اوراُن کے اقوال سے اسلام کا نور ٹپکتا تھی اوراسی طرح یہ نوراسلام کے احکامات کے نفاذ سے بھی عیاں تھا جو حکمران عوام پر نافذ کرتے تھے۔ اسلام کے احکامات کے نافذ ہونے کے نتیجے میں لوگ فوج درفوج اسلام میں داخل ہونے لگے اورعقیدۂ اسلام کوقبول کرنے لگے۔ اب اُن کیلئے بھی وہی عزت،حکمرانی اور دنیا کی قیادت تھی اوراُن کے علاقے دارالاسلام بن گئے تھے۔ اسلامی احکامات کے نفاذ سے اور پھرعوام کے اسلام میں فوج در فوج داخل ہونے سے یہ فتوحات مستحکم ہوگئیں۔ یہ لوگ قیامت تک کیلئے اسلام میں داخل ہو چکے تھے ان کی سابقہ حالت تبدیل ہوچکی تھی۔ وہ کفار سے مسلمان بن چکے تھے اوراُن کے علاقے دارلکفر سے دارالاسلام بن گئے تھے۔ اور یہ علاقے دارالاسلام ہی رہے یہاں تک کہ ان کے اوپر سے اسلام کی حکمرانی ختم ہوگئی۔ تاہم اسلام کی حکمرانی کے خاتمے اوراسلامی ریاست کا سایہ سمٹ جانے کے بعد بھی یہ لوگ مسلمان ہی رہے اور اِن کے علاقے مسلم علاقے ہی رہے۔ آج بھی ان ممالک میں اس بات کی قابلیت موجود ہے کہ وہاں دوبارہ اسلامی حکومت کوقائم کردیا جائے اور اسلامی ریاست کی اتھارٹی کو پورے عالم تک پھیلا دیا جائے۔ وہ امور جن کی وجہ اسلامی فتوحات کو استحکام ملا اوراسلام قیامت تک کے لیے اُن کے اندر سرائیت کر گیا، وہ متعدد ہیں۔ ان میں سے کچھ امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے مفتوحہ علاقوں میں اسلامی حکومت کو ابتداء ہی سے آسانی میسر ہوگئی جیسا کہ اسلام کی قانون سازی یا تشریع، اور کچھ امور ایسے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اسلام میں فوج درفوج داخل ہوئے جیسا کہ طرزِ حکمرانی اور حکمرانوں کا اچھا برتاؤ، اور کچھ امور ایسے ہیں جن کے باعث اسلام نے ہمیشہ کے لیے اِن کے دلوں میں گھر کرلیا جیسا کہ اسلامی عقیدہ کی خاصیت اوراسلامی احکامات کو بطورِ قوانین اختیار کرنا۔ اِن امور کو مختصراً درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(1) اسلامی عقیدہ کی دلیل عقلی ہے، اوراسلام کے احکام وآراء فکری ہیں۔ لٰہذا اسلام اپنے ماننے والوں کیلئے یہ لازم کرتا ہے کہ وہ اس کے عقیدہ پر عقل کو استعمال کرتے ہوئے ایمان لائیں اور

اسلامی احکامات کا اپنی عقل وفہم سے ادراک کریں۔ لہٰذا اسلام پر اس طرح ایمان لانے سے ایک انسان صاحبِ فہم وادراک بن جاتا ہے، جب وہ مخلوق کو دیکھتا ہے تو اسے بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اس مخلوق کا ایک خالق ہے، اس میں جستجو ہوتی ہے کہ وہ شرعی نصوص پر غور وخوض کرے اور احکامِ شرعیہ کو اخذ کرے اور ان کے ذریعے اپنے مسائل حل کرے۔ اس طرح جب وہ ایمان لاتا ہے تو اسلام حتمی طور پر اس کے اندر راسخ ہو جاتا ہے پس وہ اسلام کے احکامات کو سمجھتا ہے اور اُنہیں اپنی زندگی میں عملاً نافذ کرتا ہے۔

(2) اسلام اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ مطالعہ کریں اور دین سیکھیں۔ دین کے فہم کو حاصل کرنے کیلئے یہ کافی نہیں ہے کہ فقط کلمہ طیبہ کی دونوں شہادتوں پر ہی اکتفاء کر لے بلکہ یہ ناگزیر ہے کہ وہ گہرائی، روشن فکر اور شعور کے ساتھ علم اور اسلامی ثقافت کو حاصل کرے، یہ تعلیم مسلمان کے اُفق کو وسیع کر دیتی ہے اور اس کی معرفت میں اضافہ کرتی ہے، اس کی عقلیت کی نشوونما کرتی ہے اور اب وہ دوسروں کا معلم بن جاتا ہے۔

(3) اسلام کی آئیڈیالوجی اور احکامِ شریعہ کا مزاج و ماہیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسلام کا سیکھنا مسلسل ہو اور یہ سیکھنے والے کی زندگی پر اور اس معاشرے پر اثر انداز ہو جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے۔ اسی لئے مسلمان اسلام کو اس غرض سے سیکھتے ہیں تاکہ وہ اُس کے احکامات پر عمل پیرا ہو سکیں، چنانچہ وہ اس کے احکامات کو فکری انداز سے حاصل کرتے ہیں، پس یہ احکامات ان کے جذبات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور زندگی کے متعلق ان کا احساس ایک نتیجہ خیز احساس ہوتا ہے جو انہیں مؤثر فکر تک لے جاتا ہے۔ اسی سبب مسلمان اسلام میں بے پناہ دلچسپی اور جوش رکھتے تھے اور اُن کی فکر کا معیار بلند اور نظر میں وسعت تھی، کیونکہ اسلام کا عقیدہ ان کے نفوس میں گہرائی سے پیوست تھا اور اُنہوں نے اسلام کے افکار، احکامات اور آراء کو گہرے مطالعہ اور غور وخوض سے حاصل کیا تھا اور اسلام کا عملی پہلو ہی ان پر غالب رہا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے اسلام کا مطالعہ محض علمی کاوش کے طور پر نہیں کیا، اگر ایسا کیا ہوتا تو وہ محض چلتی پھرتی کتابیں ہوتے کہ جن میں اسلام کی معلومات جمع کر دی گئی ہوں۔ اور نہ ہی انہوں نے اسلام کو محض وعظ وارشاد کی چیز سمجھا، اگر ایسا ہوتا تو اُن کی سوچ نہایت سطحی ہوتی جو حرارتِ ایمانی سے خالی ہوتی بلکہ انہوں نے اِن دونوں پُرخطر راہوں سے اجتناب کیا یعنی اسلام کو صرف معلومات کیلئے سیکھنا اور اسلام کو محض وعظ ونصیحت کی چیز سمجھنا۔ مسلمانوں نے اسلام، اسکے احکامات اور مفہوم وتصورات کو سمجھنے کا وہی طریقہ اختیار کیا جو اسلام نے متعین کیا ہے یعنی اسلام کو گہرائی اور نہایت شفافیت سے حاصل کیا جائے اور اس مقصد سے سمجھا جائے کہ اس کے احکامات کو زندگی کے میدان میں نافذ کرنا ہے۔

(4) اسلام اپنے ماننے والے کو آگے بڑھاتا ہے اور بتدریج احسان وکمال کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ اسلام مسلمان پر معین اعمال فرض کرتا ہے جن کی پابندی ایک مسلمان کو کمال کی طرف لے جاتی ہے جہاں وہ روحانی بلندی، نفس کے اطمینان اور حقیقی خوشی کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس میں اسی بلند مقام پر قائم رہنے کی لگن ہوتی ہے اور وہ دوبارا پستی کی طرف نہیں لوٹتا۔ ان اونچائیوں تک پہنچنا جس قدر دشوار ہے، تو اُن بلندیوں پر برقرار رہنا اس سے بھی زیادہ مشقّت طلب ہے۔ چنانچہ یہ لازم ہے مسلمان اُن اعمال پر متواتر قائم رہے نہ کہ وقتی اور عارضی طور پر اُن پر عمل پیرا ہوا جائے، تب ہی انسان رفعت وبلندی پر برقرار رہ سکتا ہے۔

یہ وہ اعمال اور عبادات ہیں جن میں بعض فرائض ہیں اور کچھ مندوبات یعنی نافلہ اعمال ہیں۔ فرائض کی پابندی تمام لوگوں کو ترقی کے ایک عام معیار پر پہنچاتی ہے جو کہ نہایت ضروری ہے، جبکہ نافلہ اعمال کی پابندی کرنا اُسے راہِ کمال پر آگے بڑھاتا ہے۔

ان عبادات کی پابندی کوئی بہت شاق اور تھکا دینے والا عمل نہیں ہے، نہ ہی اِن پر قائم رہنے کا مطلب اپنے آپ کو نڈھال کرنا، دنیا کی لذتوں سے خود کو محروم رکھنا اور دنیاوی خوشیوں اور مسرتوں سے اجتناب کرنا ہے۔ نیز یہ نہ تو انسانی جبلتوں کو کچلنا ہے اور نہ ہی یہ اعمال انسانی فطرت

کے مخالف ہیں۔ نہیں، بلکہ ان عبادات خصوصاً فرائض کی پابندی سہل بھی ہے اور خواہ کوئی انسان کمزور ہو یا اس کی ارادی قوت کیسی ہی کیوں نہ ہو، اِن عبادات پر عمل پیرا ہونا اُس کی استطاعت کے اندر ہے۔ اور یہ فرائض دنیا کی زیب وزینت سے پرہیز کا نام بھی نہیں ہیں۔ جبکہ سنتوں اور نوافل کی مسلمان اپنے شوق وجذبے سے پابندی کرتا ہے، اسے احساس ہوتا ہے کہ فرائض کے علاوہ اِن مندوبات (سنن ونافلہ اعمال) کے ذریعے وہ اللہ ﷻ کی رضا حاصل کر رہا ہے۔

(5) مسلمانوں کا علاقوں کو فتح کرنے کا مقصد اسلام کی دعوت کو پہنچانا اور اُن لوگوں میں اسلام کو پھیلانا تھا۔ وہ اس بات کا ادراک کرتے تھے کہ وہ رحمت اور ہدایت کے سفیر ہیں، جب وہ کسی ملک میں داخل ہوتے تھے تو وہ وہاں اسلام کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ محض ذمی کی حیثیت اختیار کر لینے سے وہاں کے لوگوں کے حقوق وواجبات مسلمانوں کی طرح ہو جاتے تھے اور وہ علاقہ بھی اسلامی ریاست کے دوسرے علاقوں ہی کی طرح ہو جاتا تھا اور اسلامی ریاست کا حصہ بن جاتا تھا، کیونکہ ساری ریاست میں حکومت کا نظام ایک ہی تھا، چنانچہ وہاں کے لوگ یہ قطعاً محسوس نہ کرتے کہ اُن کے ملک کو استحصال کیلئے نوآبادی بنایا گیا ہے بلکہ اس پورے عمل میں کہیں بھی نوآبادیاتی طرزِ عمل کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کہ عوام نے فوج در فوج عقیدۂ اسلام کو قبول کیا کیونکہ مسلمانوں جس قانون کے ذریعے اور جس انداز سے حکمرانی کرتے تھے، وہ ان کے سامنے اسلام کی عملی تصویر کشی کر دیتا تھا۔

(6) اسلام کا عقیدہ اور احکامات تمام انسانوں کیلئے ہیں اور یہ جائز ہے کہ تمام لوگوں کو اس کی تعلیم دی جائے، بلکہ اس کی تعلیم دینا فرض ہے تا کہ لوگ اس کی حلاوت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے حقائق کو سمجھیں۔ رسول اللہ ﷺ والیوں، حکام اور معلمین کو بھیجا کرتے تھے تا کہ وہ اسلام کے احکامات کے ذریعے حکمرانی کریں اور لوگوں کو اسلام کے احکامات سکھائیں۔ آپ ﷺ کے بعد جب مسلمانوں نے ممالک فتح کئے تو اُنہوں نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا کہ حکام اور معلمین کو بھیجا جو لوگوں کو اسلام کا فہم دیتے اور انہیں قرآن کے احکامات سکھاتے۔ اس طرح مفتوحہ علاقے کے

لوگوں نے اسلامی معارف کو قبول کیا یہاں تک کہ اُن کی ثقافت اسلامی ہوگئی، حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا وہ بھی اسی ثقافت کے رنگ میں رنگ گئے۔

(7) چونکہ اسلامی شریعت پوری دنیا کے لیے ہے اور یہ مکمل ہے، اس لیے جب مسلمانوں نے نئے ممالک فتح کئے تو اُنہیں وہاں کے لوگوں کے قوانین سیکھنے کی یا زندگی کے معاملات ومسائل سے متعلق اسلام کے احکامات کو اُن ممالک کے مقامی قوانین کے موافق بنانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کے برعکس وہ فتح کے پہلے دن سے ہی وہاں کے مقامی مسائل کو حل کرنے کیلئے اسلامی احکامات ہی کو نافذ کرتے تھے۔ قوانین کے نفاذ کے متعلق مسلمانوں کا طریقہ انقلابی ہوتا تھا، وہ تدریجاً اور ٹکڑوں میں اسلام کو احکامات کو نافذ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی وہ اُس وقت کے حالات کو اسلام کے نفاذ پر اثر انداز ہونے دیتے تھے کیونکہ ممالک تو فتح ہی اس لئے کئے جاتے تھے کہ اسلام کو ان علاقوں تک پہنچایا جائے اور اُن کی فاسد حالت کو اور ابتر زندگیوں کو تبدیل کیا جائے۔ ایسی تبدیلی کا تقاضا یہی تھا کہ پرانے بوسیدہ نظام کو سرے سے اکھاڑ کر نئے نظام کا مکمل نفاذ کیا جائے۔ اسی لئے مسلمانوں کیلئے یہ آسان تھا کہ وہ پہلے دن سے اُن ممالک پر حکومت کریں، اور ان کی حکمرانی مستحکم اور مکمل تھی، اُنہیں کسی قانونی پیچیدگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ ہی کوئی ایسا مرحلہ پیش آیا جس میں اسلام کے احکامات کو معطل کرنا پڑا ہو، کیونکہ وہ ایک دعوت کے علمبردار تھے، اُن کے پاس ایک عقیدہ تھا جس سے زندگی کے نظام، قوانین اور احکامات نکلتے تھے، یعنی ایسی شریعت جو تمام انسانوں کیلئے اور ہر وقت اور ہر علاقے کیلئے موزوں تھی۔

باب نمبر 37

لوگوں کو امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھالنا

جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اُس وقت تک جزیرہ نمائے عرب سے شرک کا خاتمہ کر دیا گیا تھا اور پورا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا، اور وہاں اسلام کے عقیدہ اور نظام کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مکمل کر دیا تھا، مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام کر دی تھی اور اسلام کو بطور دین پسند کر لیا تھا، رسول اللہ ﷺ پڑوسی ممالک اور قوموں کے بادشاہوں اور حکام کو خطوط لکھ کر انہیں اسلام کی دعوت دے چکے تھی اور روم کی سرحدوں پر تبوک اور مؤتہ کے غزوات ہو چکے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے فتوحات کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے عراق کو فتح کیا جہاں عیسائی، مزدکی اور آتش پرست مجوسیوں کی مخلوط آبادی تھی، جن میں عربی بھی تھے اور فارسی بھی۔ پھر فارس (ایران) فتح ہوا جہاں عجمی لوگ آباد تھے اور کچھ رومی اور یہودی بھی بستے تھے، اور وہاں ایرانی قوانین رائج تھے۔ اس کے بعد شام فتح ہوا جو روم کا حصہ تھا اور لوگ رومی ثقافت و تہذیب کے تھے اور مذہباً عیسائی تھے، اِن میں بعض شامی کچھ آرمینی اور کچھ یہودی تھے جبکہ نسلاً یہ لوگ عربی اور رومی تھے۔ پھر مصر فتح ہوا جہاں مصریوں کے ساتھ کچھ یہودی اور رومی بھی آباد تھے۔ اس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شمالی افریقہ کی طرف ہوا جو رومی اقتدار کے تحت تھا اور وہاں بربر نسل آباد تھی۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد اُموی خلافت کا دور آیا تو اُنہوں نے سندھ، خوارزم اور سمرقند فتح کیے اور انہیں اسلامی ریاست کا حصہ بنایا، پھر اندلس فتح ہو کر اسی

ریاست کا صوبہ بن گیا۔ یہ تمام علاقے اپنی قوموں، زبانوں اور مذہبوں کے لحاظ سے، اپنی ثقافت، عادات اور قوانین کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے، اُن کی سوچ وفکر اور اُن کا نفسیاتی میلان ایک دوسرے سے جدا تھا۔ لہٰذا اِن مختلف قوموں اور نسلوں کا آپس میں مل کر ایک واحد امت میں شامل ہونا جس کا ایک دین، ایک زبان، ایک تہذیب اور ایک ہی قانونی نظام تھا، فی الحقیقت نہایت دشوار اور مشکل عمل تھا جس میں کامیابی حاصل کرنا ایک غیر معمولی اور عظیم امر تھا، جو صرف اسلام کے ذریعے اور اسلامی ریاست ہی میں ممکن ہوا۔ اِن مختلف قوموں نے جب اسلام کو دیکھا، اس کے جھنڈے تلے آئے اور اُن پر اسلامی ریاست کی حکمرانی قائم ہوئی تو یہ لوگ مسلمان ہو گئے اور ایک امت یعنی امتِ مسلمہ کا حصہ بن گئے۔ یہ زبردست کارنامہ اسلام کی حکمرانی کے سبب اور اُن کے اس عقیدۂ اسلامی پر ایمان لانے کے باعث ممکن ہوا۔ ان مختلف اقوام کا ایک امت میں ڈھل پانا متعدد امور کے باعث ہوا، جن میں سے یہ چار سب سے اہم ہیں:

(1) اسلام کی تعلیمات۔
(2) فاتح مسلمانوں کا مفتوح عوام سے رہن سہن اور تمام امورِ حیات میں گہرا ربط اور میل جول۔
(3) مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کا گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو جانا۔
(4) اُن کی زندگیوں میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلی اور اَبتر حالت سے بہتر حالت کی طرف منتقلی۔

جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے، تو یہ تعلیمات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور ہدایت کو جہاں جہاں ممکن ہو عام کیا جائے، جس کے لیے جہاد اور ممالک کو فتح کرنا ضروری ہے تاکہ لوگ اسلام کو سمجھ سکیں اور اس کے احکام اور اُن کی حقیقت کو پرکھ سکیں۔ یہ تعلیمات تقاضا کرتی ہیں کہ یہ اختیار لوگوں پر چھوڑ دیا جائے کہ اگر وہ پسند کریں تو دینِ اسلام کے ماننے والے بن جائیں اور اگر نہیں، تو وہ اپنے ہی مذہب پر باقی رہیں۔ اس بات پر اکتفاء کیا جاتا ہے کہ وہ معاملات اور عقوبات میں اسلامی احکامات کے تابع ہوں تاکہ

عوام کے معاملات کی دیکھ بھال اور مشکلات کا علاج ایک ہی نظام کے ذریعے ہو، جس کے نتیجے میں ان کے اعمال میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے، اور غیر مسلم بھی یہ محسوس کریں کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح ایک ہی معاشرے کا حصہ ہیں اور اُن پر یکساں نظام نافذ ہے اور انہیں سکون واطمینان میسر ہو اور وہ ریاست کے جھنڈے تلے آباد رہیں۔

اسلام کی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ مفتوح قوم سے رنگ، نسل، قبیلے یا مذہب سے قطعِ نظر صرف بحیثیتِ انسان سلوک کیا جائے، لہٰذا احکامات کا نفاذ ہر ایک پر یکساں ہوتا ہے اور اس میں کسی کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (المائدہ: 8)

''کسی قوم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کر دے، عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے''

لہٰذا اسلامی ریاست میں تمام انسان حکومت اور عدالت کے سامنے یکساں ہیں۔ چنانچہ جب ایک حاکم عوام کے امور کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اُن پر حکومت کرتا ہے اور ایک قاضی جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے تو وہ انہیں صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ انسان ہیں جن کے امور کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے یا جن کے مابین فیصلہ درکار ہے۔ اسلام کے نظامِ حکومت کا تقاضا ہے کہ ریاست کے تمام حصوں سے یکساں سلوک ہو اور ریاست کی ہر ولایہ (صوبے) کی ضروریات ریاستی بیت المال سے پوری کی جائیں، خواہ اُس ولایہ سے حاصل شدہ اموال ومحصولات اُس کی ضروریات کیلئے کافی ہوں یا نہیں اور خواہ اُس ولایہ سے اموال کم آ رہے ہوں یا زیادہ۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ تمام ولایہ سے حاصل ہونے والے اموال ایک متحدہ مالی نظام کے تحت بیت المال میں جمع کیے جائیں۔ اس طرح یہ مفتوح ممالک ایک ہی ریاست کی ولایات بن جاتے ہیں اور اسلام کی حکمرانی انہیں لازمی طور پر ایک ہی ریاست میں ڈھال دیتی ہے۔

ان تمام نسلوں اور قوموں کے اسلام قبول کرنے اور ایک امت کی لڑی میں پروئے جانے میں سب سے اہم کردار فاتح مسلمانوں کا ان اقوام کے ساتھ میل جول اور رہن سہن تھا۔ مسلمان ممالک فتح کر کے وہیں آباد ہو گئے اور ان ممالک کے لوگوں کو اسلام اور اسلامی ثقافت سے بہرہ ور کیا۔ اِن ممالک میں اب فاتح اور مفتوح قوم ساتھ ساتھ رہتی تھیں اور وہ زندگی کے تمام معاملات میں اکٹھے تھے اور اُن پر ایک ہی نظام نافذ ہوتا تھا، اب یہ فاتح اور مفتوح دو جدا گروہ نہیں تھے، نہ ہی ایک غالب اور دوسرا مغلوب تھا بلکہ یہ سب ریاست کی رعیت تھے اور ان کے افراد زندگی کے تمام معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ اِن مفتوح اقوام نے ایسے حکمران پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے جن کی نظر میں یہ مفتوح عوام اُن کے برابر تھے، وہ اِن مفتوح عوام کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ چنانچہ اِن حکمرانوں میں اُنہوں نے وہ اعلیٰ صفات پائیں کہ اِن لوگوں کو ان نئے حکمرانوں سے اور اُن کے دینِ اسلام سے لگاؤ ہو گیا۔ اِن حکمرانوں اور تمام مسلمانوں نے مفتوح عوام کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے استوار کیئے، اُن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا رکھا اور یہ اختلاط اِن مفتوح عوام کے اسلام میں داخل ہونے کا اہم محرک بنا۔ اِن لوگوں نے حکمرانوں میں اسلام کے اثرات کا مشاہدہ کیا اور احکام کے نفاذ میں اسلام کا نور دیکھا اور اس طرح یہ مختلف اور متضاد اقوام ایک واحد امت کے سانچے میں ڈھل گئیں۔

لوگوں کا فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا کسی مخصوص علاقے یا کسی دَور تک محدود نہ تھا، بلکہ ہر جگہ کے لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے، یہاں تک کہ اُن ملکوں کی ایک بڑی اکثریت اسلام کے دائرے میں آ گئی اب اسلام محض فاتح قوم کا دین نہیں رہ گیا تھا، بلکہ مفتوح قوم بھی اسی کی ماننے والی بن گئی تھی اور یہ سب مل کر ایک امت بن گئے تھے۔

جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے اُن کی زندگیوں میں اسلام کی بدولت ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کی فکری سطح کو بلند کیا۔ اسلامی عقیدہ اُن کی فکر

اورسوچ کا معیاراور پیمانہ (فکری قاعدہ) بن گیا، جس کے ذریعے وہ لوگ اپنے افکار کو جانچتے تھے، اسی پیمانے سے وہ اپنے افکار کے صحیح یا غلط ہونے کو طے کرتے تھے۔ پس اُن کا ایمان جذباتیت پر مبنی کوئی عقیدہ نہیں تھا بلکہ یہ شعوری ایمان بن گیا۔ وہ اب بُت پرستی، آتش پرسی اور تثلیث وغیرہ جوسوچ کے اُتھلے پن اور فکر کی گراوٹ سے پیدا ہوتی ہے، کی بجائے اللہ ﷻ کی عبادت کرنے لگے جو روشن فکری اور وسعت نظری کا تقاضا کرتی ہے۔ اُنہیں اس زندگی کے بعد والی زندگی کا یقین ہوا، اور وہ اُخروی زندگی پر اسی طرح یقین رکھتے تھے جیسا کہ اللہ عزوجل کی کتاب اور آپ ﷺ کی سنت پر رکھتے تھے، اور آخرت کی جزا و سزا اُن پر واضح تھی اور وہ یہ تصور کرنے لگے کہ آنے والی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ اس بنا پر ان کے لیے اس زندگی کے حقیقی معانی اور قیمت کا تعین ہوا کہ زندگی کا یہ سفر آئندہ کی بہتر اور ہمیشہ رہنے والی زندگی تک پہنچاتا ہے اور یہ زندگی آنے والی ابدی زندگی کیلئے تیاری کی مہلت ہے۔ انھوں نے موجودہ زندگی کو ترک نہیں کیا بلکہ اللہ نے جو طیب رزق مہیا کیا ہے، اور جو نعمتیں اپنے بندوں کیلئے بنائی ہیں اور جو اسباب رکھے ہیں، انہیں استعمال کیا۔ اس طرح اُنہوں نے زندگی سے متعلق صحیح پیمانوں اور حقیقی تصویر کو اختیار کیا، جن کے مطابق اس زندگی کا مقصد محض منفعت نہیں تھا، کہ مادی فائدہ ہی ہر عمل کیلئے انسان میں تحریک پیدا کرتا ہے، چنانچہ اس فاسد نظام میں نفع ہی ہر عمل کا مقصد ہوتا ہے اور مفاد حاصل کرنے کیلئے ہی اعمال انجام دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اسلام کو قبول کرنے کے بعد اُن کی زندگیوں میں اعمال کا پیمانہ حلال و حرام ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی اعمال کے لیے راہنمائی بن گئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہر عمل کا مقصد بن گئی۔ اور اعمال کی قیمت ہی اعمال کے سرانجام دینے کا مقصد بن گئی جو یا تو روحانی ہوتی جب اعمال کا تعلق عبادات سے ہوتا جیسے نماز یا جہاد، یا یہ قیمت مادی ہوتی جب معاملہ تجارت اور خرید و فروخت وغیرہ کا ہوتا، یا یہ قیمت اخلاقی ہوتی خواہ یہ امانت داری ہو یا رحم دلی اور یا یہ قیمت انسانی ہوتی جب معاملہ کسی انسان کی مدد کا ہوتا۔ چنانچہ وہ ہر عمل میں اُس کی مقصود قیمت پر نظر رکھتے اور اُن میں تمیز کرتے تھے، اس طرح زندگی سے متعلق اُن کا تصور اُن کی پچھلی زندگی

سے بدل کر بالکل مختلف ہوگیا۔ چنانچہ اب زندگی کی حقیقی تصویر اُن کے سامنے تھی جس میں اعمال کا معیار اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی یعنی حلال وحرام تھے۔

اسلام نے اِن لوگوں کو خوشی کا صحیح مفہوم متعارف کرایا۔ اسلام کو قبول کرنے سے قبل وہ جسم کی بھوک اور خواہشات کو پورا کرنے کو ہی خوشی سمجھتے تھے، اب انہوں نے محسوس کرلیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہی سچی خوشی ہے، کیونکہ سعادت یا خوشی دائمی اطمینان کا نام ہے جو محض لذتوں اور شہوتوں سے حاصل نہیں کی جاسکتی، چنانچہ وہ جان گئے کہ خوشی صرف اللہ کی رضا سے ہی ملتی ہے۔

اس طرح اسلام نے اِن اقوام کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا اور زندگی اور اعمال کے متعلق ان کا نقطۂ نظر تبدیل ہوگیا۔ اُن کی نظر میں اشیاء کی ترجیحات بدل گئیں، بعض اشیاء ترجیح میں اوپر چلی گئیں تو بعض اشیاء کی اہمیت میں کمی آگئی۔ پہلے زندگی کا مرتبہ ترجیحات میں عقیدے سے بلند تھا تاہم اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کی زندگیوں میں انقلاب آیا اور عقیدہ ترجیحات میں زندگی سے بلند تر ہوگیا، لہٰذا اب مسلمان زندگی کو اسلام کی راہ میں لگانے لگا کیونکہ اسلام کی قیمت زندگی سے بلند تر تھی اور اب اُس کیلئے اسلام کی خاطر مصائب اور مشقتیں جھیلنا آسان ہوگیا۔ زندگی میں اشیاء کی قیمت اور اُن کی ترجیحات وہ ہوگئیں تھیں جس کی وہ اشیاء لائق ہیں۔ چنانچہ زندگی اب باوقار بن چکی تھی اور مسلمان دائمی خوشی محسوس کر رہا تھا، اس نے سارے عالم کے سامنے زندگی کا ایک ہی نصب العین پیش کیا یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا، جو کہ تبدیل نہیں ہوتا تھا۔ اب تک متعدد اور بار بار تبدیل ہونے والے نصب العین ان اقوام کی جستجو کا محور رہے تھے جو بدل کر صرف واحد مستحکم نصب العین ہوگیا تھا کہ سب کا مقصد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا ہے۔ زندگی کے نصب العین میں تغیر آنے سے جہاں اشیاء کی ترجیحات متغیر ہوئیں وہیں زندگی کی اقدار میں حیرت انگیز انقلاب آیا۔ اسلام سے قبل ذاتی شجاعت، اعلیٰ ظرفی، قبائلی تعصب، اپنے نسب اور دولت پر تفاخر، اسراف کی حد تک فراخ دلی، اپنی قوم یا قبیلے سے وفاداری، انتقام میں شدت اور سنگدلی وغیرہ فضیلت واقدار کے لیے بنیاد سمجھی جاتی تھیں۔ اسلام آیا تو اُس نے افضلیت کے یہ معیار نہیں رکھے اور نہ ہی اِنہیں بلاتعین

چھوڑ دیا، بلکہ اِن تمام صفات کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع کر دیا، نہ کہ ان صفات کو محض صفات ہونے کے ناطے اختیار کیا جائے، پس اِن میں جس چیز کا حکم اسلام میں ہو وہ اختیار کی جائے اور جس کا حکم نفی میں ہو وہ ترک کر دی جائے، نہ ہی انہیں اس بناء پر اختیار کیا جائے کہ یہ فائدے کا باعث ہیں، نہ یہ کہ انہیں فخر کا ذریعہ سمجھا جائے اور نہ ہی اس وجہ سے کہ ان عادتوں، تقالید، اور ورثے کو ہر قیمت پر باقی رکھا جائے۔ اسلام نے اللہ کی بندگی اور اللہ کے اوامر ونواہی کی پابندی کو فرض قرار دیا اور ذاتی، قبائلی یا قومی مفاد کو اسلام کے احکامات کے تابع بنانے کو فرض قرار دیا۔

یوں اسلام اُن ممالک کی اقوام کی عقلیت اور نفسیت دونوں پر اثر انداز ہوا اور اسے پچھلی حالت سے تبدیل کر کے ایک نئی شکل دے دی۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد اب اُن کی شخصیت پہلے کی سی نہیں رہ گئی تھی، اُن کے انسان، حیات اور کائنات کے بارے میں تصور میں تبدیلی رونما ہو گئی تھی، اور زندگی کی تمام تر اشیاء کے متعلق اُن کے پیمانے بدل چکے تھے۔ اب وہ سمجھنے لگے تھے کہ حیات کے خاص معانی ہیں یعنی اچھائی اور کمال حاصل کرنا، اور زندگی میں اُن کا اعلیٰ ترین نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول بن گیا تھا، یہی وہ خوشی اور سعادت تھی جس کی اب اُنہیں طلب رہ گئی، اب وہ ایک نئی مخلوق بن گئے تھے جو پہلے سے بالکل مختلف تھی۔

اِن چاروں عوامل کے سبب ان اقوام نے، جو اسلامی ریاست کے سائے تلے آئیں، اپنے ماضی سے ناطہ توڑ لیا۔ اور افکار اور زندگی کے بارے میں اِن کا نقطہ نظر ایک ہو گیا۔ ان کی فکر ایک تھی، نقطۂ نظر ایک تھا، وہ نظام جس سے اُن کے مسائل حل کئے جا رہے تھے وہ ایک تھا، زندگی کے متعلق ان کا مفاد بھی ایک ہی تھا یعنی اسلام کا طے کردہ مفاد، پس یہ ایک ناگزیر امر تھا کہ یہ مختلف اقوام پگھل کر اسلام کے سانچے میں ڈھل جائیں اور ایک امت بن جائیں یعنی امتِ مسلمہ۔

باب نمبر 38

اسلامی ریاست کے کمزور ہونے کے عوامل

اسلامی ریاست اسلام کی آئیڈیالوجی (مبداء) پر قائم ہوتی ہے۔ اسی میں ریاست کی قوت اور بقاء ہے، یہی آئیڈیالوجی ریاست کی ترقی کا سبب اور یہی اس کے وجود کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست، اسلام کے قوی ہونے کی وجہ سے مضبوط رہی اور اس نے دنیا کے وسیع وعریض علاقے ایک صدی سے کم عرصے میں فتح کر لئے گئے جبکہ اس وقت رابطے اور ترسیل کا ذریعہ صرف گھوڑے اور اونٹ تھے۔ اور باوجود یہ کہ نشر وترویج کا ذریعہ صرف زبان اور قلم تھے، تمام مفتوحہ ممالک اور اُن کی آبادیوں نے نہایت قلیل عرصے میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ سب تیز رفتاری سے ہو گیا کیونکہ اسلام ہی ریاست کی طاقت کا محرک تھا۔

اسلام کے دشمنوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اس اسلامی ریاست کو کمزور کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمانوں کے قلوب واذہان میں اسلام کا فہم مضبوط ہے اور اسلام کے احکامات مضبوطی سے نافذ کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ ایسے وسائل تلاش کئے جائیں جس سے مسلمانوں میں اسلام کے فہم اور اسلام کے احکامات کے نفاذ کو کمزور کیا جا سکے۔

اس غرض سے دشمنانِ اسلام نے متعدد وسائل استعمال کئے، بعض کا تعلق شرعی نصوص سے تھا، کچھ اِن نصوص کی زبان یعنی عربی سے متعلق تھے اور بعض وسائل احکامات کے زندگی کے

میدانِ عمل میں نفاذ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتداء میں رسول اللہ کی احادیث میں جھوٹی باتیں گھڑ کر داخل کی گئیں، جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائیں تھیں، اِن جھوٹی احادیث میں بیان کردہ باتیں اسلام سے نہ تھیں اور ان میں بیان کردہ مفہوم وتصورات اسلام کے تصورات سے متضاد تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ان جھوٹی احادیث کو قبول کرلیں اور انہیں اپنالیں اور اس طرح اسلام سے دور ہو جائیں۔ چنانچہ دشمنانِ اسلام نے بے شمار احادیث گھڑیں اور اِنہیں لوگوں میں عام کردیا۔ لیکن مسلمانوں نے اسے بھانپ لیا اور اس سازش سے نمٹنے کیلئے تیار ہوگئے۔ پس علماء اور احادیث کے راوی اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے احادیث جمع کیں، راویوں کے نام، اُن کی صفات اور تاریخ ترتیب دی اور صحیح، ضعیف اور موضوع (جھوٹی) احادیث کو چھانٹ کر الگ کردیا، اس طرح احادیث کی حفاظت ہوئی۔ اُن احادیث کو جو تبع تابعین کی روایت تابعین سے اور اُن کی صحابہ سے تھیں، اُنہیں قبول کیا اور اس کے بعد کی روایات کو رد کیا اور ہر راوی کی پہچان کی گئی جس سے ایک مسلمان کیلئے یہ ممکن ہوا کہ وہ صحیح، ضعیف اور موضوع احادیث میں اُن کی سند اور متن کی معرفت سے تمیز کرسکے۔ اسلامی ریاست نے ایسی احادیث گھڑنے والوں سے سختی سے نبٹا اور ان میں سے ایک بڑی تعداد کو رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گھڑنے کے جرم میں قتل کی سزا بھی دی گئی۔ چنانچہ اس سازش سے اسلام یا اسلامی ریاست پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں پڑا۔ پھر دشمنوں نے عربی زبان پر حملہ کیا کیونکہ اسی زبان میں دین آیا تھا، سازش یہ تھی کہ عربی کو اسلام سے علیحدہ کردیا جائے۔ شروع میں وہ اس میں ناکام ہوئے کیونکہ جب مسلمان فتوحات کیلئے آگے بڑھتے تو وہ قرآن، حدیث اور عربی زبان کو وہاں لے کر جاتے اور وہ مفتوحہ ممالک کے لوگوں کو یہ زبان اسی طرح سکھاتے تھے جیسے وہ انہیں قرآن اور احادیث سکھاتے تھے۔ چنانچہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور انہوں نے عربی زبان سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کی، حتیٰ کہ غیر عرب لوگوں میں ائمہ کرام اور مجتہدین، مثلاً امام ابوحنیفہؒ، بلند معیار کے شعراء جیسے بشار بن بُرد اور فصیح اللسان ادیب جیسے المقفع پیدا ہوئے۔ مسلمان عربی زبان پر بہت توجہ دیتے تھے اور اس کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امام شافعی نے قرآنِ حکیم اور نماز کو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں پڑھنے کو

ممنوع قرار دیا۔ جن لوگوں نے قرآن کے ترجمہ کی اجازت بھی دی جیسے امام ابوحنیفہ تو انہوں نے بھی ترجمہ کو کبھی بھی اصل قرآن نہیں کہا۔ اس طرح عربی کی اہمیت پر خاطر خواہ توجہ دینے سے اس کی وہ اہمیت برقرار رہی جو اُس کا حق و مرتبہ ہے کیونکہ عربی اسلام کا جوہری جزو ہے اور اجتہاد کے لیے درکار شرائط میں سے ایک شرط ہے۔ اسلام کے مصادر سے اسلام کے فہم کو حاصل کرنا اور احکامِ شرعیہ کا استنباط عربی زبان کے فہم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ البتہ چھٹی صدی ہجری کے اختتام سے عربی کو وہ توجہ و اہمیت نہیں دی گئی کیونکہ ایسے لوگ حاکم بن گئے جو عربی زبان کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے عربی زبان سے غفلت برتی جس کے سبب اجتہاد ختم ہو گیا اور ان عربی زبان سے نابلد لوگوں کے لیے احکامات اخذ کرنا ممکن نہ رہا۔ اس طرح عربی زبان اسلام سے جدا ہو گئی۔ چنانچہ احکام شرعیہ کا فہم پراگندا ہوا اور نتیجتاً شرعی احکامات کا نفاذ بھی متاثر ہوا اور یہ امر ریاست پر بہت اثر انداز ہوا اور اُسے کمزور کرتا چلا گیا۔ اسی ضعف کے سبب نئے مسائل کا فہم کمزور ہو گیا، لہٰذا نئے مسائل و مشکلات کو حل نہیں کیا جا سکتا تھا یا انہیں حل کرنے کیلئے غیر صحیح طریقہ اختیار کیا گیا۔ اب ریاست کے سامنے ایسے نئے مسائل کا ایک انبار لگتا گیا، اور ریاست ان مسائل میں گھر گئی اور کمزور ہوتی چلی گئی۔

یہ بحث تو اسلام کے نصوص اور عربی زبان سے متعلق تھی کہ جس کے ذریعے اسلام کو سمجھا جاتا ہے۔ رہی بات اسلام کو زندگی کے میدان میں نافذ کرنے کی، تو ابتدائی صدیوں میں یہ کوشش کی گئی کہ اسلام کو ہندوستانی فلسفے سے ہم آہنگ کیا جائے۔ چنانچہ دنیا میں زہد و پاکیزگی اور آخرت کی طلب کی تفسیر دنیاوی لذتوں اور نعمتوں سے پرہیز کرنا اور اپنے جسم کو شدید اذیتیں پہنچانا کی گئی۔ کئی لوگ اس فلسفے سے متاثر ہوئے اور اُنہوں نے زندگی سے خوشی کی چیزوں کو نکال دیا اور اپنے آپ کو حجروں میں بند کر لیا۔ ایسے لوگ نہ صرف معاشرے کے میدانِ عمل سے خارج ہو گئے بلکہ وہ ریاست کیلئے بھی میسر نہیں رہے۔ اس طرح امت کے بیٹوں کی بڑی تعداد جو اسلام کی دعوت کی ذمہ داری کو اٹھا سکتی تھی، اپنے جسموں کو تکلیفیں دینے میں لگ کر ناکارہ ہو گئی۔

پھر اسلامی علاقوں پر مغربی ثقافت کی یلغار شروع ہوگئی۔ مغرب کی تہذیب اسلامی تہذیب کی ضد تھی، لیکن مغرب نے مسلمانوں کو اس دھوکے میں ڈالا کہ یہ تہذیب اسلام سے ہی لی گئی ہے جب کہ وہ ایک ایسے نظاموں کی پیداوار تھی جو اسلام کے نظام سے متضاد تھا۔ پھر وہ ایسے قوانین لائے جو اسلامی شریعت سے ٹکراتے تھے جبکہ مسلمانوں کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ قوانین اسلام کی ضد نہیں ہیں۔ ان قوانین نے مسلمانوں پر بہت گہرا اثر مرتب کیا اور یوں مغربی تہذیب اُن پر حاوی ہوگئی۔ مسلمان اب زندگی کو مغربی نقطہ نظر سے دیکھنے لگے تھے یعنی مسلمان منفعت کو اعمال کی بنیاد تصور کرنے لگے۔ چنانچہ خلافتِ عثمانیہ کے دور میں چند مغربی قوانین کو بھی اپنا لیا گیا، سود کی تاویل کی گئی اور بینک کھولے گئے جس نے مغربی قوانین کو لینے کی راہ ہموار کی۔ شرعی حدود معطل کر کے اس کی جگہ سزاؤں کے مغربی قوانین اپنائے گئے۔ اِن غیر اسلامی قوانین و تہذیب کا امت پر تباہ کن اثر پڑا اگرچہ اِن تمام افعال کے جواز کیلئے فتوے لیے گئے تھے، پس امت میں ایمانی حرارت ماند پڑتی گئی۔ ریاست درست راستے سے بھٹک گئی تھی اور نتیجتاً ریاست ضعف و اضمحلال کے گڑھے میں پہنچ گئی۔

یہ تو اسلام کے فہم کے بارے میں تھا، جہاں تک اسلام کے نفاذ کی بات ہے تو کافی عوامل کی وجہ سے شریعت کو برے طریقے سے نافذ کیا جانے لگا تھا۔ ان میں سے ایک وجہ سیاسی جماعتیں تھیں کیونکہ ہر سیاسی جماعت صرف اپنا نقطہ نظر کو لازماً مسلط کرنا چاہتی تھی اور اتھارٹی اور حکمرانی کو حاصل کر کے اپنی رائے کو مسلط کرنے کے لیے عسکری ذرائع اپنا رہی تھیں۔ پس عباسی کھڑے ہوئے اور انہوں نے فارس اور عراق پر قبضہ کیا تاکہ تمام ریاست پر حاوی ہونے کیلئے اِن علاقوں کو نقطہ آغاز بنائیں اور حکومت کو خاندانِ بنو ہاشم میں لے آئیں۔ ان کے بعد فاطمی آئے اور و لا یہ مصر پر قبضہ کر کے وہاں سے پوری ریاست پر نظریں جمالیں تاکہ وہ اپنے اسماعیلی افکار، جو خلافِ شریعت تھے، کی بنیاد پر حکمرانی کو قائم کرسکیں۔ ان سے ایک طرف تو اسلامی ریاست کو جھٹکا لگا اور فتوحات کا سلسلہ کسی حد تک معطل ہوگیا اور ریاست اندرونی معاملات میں الجھ گئی،

تو دوسری جانب اس کے باعث اقتدار کا دوسرا مرکز وجود میں آیا اور مسلمان دو ریاستوں میں تقسیم ہو گئے جبکہ مسلمانوں کیلئے یہ جائز ہی نہیں کہ اُن کی ایک سے زیادہ ریاست ہو۔ اس کے باعث ریاست میں کمزوری آئی اور فتوحات اور دعوت کو پہنچانے کا عمل بھی تھم گیا۔ سیاسی جماعتوں کا یہ طریقہ کار دراصل اموی خلفاء کے اقدام کا نتیجہ تھا جنہوں نے ولی عہدی کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ ایک شخص ولی عہد بنا دیا جاتا اور پھر اُسی کی بیعت ہوتی تھی۔ اس کے باعث کسی اور شخص کے لیے حکمرانی تک پہنچنے کے لیے بیعت کا انتظار کرنے اور بیعت پر اعتماد کرنے میں کوئی امید باقی نہ رہی۔ پس آغاز میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا اور پھر اُس کیلئے بیعت لی، اسکے بعد آنے والے خلفاء نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا کہ وہ ایک شخص کو ولی عہد نامزد کر دیتے اور پھر اُس پر عوام بیعت کر لیتے تھے۔ عوام صرف اُسی شخص کو بیعت دے سکتے تھے جسے خلیفہ نے نامزد کر کے ولی عہد بنا دیا ہوتا تھا، شاذ و نادر ہی کبھی عوام اس کے خلاف بیعت کر پائے۔ پس سیاسی جماعتوں نے قوت کے زور پر اقتدار حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ شروع میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا تھا اور ان کے لیے لوگوں سے عہد لیا تھا، تاہم اس طریقہٗ کار کے غلط نفاذ نے ان نتائج کو جنم دیا۔ کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کرنے سے پہلے مسلمانوں سے مشورہ کیا تھا کہ وہ کس کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں، جس کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ عوام کی رائے دو اشخاص تک محدود ہے یعنی عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ کے لیے عہد لیا گیا کیونکہ وہ منتخب ہوئے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہی اُنہیں بیعت دی گئی۔ یہ اسلوب عین شرعی تھا لیکن بعد کے خلفاء نے جب کسی کے لیے عہد لیا تو انہوں نے اس طریقے کو غلط طور پر نافذ کیا پس انہوں اپنے ہی بیٹے، بھائی، یا کسی خاندان والے کو ولی عہد نامزد کیا اور بعض اوقات تو ایک سے زیادہ شخص کو بھی نامزد کر دیا گیا۔ اس طرح حکمِ شرعی کا غلط نفاذ مسلمانوں کو اپنی پسند کے شخص کو بیعت دینے کے حق سے محروم کرنے کا سبب بنا اور ریاست کی کمزوری کا باعث بنا۔ البتہ یہ کمزوری اُس دور میں ظاہر نہ ہوئی جب تک ریاست فی نفسہٖ مضبوط تھی، لیکن جب اُس کی طاقت کمزور پڑی تو اس کے اثرات بھی ظاہر ہو گئے۔

اور معاملہ صرف خلیفہ کی بیعت میں بے ترتیبی تک ہی محدود نہ رہا، بلکہ والیوں کا معاملہ بھی بگاڑ کا شکار ہوا۔ عبدالرحمٰن الداخلی جب اندلس میں خود مختار ہوگیا تو عباسی خلفاء کی اس معاملے میں خاموشی نے ریاست کے ایک بڑے حصہ کو جدا کر دیا۔ پھر اس کے بعد آنے والے والی بھی اسی طرز پر قائم رہے اور بعض نے تو خود کیلئے امیر المؤمنین کا لقب تک اختیار کر لیا۔ حالانکہ اسپین (اندلس) اسلامی ریاست سے مکمل طور پر منقطع نہیں تھا اور وہاں کے مسلمان باقی مسلمانوں سے جڑے ہوئے تھے، لیکن بہرحال اسپین کا انتظام علیحدہ ہوگیا تھا۔ ریاست میں کمزوری پھیلتی گئی اور کفار کیلئے اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان ہوگیا، جبکہ ریاست اُس وقت اپنی طاقت کے عروج پر تھی۔ اور یہ ریاست سقوطِ اندلس کو نہ روک سکی، کیونکہ اندلس کا انتظامی ڈھانچہ اس سے الگ ہو چکا تھا۔ یہ صورتِ حال تو ریاست کے مغربی حصہ کی تھی جبکہ مشرقی حصوں میں والیوں کو ولایتِ عامہ دیئے جانے کے باعث وسیع اختیار حاصل تھے، جس نے اُن میں خودمختاری کے جذبات کو ابھارا۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنا داخلی انتظام علیحدہ کر لیا، جبکہ خلیفہ نے اس پر بھی سکوت اختیار کیے رکھا اور محض اس پر اکتفاء کر لیا کہ مسجدوں کے منبروں سے اُس کے لئے دعائیں ہونا جاری تھا، احکامات اُس کے نام سے صادر ہوتے تھے، سکہ جات پر اُس کے نام کندہ کرائے جا رہے تھے اور اسے خراج کی رقم بھیجی جاتی تھی۔ یہ ولایات اپنی خودمختاری کے سبب علیحدہ ریاستوں کی مانند ہوگئی تھیں۔ یہی صورتِ حال سلجوقی، حمدانیوں اور دیگر ولایت کی تھی۔ چنانچہ یہ معاملہ بھی ریاست کو کمزور کرنے کا سبب بنا۔ چنانچہ یہ تمام عوامل ریاست کو کمزور کرنے کا سبب بنے، یہاں تک کہ عثمانیوں نے خلافت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اُنہوں نے ریاست کے بیشتر حصوں کو متحد کیا، فتوحات اور یورپ میں اسلام کی دعوت کے سلسلے کو جاری کیا۔ اِن کاروائیوں کی بنیاد اسلام کا بہتر فہم یا اُن کا مکمل نفاذ و تطبیق نہیں تھی بلکہ یہ صرف عثمانی سلسلے کے شروع کے چند خلفاء کی قوتِ ایمانی اور فوجی طاقت کی بنا پر تھا، لہٰذا اِن فتوحات کے نتائج ہرگز وہ نہ تھے جو اسلامی دور کے آغاز کی فتوحات سے برآمد ہوئے تھے۔ اور امتِ مسلمہ اپنے تمام پہلوؤں میں مضبوط نہیں تھی، چنانچہ ریاست ماند پڑتی گئی یہاں تک کہ اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ اسلامی ریاست کا اختتام اِن عوامل اور

دشمنانِ اسلام کی کئی سازشوں کا نتیجہ تھا، تاہم ریاست کی کمزوری کہ جو ریاست کے انہدام کا باعث بنی ،کا خلاصہ ان دو وجوہات میں کیا جا سکتا ہے: امت کی اسلام کی سمجھ میں کمزوری اور اسلامی احکامات کا غلط نفاذ۔ لہٰذا جس چیز سے ریاستِ اسلام دوبارہ وجود میں آ سکتی ہے وہ اسلام کا ٹھیک ٹھیک فہم ہے اور وہ چیز جو ریاست کی قوت کو برقرار رکھے گی ،وہ اسلام کے درست فہم کا امت میں نسل در نسل برقرار رہنا، اسلام کے احکامات کو اندرونی طور پر ٹھیک ٹھیک نافذ کرنا اور اور اسلام کی دعوت کو بیرونِ ریاست لے کر جانا ہے۔

اسلامی ریاست کا بکھرنا

ریاست میں فکری کمزوری کا آغاز پانچویں صدی ہجری سے ہو گیا تھا جب بعض علماء نے اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کی آواز لگائی تھی، یہ پکار اسلامی ریاست کے زوال کی گھنٹی تھی۔ گو کہ اس کے بعد بھی مجتہدین آئے لیکن فکری انحطاط نے جڑیں پکڑ لی تھیں اور اس سے ریاستی ڈھانچہ متاثر ہو چکا تھا، ٹوٹ پھوٹ کا عمل جگہ جگہ دراڑیں ڈال رہا تھا اور ناتوانی غالب آ رہی تھی۔ پھر جب عیسائیوں کے ساتھ صلیبی جنگوں کا دور آیا تو ریاست اس قابل نہ تھی کہ صلیبیوں کا مقابلہ کر سکے لیکن اسے صلیبیوں سے قریباً دو صدیوں تک برسرِ پیکار رہنا پڑا۔ ابتداء میں کامیابی صلیبیوں کا مقدر رہی اور وہ ریاست کے ایک حصے پر قابض بھی ہو گئے۔ اسلامی ریاست نے اُس حصے کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے کوشش کی اور اس دوران حکمرانی مملوکوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ مملوکوں نے عربی زبان، فکری مفہوم وتصورات اور قانونی تشریع کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور اس میں کوتاہی برتی، اجتہاد کا باب بند ہوا اور اسلامی فہم میں کمزوری آنے لگی۔ علماء پر تقلید کو واجب قرار دے دیا گیا اور ریاست ہر طرف سے لاغر ہونے لگی۔ اس کے بعد تاتاریوں نے اسلامی ریاست پر تابڑ توڑ حملے کیے، جن سے اور دراڑیں پڑیں اور ریاست مزید کمزور ہو گئی۔ البتہ یہ کمزوری داخلی نوعیت کی تھی، خارجی طور پر ریاست کی ساکھ برقرار تھی۔ اب بھی یہ ریاست دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور اس کے سب سے بڑے اور اہم حصوں پر محیط تھی اور دشمن اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔

نویں صدی ہجری یعنی 15 ویں صدی عیسوی میں خلافتِ عثمانیہ نے مسلم دنیا کے بیشتر علاقوں کو اپنے اقتدار میں دوبارہ شامل کرلیا تھا، جبکہ دسویں صدی ہجری بمطابق سولھویں صدی عیسوی میں اسلامی ریاست کی سرحدوں میں مزید پھیلاؤ ہوا اور عثمانیوں نے اپنی فوجی قوت میں بہت اضافہ کیا، ریاست کا اقتدار وسیع ہوا، افواج منظّم کی گئیں، حکومت شاندار تھی، فتوحات جاری تھیں، لیکن عربی زبان پر توجہ میں کوتاہی ہوتی رہی جبکہ اسلام کے صحیح فہم کیلئے عربی ناگزیر ہے اور اجتہاد کیلئے شرط ہے۔ اسلام پر بھی فکری اور تشریعی پہلوؤں سے توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں اِن دونوں پہلوؤں کی سطح میں گراوٹ واقع ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا گوکہ ریاست ظاہری طور پر قوی تھی لیکن اس کی مضبوطی کی اصل بنیادوں سے کوتاہی کے باعث اسکی قوت صرف اس کے ظاہر تک محدود ہوتی جارہی تھی، چنانچہ جب تک یہ ظاہری طاقت قائم رہی، اس کی حقیقی کمزوریاں نظروں سے اوجھل رہیں۔ اور جب مسلمان اپنی فکر، قانونی تشریع اور تہذیب کا موازنہ یورپ کے افکار، قانون اور تہذیب سے کرتے تو وہ اپنے آپ کو یورپ سے بہتر پاتے، لہٰذا وہ اپنی صورتِ حال پر مطمئن تھے۔ کیونکہ اس وقت یورپ گہرے اندھیروں میں پڑا تھا اور وہاں ہر طرف انتشار کی فضاء چھائی ہوئی تھی، یورپ نے ترقی کیلئے اُٹھنے کی کئی بار کوششیں کیں لیکن ہر بار ناکام رہا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان جب اپنے آپ کا یورپ سے موازنہ کرتے تو انہیں نظر آتا کہ ان کی حالت نسبتاً بہتر ہے، ان کا نظام صالح ہے اور ان کی تہذیب برتر ہے، وہ اپنی داخلی حالت سے غافل تھے پس وہ فکر کے ٹھہراؤ، تشریع کے جمود اور امت کی ٹوٹ پھوٹ کو نہ بھانپ سکے۔ مسلمانوں کا بلقان اور یورپ کے جنوب مشرقی حصوں کو اپنے قبضے میں لینا، یورپی ممالک میں ریاستِ عثمانیہ کی بطور اسلامی ریاست دھاک بیٹھ جانا کہ مسلم فوج ناقابلِ شکست ہے، یہ ایسے امور تھے جن کے باعث مسلمان اپنی صورتِ حال سے اندھے بنے رہے۔

اس کے بعد یورپ میں ''مسئلہ شرق'' (eastren question) اُٹھ کھڑا ہوا جس کا اُس وقت مفہوم یہ تھا کہ نویں صدی ہجری (15 ویں صدی عیسوی) میں محمد الفاتح کی قیادت

میں خلافتِ عثمانیہ کے بڑھتے ہوئے حملوں سے بچا جائے۔ یہ حملے سلطان محمد فاتح کے بعد آنے والے سلاطین کے دور میں گیارہویں صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہے۔ سلیمان القانونی کے دور میں یہ نہایت شدید ہو گئے، یہ شدت بارہویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) تک برقرار رہی۔ اس دور میں اپنی فعالیت کے باعث اسلامی ریاست مسلسل قوی رہی۔ مسلمانوں میں عقیدہ کی قوت موجود تھی اور زندگی کے بارے میں ان کے متعین مفہوم وتصورات تھے گو کہ یہ تصورات اب اُن کے ذہنوں میں اِتنے واضح نہیں رہے تھے، تاہم زندگی کے معاملات میں اسلام کے نظام جاری تھے گو کہ اُن کی تطبیق میں غلطیاں سرزد ہونے لگی تھیں، یہ سب ریاست کو تھامے ہوئے تھا اور ریاست کی قوت اور پوزیشن کو برقرار رکھے ہوئے تھا، دوسری طرف یورپ کا فکری اور تشریعی انتشار بھی ریاستِ خلافت کی اس صورتِ حال کو برقرار رکھنے میں مددگار تھا۔ طاقت کے ایسے عروج کے وقت یہ ممکن تھا کہ اسلام کے صحیح فہم کی طرف لوٹا جائے یعنی عربی زبان کے فروغ کی جانب توجہ مبذول کی جائے اور اجتہاد کی ترغیب دی جائے اور فکری وتشریعی پہلوؤں پر توجہ دے کر اُن میں بلندی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اور یوں ریاست کو مضبوط و مستحکم بنیاد فراہم ہو، جس کی بناء پر ریاست زبردست فتوحات کا آغاز کرتی اور اسلام کی دعوت کو سارے عالم تک پہنچاتی اور دنیا کے باقی حصوں کو بھی فتح کر پاتی اور یوں اپنے آپ کو بھی مضبوط تر کرتی اور اسلامی تہذیب کو سارے عالم میں عام کرتی اور انسانیت جس شر وفساد میں گھری ہوئی تھی، اسے اس سے نکالتی۔ البتہ ایسا نہیں ہوا۔ عربی زبان کو وہ فروغ نہیں دیا گیا جو ضروری تھا، سوائے اس کے کہ کچھ عرب لوگوں کو کچھ علمی اور تدریس کے منصب دے دیئے گئے جس سے نہ تو زبان کو فروغ ملا اور نہ ہی فکری بلندی پیدا ہو سکی۔ عربی زبان کے احیاء کے لیے ضروری تھا کہ اُسے ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دیا جاتا جیسا کہ شرعاً اسلامی ریاست کے لیے واجب ہے، لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور امت کی فکری اور فقہی سطح کو بلند کرنے کے لیے کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس طرح کی جو بھی کوششیں ہوئیں وہ بہت قلیل اور غلط ہونے کے سبب صورتحال میں کوئی سدھار نہ لاسکیں اور ریاست صحیح رخ

پر نہ آ سکی۔ بارہویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) کے اواخر میں صورتِ حال میں تبدیلی آئی اور ریاست کی اندرونی کمزوری اب نمایاں ہونا شروع ہوگئی، کیونکہ ریاستِ اسلامی کا ڈھانچہ اسلامی نظام کے بچے کچے حصے پر استوار تھا جس کا اب غلط نفاذ ہونے لگا تھا۔ یہ ڈھانچہ ایسے منتشر افکار پر قائم تھا جن میں کچھ تو اسلامی تھے اور کچھ وہ تھے جو اسلام کے نام پر اسلام میں داخل کیے گئے تھے۔ یہ حکمرانی عمومی طور پر اسلامی نظام کی حدود و قیود کے اندر اندر تھی نہ کہ یہ بذاتِ خود مکمل طور پر اور خالصتاً صرف اسلامی نظام کی حکومت تھی اور اس کا سبب اسلامی افکار کے متعلق غلط فہم، اسلامی نظام کا غلط نفاذ اور اجتہاد اور مجتہدین کا فقدان تھا۔

جب تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کے آتے آتے عالمی توازن ڈانواں ڈول ہو رہا تھا اور جہاں عالمِ اسلام کا پلڑا ہلکا ہو رہا تھا تو وہیں یورپ کا پلڑا بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ یورپ میں بیداری اور احیاء کا دور شروع ہو چکا تھا اور اُس کے آثار نظر آنے لگے تھے، اُدھر اسلامی ریاست میں اسلام کے احکامات کے غلط نفاذ اور مسلمانوں میں فکری جمود کے نتائج اب واضح ہو چکے تھے۔ انیسویں صدی کا سورج یورپ میں ایک فکری انقلاب لے کر آیا۔ اِس بڑی اور جامع تبدیلی کا محرک لکھاریوں، فلسفیوں اور دانشوروں کی کوششیں تھیں۔ یورپ میں ایک جامع تبدیلی رونما ہوئی جس کی وجہ وہ یورپی فکر تھی جو لوگوں کو بیدار کر رہی تھی۔ چنانچہ یورپ میں کئی تحریکات وجود میں آئیں جنہوں نے زندگی کے متعلق نقطۂ نظر کے بارے میں نئی آراء تک پہنچنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سب سے اہم امر سیاست، قانون سازی اور تمام نظام ہائے حیات میں تبدیلیوں کا رونما ہونا تھا۔ بادشاہت کا عفریت آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا اور اسکی جگہ ایک نیا جمہوری نظام وجود میں آیا جس کی بنیاد عوام کی حکومت اور قومی اقتدار اعلیٰ پر تھی۔ جس طرح حکومتی ڈھانچے کے اس پہلو نے یورپ کی بیداری میں کردار ادا کیا اسی طرح اُس صدی کے دوران یورپ میں برپا ہونے والا صنعتی انقلاب بھی صورتِ حال پر زبردست طریقے سے اثر انداز ہوا۔ اسی دور میں متعدد ایجادات اور دریافتیں ہوئیں۔ چنانچہ اس فکری اور مادّی ترقی نے یورپ کو مضبوط کرنے

میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اس مادی اور سائنسی ترقی نے بین الاقوامی سطح پر عالمِ اسلام کے مقابلے میں یورپ کے پلڑے کو بھاری کر دیا۔ اِن بنیادی تغیرات کے بعد اب اہلِ یورپ کیلئے ''مسئلۂ شرق'' کے معنی صرف دفاعی نہیں رہ گئے تھے کہ کس طرح خلافتِ عثمانیہ کے حملوں سے نمٹا جائے، بلکہ ان معانی میں تبدیلی آئی اور اب یہ معنی اقدامی ہو گئے تھے، اب اس سے مراد یہ تھی کہ آیا خلافتِ عثمانیہ کو باقی رکھا جائے یا اسے تقسیم کر دیا جائے؟ اس بارے میں یورپی ریاستوں کا نقطۂ نظر اپنے اپنے مفاد پر مبنی تھا، اور چونکہ سب کے مفاد مختلف تھے لہٰذا اس مسئلہ پر اُن کی آراء بھی علیحدہ علیحدہ تھیں۔ ''مسئلۂ شرق'' کے مفہوم میں اس تبدیلی کا واقع ہونا، یورپ کی زبردست فکری بلندی، سائنسی ترقی اور صنعتی انقلاب، نیز خلافتِ عثمانیہ کا فکری جمود، کمزوری اور ٹوٹ پھوٹ، یہ سب کافر ممالک اور اسلامی ریاست کے درمیان ایک بڑی سیاسی تبدیلی کا باعث بنے، جس میں اسلامی ریاست کا پلڑا ہلکا ہو گیا اور یورپ کا پلڑا حاوی ہو گیا۔

یورپ کی سیاسی حالت میں اس غیر معمولی تغیر کی وجہ یورپی دانشوروں کی کاوشیں تھیں جن کا ہدف زندگی کیلئے ایک نئے نظام تک پہنچنا تھا۔ اُنہوں نے زندگی کے متعلق ایک نیا نقطۂ نظر اختیار کیا تھا اور ایک مخصوص عقیدہ اپنایا تھا اور نظام کو اس عقیدہ پر استوار کیا تھا۔ اس امر نے اُن کی نظر میں اشیاء کے معانی اور قدریں تبدیل کر دیں، جس کے سبب اُن کی زندگیوں میں ایک غیر معمولی تبدیلی برپا ہوئی تھی، جس نے عظیم صنعتی انقلاب کو برپا کرنے میں مدد فراہم کی۔ اس کے برعکس عالمِ اسلام جس کی قیادت خلافتِ عثمانیہ کر رہی تھی، بجائے یہ کہ وہ اپنی حالت پر صحیح نظر سے غور کرتی اور اپنی آئیڈیالوجی کو گہری نظر اور باریک بینی سے دیکھتی، اپنے افکار کو چمکاتی اور اجتہاد کے احیاء کے ذریعے اپنے نئے مسائل کو اپنے عقیدے سے نکلے ہوئے نظام کے ذریعے حل کرتے ہوئے سائنسی اور صنعتی ترقی کی جانب گامزن ہوتی، وہ صرف افسوس اور حیرت کے ساتھ یورپ کی ترقی کو دیکھتی رہی اور حیرت کے عالم میں جامد کھڑی رہی۔ اس کے نتیجے میں ریاستِ عثمانیہ سائنسی اور صنعتی میدان میں پیچھے گرتے گرتے باقی یورپی ممالک سے پیچھے رہ گئی۔ ریاستِ عثمانیہ ایک

اسلامی ریاست تھی، اسلام ہی ریاست کا عقیدہ اوراس کا نظام تھا، اسلام کے افکار ہی اس ریاست کے افکار تھے اور زندگی سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر ہی ریاست کا نقطہ نظر تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اسلامی ریاست یورپ میں جنم لینے والے نئے افکار کو اپنی فکری اساس یعنی عقیدۂ اسلام سے جانچتی اور نئے پیدا شدہ مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتی اور پھر نئے مسائل اور افکار پر اسلامی نقطۂ نظر سے ہی صحیح اجتہاد کے ذریعے اپنا فیصلہ لیتی اور اسی کے ذریعے اُن کا صحیح یا فاسد ہونا طے کرتی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا! کیونکہ اُس اسلامی ریاست کے سامنے اسلامی افکار واضح نہ تھے اور اِن افکار کے متعین مفہوم نہیں تھے۔ کیونکہ اُن کے پاس اسلامی عقیدہ اُس بنیاد کی حیثیت سے نہیں تھا جس پر اُن کے افکار کی عمارت کھڑی ہو، بلکہ وہ محض روایتی طور پر عقیدہ کو اختیار کیے ہوئے تھے۔ لہٰذا جس بنیاد پر ریاست کھڑی تھی، یعنی اسلام کے افکار اور اسلام کا عقیدہ، وہ خود ریاستِ عثمانیہ کیلئے ہی غیر واضح یا مبہم تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اجتہاد کے نہ ہونے کی وجہ سے نظام بھی جامد تھا۔ پھر یہ کہ تہذیب جو زندگی سے متعلق تمام افکار اور تصورات کا مجموعہ ہوتی ہے، تو یہ مفہوم وتصورات ایک طرف تو اُن کیلئے واضح وشفاف نہ تھے تو دوسری طرف یہ تصورات ریاستی اعمال سے منسلک نہیں تھے۔ اس فکری انحطاط اور عدم بیداری کی وجہ سے اسلامی ریاست یورپ کے فکری اور صنعتی انقلاب کو حیرت زدہ اور مبہوت ہوکر دیکھتی رہی۔ وہ یہ فیصلہ بھی نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ یورپ کی تہذیب یا مادی کامیابیوں کو اپنائے یا چھوڑ دے! اور وہ یہ تمیز کرنے سے بھی قاصر تھی کہ ان سائنسی اور صنعتی ایجادات اور دریافتوں کو اختیار کر لینا جائز ہے جبکہ فلسفہ، جو زندگی کے متعلق نقطۂ نظر کا تعین کرتا ہے یا تہذیب جو زندگی کے متعلق تصورات کا مجموعہ ہوتی ہے اس کا اختیار کر لینا جائز نہیں۔ اپنی اس غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے عثمانی بے حس وحرکت کھڑے رہ گئے جبکہ یورپ آگے سے آگے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس تمام کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس اسلام کا صحیح فہم نہیں رہ گیا تھا، وہ اپنے اور یورپی افکار کے باہمی تناقض کو محسوس نہیں کر پا رہے تھے، اور سائنسی اور صنعتی ایجادات جنہیں اختیار کرنے کی طرف اسلام رغبت دلاتا ہے اور فلسفہ، تہذیب اور فکر کہ جنہیں اختیار کرنے سے اسلام روکتا ہے، کے مابین تمیز نہیں کر پا رہے تھے۔

عثمانیوں کے پاس اسلام کا صحیح فہم نہ تھا، اسی کج فہمی کی وجہ سے امت اور ریاست دونوں بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے بغیر یہ دیکھے کہ اُن کے پاس اپنا ایک نظام موجود ہے۔ جبکہ اس وقت مسلمانوں کے دشمنوں نے ایک مخصوص نظام کو اختیار کرلیا تھا جس پر وہ مضبوطی سے قائم تھے۔ یورپ کے پاس ایک آئیڈیالوجی اور ایک فلسفہ موجود تھا، چاہے وہ کیسا ہی تھا، بہرحال اُن کے پاس ایک اپنا نظریہ تھا، جبکہ دوسری طرف امتِ مسلمہ تھی جس کے پاس ایک صحیح آئیڈیالوجی تو موجود تھی لیکن وہ محض اس آئیڈیالوجی کے نقوش پر زندگی بسر کررہی تھی جو صدیوں سے غلط نفاذ کے باعث اُن کے ذہنوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان ہے:

((تركت فيكم ما إن تمسكتم به لن تضلوا، كتاب اللّٰه و سنتي))

''میں تم میں وہ چھوڑے جارہا ہوں کہ اگر تم انہیں تھام لو تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے، اللہ کی کتاب اور میری سنت''

اس حقیقت کے باوجود کہ ریاست اسلامی تھی اور امت مسلمان تھی، اور باوجود یہ کہ فکری اور فقہی ثروت کا خزانہ اُسکی دسترس میں تھا، یہ ریاست اس حدیث کے معانی کا فہم نہ حاصل کرسکی اور کوئی ایسے اقدامات نہ کئے کہ جس سے وہ ریاست اسلام کی طرف اس اصول کو بنیاد بناتے ہوئے لوٹ آتی کہ اسلام ایک عقیدہ اور نظام ہے، اور نہ ہی ریاست اس فکری وفقہی خزانے سے کوئی فائدہ حاصل کرسکی، ایسا خزانہ کہ جس کی مالک دنیا میں کوئی اور قوم نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہوگی۔

بے شک اسلامی ریاست اس خزانے سے مستفید نہ ہوسکی، جس کی وجہ یہ تھی کہ جب اس نے اجتہاد کا باب بند کردیا تو فکری حرکت بند ہوگئی اور مسلمانوں میں اسلامی تصورات کمزور پڑ گئے اور اسلامی شعور ناپید ہوکر رہ گیا، علمی خزانے کتابوں میں ہی مقید ہوکر رہ گئے اور چند علماء اور مفکرین ہی باقی رہ گئے۔ مطالعہ وتحقیق کے ذریعے حقیقتوں کا کھوج لگانے کی رغبت کم ہوگئی۔ اب اِن خزانوں اور معارف کی زندگی کے میدانِ عمل میں اور حکومت کے معاملات میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جارہی تھی کیونکہ ریاست اس کی ہمت افزائی نہیں کررہی تھی۔ اب علماء محض عقلی

کاوش کی خاطر علم وثقافت حاصل کرتے تھے اور یہ علم بغرضِ علم تھا یا پھر روزی حاصل کرنے کے لیے، چنانچہ شاذ ونادر ہی کوئی امت اور ریاست کی منفعت کیلئے علم کا طالب ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں کسی قسم کی علمی، ثقافتی یا قانونی کاوشیں کہاں ہوسکتی تھیں؟ اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کے فہم میں خلل پیدا ہوگیا۔ اسلام کے بارے میں مسلمانوں کا فہم محض روحانی مذہب کے طور پر ہوگیا تھا اس میں کوئی فکری، سیاسی یا قانونی پہلو نہیں تھا۔ پھر جب اسلام کا اصلی فکر ومفہوم اوجھل ہوگیا، اور وہ طریقہ جس سے یہ افکار نافذ ہوتے ہیں وہ بھی اوجھل ہوگیا تو اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول ﷺ کی سمجھ بھی اوجھل ہوگئی اور مسلمان اسلام کو بس ایک روحانی مذہب سمجھنے لگے۔ اُنہوں نے اسلام کا بحیثیت ایک روحانی مذہب کے باقی مذاہب سے موازنہ کرنے کو ہی ایک دینی کام سمجھ لیا بجائے یہ کہ وہ اسلام کو ایک جامع عقیدہ اور زندگی کے معاملات کے مکمل نظام کے طور پر دیکھتے۔ لہٰذا یہ کوئی عجب بات نہیں کہ امتِ مسلمہ ریاستِ عثمانیہ کی قیادت میں افسوس اور حیرت کا بُت بنے یورپ کے زبردست انقلاب کو دیکھتی رہی اور یورپ کی انقلابی حرکت کا مشاہدہ کرتی رہی اور واضح طور پر یورپ سے پیچھے رہ گئی۔ اور اس نے یورپ کی اقتصادی ترقی، ایجادات اور صنعتی انقلاب سے کوئی اثر نہ لیا۔ اور جو کچھ جزوی تاثر لیا گیا تو وہ بھی بہت تھوڑا، بے ترتیب، کنفیوژن کے ساتھ اور اس وقت جب بہت دیر ہوچکی تھی، جس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوا اور نہ ہی مادّی ترقی ہو پائی اور نہ ہی یہ اس قابل تھا کہ اس سے وہ کمزوری دور ہو پاتی جس میں امت اور ریاست گھری ہوئی تھی۔ یورپ کی ترقی کے ردِعمل میں کچھ کرنے یا نہ کرنے میں مسلمانوں کا تذبذب اس وجہ سے بھی تھا کہ مسلمان سائنس اور ثقافت میں فرق نہیں کر پا رہے اور نہ ہی تہذیب اور تمدن میں تمیز کر پا رہے تھے، چنانچہ یورپ کی ترقی پر شش و پنج میں تھے کہ اسے اختیار کریں یا نہ کریں۔ چنانچہ مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ یہ سب کا سب اسلام سے ٹکراتا ہے، لہٰذا اُنہوں نے یہ پکار لگائی کہ اسے اختیار کرنا حرام ہے۔ حتیٰ کہ جب پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا، اور حکومت نے اُس پر قرآنِ کریم چھپوانے کا ارادہ کیا تو فقہاء نے اسے حرام قرار دیا! اس طرح ہر نئی چیز کے حرام ہونے کے

فتوے دئے گئے اور ہر شخص جو نئی سائنس پڑھتا اُسے کافر قرار دے دیا جاتا! اور ہر اہلِ فکر پر زندیق یا ملحد ہونے کا الزام لگا دیا جاتا۔ جبکہ دوسری طرف تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو یہ بات کر رہے تھے کہ یورپ کی ہر چیز لینے کی ضرورت ہے، خواہ وہ جدید سائنس ہو یا ثقافت، تہذیب ہو یا پھر تمدن، یہ وہ لوگ تھے جو یا تو مغرب کے تعلیم یافتہ تھے یا پھر انہوں نے اُن عیسائی مشنری اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی جو اسلامی ممالک میں قائم ہو چکے تھے۔ ایسے لوگوں کا بہر حال عوام میں کوئی اثر ورسوخ نہیں تھا۔ عوام کی اکثریت اس بات کی خواہاں تھی کہ کسی طرح اسلام اور مغربی سائنس اور مغربی تہذیب وتمدن میں ہم آہنگی اور موافقت کی کوئی شکل نکال لی جائے۔ ریاستِ عثمانیہ کے آخری ایام میں یہ خیال لوگوں میں غالب تھا کہ مغرب نے اسلام کی تہذیب سے ہی افکار و نظام اخذ کیے ہیں اور یہ کہ اسلام کسی بھی چیز کو جو اسلام کے مطابق ہو اُسے اختیار کرنے سے نہیں روکتا اور نہ کسی ایسی چیز کے اپنانے میں کوئی حرج ہے جو اسلام کے متناقض نہ ہو۔ مغرب نے ان خیالات کو خوب ہوا دی یہاں تک کہ عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ اسی خیال کے ماننے والے ہو گئے، اِن میں علماء اور فقہاء بھی شامل تھے جنہیں جدید علماء اور مصلحین (ریفارمر) کہا جاتا تھا۔ تاہم اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ اور مغربی ثقافت اور اسکے زندگی کے متعلق نقطہ نظر اور اسلامی ثقافت اور اسکے زندگی کے متعلق نقطہ نظر میں واضح تضاد ہونے کے باعث اسلام اور مغربی افکار میں ہم آہنگی پیدا کرنا ممکن ہی نہیں تھا، کیونکہ دونوں کے زندگی کے متعلق نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسے لوگ جو کسی نہ کسی طرح اِن متضاد آئیڈیالوجیز میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے وہ مغربی افکار کے سامنے جھکتے چلے گئے اور اسلام سے دور ہوتے گئے۔

جدید سائنس، صنعت کاری اور ایجادات کی جانب غفلت برتی گئی۔ اسی طرح اسلام کے صحیح فہم کے امت میں ناپید ہونے کے باعث امت اِن متناقض افکار کے متعلق کسی متعین نتیجے تک نہ پہنچ سکی اور نہ ہی ترقی کے وسائل، صنعت کاری اور سائنس کو اختیار کر سکی۔ اس کا کمزور سے کمزور تر ہونا ظاہر ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ خود اپنے وجود کی حفاظت کرنے سے بھی قاصر ہو گئی۔

ریاست کے دشمن اب ریاست کو حصہ بہ حصہ ہڑپ کرنے لگے اور ریاست خاموشی سے یہ دیکھتی رہی۔ ادھر عیسائی مشنری علم کے نام پر ریاست کے کونے کونے میں داخل ہو چکے تھے اور اپنے خیالات کی ترویج کر کے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلا رہے تھے اور فتنے کی آگ کو بھڑکا رہے تھے۔ اور متعدد ایسی تحریکات جو ریاست میں مغربی ایجنڈے کے لیے کام رہی تھیں اور ریاست کے وجود کو تباہ کرنا چاہتی تھیں، کو کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ مسلمانوں میں قوم پرستی کے جذبات بھڑکائے جانے لگے جن کا اثر ریاست کے ہر کونے میں ہوا جیسے بلقان (موجودہ بوسنیا، سربیا وغیرہ)، ترکی، عرب علاقے، ارمینیا اور کردستان وغیرہ۔

1914ء کے شروع میں ریاست تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ریاست پہلی عالمی جنگ میں داخل ہوئی لیکن اسے شکست کا ہی سامنا کرنا پڑا اور پھر اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ یوں اسلام کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور مغربی ممالک کا وہ خواب پورا ہو گیا جسے وہ صدیوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ اسلامی ریاست کو تاراج کر کے اسلام کو تباہ کر دیں۔ ریاست کے ختم ہونے سے اسلامی علاقوں میں غیر اسلامی حکمرانی قائم ہو گئی، اس وقت سے مسلمان غیر اسلامی جھنڈے کے سائے تلے زندگی گزار رہے ہیں، ان کے معاملات میں خیانت کی جا رہی ہے، ان کی حالت اَبتر ہو چکی ہے، وہ کفریہ نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اور ان پر کفریہ قوانین کے ذریعے حکمرانی کی جا رہی ہے۔

باب نمبر 40

عیسائی مشنریوں کے حملے

یورپ نے اسلامی دنیا پر حملے کیلئے مشنری اداروں کو تیار کیا اور اِن کیلئے اپنے سالانہ بجٹ میں کثیر رقوم مختص کیں، یہ مشنری اسلامی دنیا میں علم پھیلانے کے بہانے داخل ہوئے تھے۔ بالفاظِ دیگر یہ علم اور انسانیت کی ترویج کے نام پر مغرب کی طرف سے اسلامی دنیا کو اپنی نوآبادیات (کالونی) بنانے کی طرف ایک قدم تھا۔ ان مشنریوں کو اس انداز سے تیار کیا گیا تھا کہ یہ مشنری سیاسی جاسوسی کے اداروں کو اسلامی دنیا میں قدم جمانے اور ثقافتی لحاظ سے اسلامی علاقوں کو کالونی بنانے کے کام کو مضبوط کر سکیں اور بالآخر یہ مشنری، مغربی نوآبادیاتی (استعماری) منصوبے کا ہراول دستہ ثابت ہوئے۔ ان مشنریوں کے ذریعے اسلامی علاقوں کے دروازے مغربی ممالک پر کھل گئے۔ یہ مشنری ادارے اسلامی ریاست کے کئی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اور اِن کی اکثریت برطانوی، فرانسیسی اور امریکی تھی۔ ان مشنریوں کے توسط سے برطانوی اور فرانسیسی اثرورسوخ اسلامی ریاست میں راسخ ہوا اور اِنہوں نے اسلامی ریاست میں متعدد ایسی تحریکوں کی رہنمائی کی جو مسلمانوں میں قومیت کے جذبات کو ہوا دے رہی تھیں، یعنی ترکوں میں ترک قومیت اور عربوں میں عرب قومیت۔ نیز انہوں نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں کا رخ مغرب کی طرف کیا، جس کے دو اہم مقاصد تھے، پہلا عربوں کو مسلمانوں کی ریاستِ عثمانیہ سے الگ کیا جائے اور یوں اسلامی ریاست کا تانہ بانہ بکھیرا جائے، اس کیلئے اُنہوں نے ترکوں کو اُن کے ترک ہونے کا نعرہ دیا تا کہ

نسلی جذبات کو ہوا ملے۔ دوسرا مقصد تمام مسلمانوں کو اسلام، جو اُن کے باہمی تعلق کا حقیقی اور واحد محرک تھا، سے دور کیا جائے۔ پہلے مقصد میں تو اُنہیں کامیابی حاصل ہوئی لیکن دوسرا مقصد پورا نہ ہو پایا، چنانچہ اس مقصد کو تُرکوں، عربوں اور فارسی لوگوں کے قومیت پرستی کے رجحان پر چھوڑ دیا گیا کہ اب وہ مشنریوں کی جانشین کی حیثیت سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اور امتِ مسلمہ کی وحدت میں شگاف ڈال دیں اور مسلمانوں کو ان کی آئیڈیالوجی سے غافل کر دیں۔ یہ مشنری اسلامی علاقوں میں مختلف حالات سے گزرے اور امتِ مسلمہ پر اِن کے کام کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ ان مشنریوں کے کام کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہم زوال اور کمزوری میں مبتلا ہیں کیونکہ استعماری ممالک نے امتِ مسلمہ اور ترقی کے درمیان حائل دیوار کی پہلی اینٹ اِن مشنریوں کے ذریعے ہی رکھی تھی اور یہ دیوار مسلمانوں اور اُن کی آئیڈیالوجی یعنی اسلام کے درمیان رکاوٹ بن گئی۔

مغربی ممالک کیلئے جو چیز اِن مشنریوں کو عالمِ اسلام میں اتارنے کیلئے محرک بنی وہ وہ صلیبی جنگیں تھیں جن میں مسلمانوں کی جہاد پر استقامت اور دلیری کے باعث یورپ کو شکست جھیلنا پڑی تھی۔ صلیبی جنگوں میں جب عیسائیوں کا مسلمانوں سے مقابلہ ہوا تو عیسائی دو اہم امور پر انحصار کر رہے تھے جو ان کی اپنی دانست میں مسلمانوں اور اسلام کا ہمیشہ کیلئے کام تمام کرنے والے تھے۔ اِن دو امور میں اُن کا پہلا اعتماد اس بات پر تھا کہ عالمِ اسلام میں بالخصوص شام میں کثیر تعداد میں عیسائی آباد تھے جو اپنے دین پر قائم تھے، مغربی ممالک کو یہ بھروسہ تھا کہ ریاستِ اسلامی کے عیسائی اُن کے بھائی ہیں چنانچہ وہ اپنے اوپر قائم مسلمان حکمرانوں سے بغاوت کرینگے اور مغربی ممالک کیلئے جاسوسی بھی کرینگے کیونکہ یورپی ممالک صلیبی جنگیں مذہبی جذبات کو بھڑکا کر لڑ رہے تھے۔

دوسرا امر جب پر وہ اعتماد کر رہے تھے وہ ان کی افواج کی کثرت اور طاقت میں برتری تھی۔ جبکہ مسلمان آپسی انتشار کا شکار تھے اور ان کا وجود ٹوٹ پھوٹ سے دوچار تھا۔ اس بناء پر

عیسائیوں نے یہ امید باندھ رکھی تھی کہ اُنہیں اس ایک لڑائی میں شکست دے دی جائے تو پھر مسلمان کبھی اُن سے مقابلہ نہ کر پائینگے اور مسلمانوں اور اسلام پر قابو پانا آسان ہو جائیگا۔ لیکن اُن کی امیدیں اور خواب پورے نہ ہوسکے۔ اُنہیں اس وقت شدید حیرت ہوئی جب دورانِ جنگ اُنہوں نے دیکھا کہ عرب میں بسنے والے عیسائی مسلمانوں کے کندھے سے کندھا ملا کر صلیبیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور اُن پر صلیبیوں کی پکار کا اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ عیسائی مسلمانوں کے ساتھ دار الاسلام میں رہتے تھے اور اُن پر بھی وہی اسلامی احکام وقوانین نافذ ہوا کرتے تھے جو مسلمانوں ہوتے تھے۔ اسلامی ریاست میں بسنے والے اِن عیسائیوں کے حقوق و فرائض بھی وہی تھے جو مسلمانوں کے تھے۔ مسلمان اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، عیسائی لڑکیوں سے شادیاں کرتے تھے۔ زندگی کے میدان میں مسلمان وعیسائی اکٹھے تھے کیونکہ اسلام نے غیر مسلموں کے تمام حقوق کی ضمانت دی ہے اور مسلمان خلفاء اور حکام نے ہمیشہ اس کی پاسداری کی تھی، اور اسلامی ریاست میں اسی پر عمل ہوتا تھا۔ ابنِ حزم لکھتے ہیں: ''یہ ذمیوں کا حق ہے کہ ہم کسی باہری حملے کی صورت میں اُن کا دفاع کریں خواہ اس میں ہمیں اپنی جانیں ہی دینا پڑیں۔ اس میں کوئی بھی کوتاہی ذمیوں کے حقوق سے غفلت کے مترادف ہوگی'' جبکہ اسی موضوع پر قرافی نے لکھا ہے: ''مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ ذمیوں میں کمزوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں، اُن کے غرباء کی اعانت کریں، ان کے بھوکوں کو کھانا کھلائیں، لباس سے محروم ذمیوں کو پہنائیں اور اُنہیں نرمی سے مخاطب کریں۔ کسی پڑوسی ذمی کی طرف سے اذیت پہنچانے پر جوابی طاقت کے باوجود تحمل سے کام لیں۔ یہ سب اُن سے نرمی وحسنِ سلوک کے جذبے سے ہو، کسی خوف، دباؤ یا اُن کی تعظیم کے سبب نہیں۔ اُن کے معاملات میں اُنہیں خلوصِ دل سے بہتر مشورہ دیں۔ اُنہیں کوئی نقصان پہنچے تو اُن کا دفاع کریں۔ اُن کے اموال، گھر بار، عزت وآبرو، اُن کے اثاثوں، حقوق اور مفادات کی حفاظت کریں، اور ہر وہ کام کریں جو حسنِ اخلاق کا تقاضا ہو''۔ یہ تمام وہ محرکات تھے جن کے باعث اسلامی ریاست میں بسنے والے عیسائی بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہی عیسائی بھائیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اور اس وقت بھی صلیبیوں کی

حیرت قابلِ دید تھی جب ان کی امیدوں کے برخلاف دوسرا امر بھی پورا نہ ہوا، یعنی اگر مسلمانوں کو ایک لڑائی میں شکست دے دی جائے تو پھر مسلمان کبھی اُن سے مقابلہ نہ کر پائینگے اور مسلمانوں اور اسلام پر قابو پانا آسان جائیگا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کو بری شکست دی تھی اور شام پر قابض ہو گئے تھے اور اپنی فتح کے بعد انہوں نے مسلمانوں پر بہت مظالم ڈھائے تھے۔ یہ پہلے لوگ تھے جنہوں مسلمانوں کو اپنے ہی وطن سے نکل جانے پر مجبور کیا تھا اور اس کے بعد اپنی تمام جنگوں میں انہوں نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا اور ان کا یہ طرزِ عمل آج تک جاری ہے، جیسا کہ فلسطین میں ہوا۔ بہرحال اُس فتح کے بعد وہ یہ سمجھنے لگے کہ کام اب تمام ہو گیا ہے اور اب مسلمان کبھی اُٹھ نہ پائینگے۔ لیکن مسلمان دشمن کو اپنے علاقوں سے نکال باہر کرنے میں جُت گئے۔ لٰہذا باوجود یہ کہ صلیبی وہاں تقریباً دوسو سال تک قابض رہے اور انہوں نے شام میں اپنی حکومتیں اور صوبے قائم کر لئے تھے، لیکن مسلمان بالآخر اُن کو وہاں سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو گئے اور صلیبیوں پر غالب آ گئے۔

اب صلیبی اس تحقیق میں لگے کہ مسلمانوں کی قوت کا راز کیا ہے؟ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ راز اسلام ہے، اور مسلمانوں کے عقیدے نے ہی ان میں زبردست قوت بھر دی ہے اور اسلام کے غیر مسلموں سے متعلق احکامات جو اُن کے حقوق کی ضمانت دیتے ہیں، کے باعث ریاست کی مسلم اور غیر مسلم رعایا میں گہرے رشتے بنتے ہیں۔ چنانچہ استعماری کفار نے عالمِ اسلام پر حملہ کرنے کی حکمتِ عملی پر غور وخوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مشنریوں کے ذریعے ثقافتی یلغار ہی سب سے بہتر طریقہ ہے، جس کے ذریعے وہ ایک طرف تو اسلامی ریاست میں رہنے والے عیسائیوں کو اپنی جانب مائل کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف اُن کا منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک پیدا کر دیئے جائیں اور اُن کے عقیدہ کو متزلزل کر دیا جائے اور یوں مسلم وغیر مسلم رعایا کا آپسی رشتہ ٹوٹ جائے ہو اور مسلمانوں کی قوت بکھر جائے۔

انہوں نے اپنی اس سازش کو عملی جامہ پہنایا، چنانچہ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جزیرہ مالٹا میں بہت بڑا مشنری مرکز کھولا گیا اور اسے عالمِ اسلام میں مشنریوں کا ہیڈ کواٹر بنایا گیا، جہاں سے سارے عالمِ اسلام میں مشنری بھیجے جاتے تھے۔ جب مالٹا میں انہیں ایک مدت ہوگئی اور وہ اچھی طرح جم گئے تو اُنہیں اپنی کارروائیاں وسیع تر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ وہ 1625ء میں شام منتقل ہوگئے اور وہاں پر بھی مشنری تحریک شروع کرنے کا ڈول ڈالا۔ تاہم ابھی تک اُن کی کارروائیاں بہرحال محدود تھیں، اور یہ یا تو چند چھوٹے چھوٹے سکولوں کی شکل میں تھیں یا کچھ دینی کتابیں شائع ہو رہی تھیں۔ ان مشنریوں کو اپنے کام میں تمام لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے بہت مشقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود یہ لوگ 1773ء تک کسی نہ کسی طرح ٹِکے رہے۔ جب اِن عیسائی مشنری اداروں کو، بجز کچھ چھوٹی مشنریوں کے جن میں 'عزارین' مشن شامل تھا، ممنوع قرار دے دیا گیا تو باوجود اِن کی موجودگی کے، مشنریوں کا اثر زائل ہوگیا۔ پھر 1820ء تک ان کا وجود صرف مالٹا ہی میں سمٹا رہا۔ 1820ء میں انہوں نے بیروت میں اپنا پہلا مرکز قائم کیا اور وہاں کئی مشکلات کے باوجود یہ مشنری اپنے کام میں لگے رہے۔ ان کا پہلا قدم دینی اور ثقافتی تبلیغ کا تھا جبکہ تعلیم کی جانب اِن کی طرف سے معمولی توجہ ہی دی جا رہی تھیں۔ 1834ء میں یہ مشنری پورے بلادِ شام میں پھیل گئے، لبنان میں عنتورہ کے مقام پر کالج کھولا گیا، اسی طرح مشنریوں کے امریکی مشن نے اپنی پرنٹگ پریس مالٹا سے بیروت منتقل کر لی تاکہ کتابیں یہیں سے چھپوا کر تقسیم کی جاسکیں۔ اس وقت ایلی سمتھ نامی امریکی مشنری کی کاروائیاں زوروں پر تھیں۔ یہ شخص مالٹا میں رضاکار تھا اور مشن کے پرنٹنگ پریس کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ 1827ء میں یہ بیروت آیا لیکن ایک سال کے اندر اندر خوف اور اکتاہٹ سے پریشان ہوکر مالٹا لوٹ گیا۔ 1834ء میں یہ اپنی بیوی کے ساتھ بیروت لوٹا اور اُس نے لڑکیوں کیلئے ایک سکول شروع کیا۔ اس کے کام کا دائرہ بڑھتا گیا، اس نے پورے شام میں اور خاص کر بیروت میں اس کام کیلئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اس قسم کی اور کاوشیں ہوئیں اور مشنریوں کے قدم وہاں جم گئے۔ اسی اثناء میں ابراہیم پاشا نے ابتدائی تعلیم کیلئے ایک مخصوص طرز کا نصابِ تعلیم اختیار کیا جو

مصر میں بھی اپنایا جا چکا تھا، یہ نصاب فرانس میں رائج ابتدائی تعلیم کی نہج پر تھا۔ یہ مشنریوں کے لیے ایک موقعہ تھا جس کا انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں معاونت کی اور اپنے پرنٹنگ کے کام کو وسعت دی۔ ظاہری طور پر وہ تعلیمی سرگرمیوں میں شریک تھے مگر پسِ پردہ وہ مشنری سرگرمیوں کو فروغ دے رہے تھے۔ انہوں نے عوام کو آزادئ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف اکسایا۔ اُنہوں نے مسلمانوں، عیسائیوں اور دروزوں (Druze) میں ایسی مذہبی رسمیں ایجاد کیں جو ان کے عقائد سے تعلق رکھتی تھیں۔

1840ء میں جب ابراہیم پاشا نے شام سے پسپائی اختیار کی تو عوام میں مایوسی، اضطراب اور انتشار پھیلنے لگا اور وہ باہم مختلف ہوتے گئے، جس کا فائدہ بیرونی نمائندوں اور خاص طور پر مشنریوں نے جم کر اُٹھایا۔ اور چونکہ ریاستِ عثمانیہ کا اثر ورسوخ شام میں کمزور ہو گیا تھا تو اس موقع کو غنیمت جان کر فتنے کی آگ خوب بھڑکائی گئی اور 1841ء کے شروع تک یہ آگ اتنی بھڑکی کہ لبنان کے علاقے میں عیسائیوں اور دروزوں کے درمیان فسادات ہونے لگے۔ ان لڑائیوں کی شدت اتنی تھی کہ خود ریاستِ عثمانیہ اس سے متاثر ہوئی اور بیرونی طاقتوں کے شدید دباؤ پر اس نے لبنان کے ان فرقوں کیلئے علیحدہ علیحدہ نظام اور دونوں قسموں کے لئے الگ الگ حاکم مقرر کر دیئے اور یوں فریقین کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ تاہم یہ انتظام کامیاب نہ ہوا کیونکہ یہ نظام فطری نہ تھا۔ اس تنازعہ میں برطانیہ اور فرانس پیش پیش تھے اور جہاں پر بھی حکومتی عہدیدار اس پر قابو پانے کی کوشش کرتے، تو یہ ملک وہاں فتنے کی آگ کو ہوا دیتے تاکہ اس پر قابو پانے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکے۔ ان دونوں ممالک نے اس فتنے کو زیادہ سے زیادہ ہوا دینے کی کوششیں کی تاکہ اس کی آڑ میں وہ لبنان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر سکیں۔ برطانیہ اس تنازعہ میں دروزوں کی طرفداری کر رہا تھا جب کہ مارونی عیسائیوں (Maronites) کو فرانس کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے سبب 1845ء میں دوبارا فسادات کی آگ بھڑکی جس کے نتیجے میں ہولناک تباہیاں ہوئیں، جن میں کلیساؤں اور

خانقاہوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ لوگ قتل ہوئے، املاک تباہ ہوئیں، مال واسباب لوٹا گیا۔ عثمانی حکومت کو فتنے پر قابو پانے کیلئے اپنے مخصوص نمائندے کو مطلق اختیارات کے ساتھ بھیجنا پڑا۔ لیکن وہ شدّت میں معمولی تخفیف سے بڑھ کر کچھ نہ کر سکا۔ ادھر مشنریوں کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں اور 1857ء میں مارونی عیسائیوں نے مسلح جدوجہد اور بغاوت کی آواز لگانا شروع کر دی۔ مارونی پادریوں نے مزارعوں کو زمینداروں کے خلاف بھڑکایا اور شمالی لبنان میں زمینداروں پر نہایت پرتشدّد حملے ہوئے، اور وہاں بغاوت کی حالت پیدا ہوگئی جس نے پھیل کر جنوبی لبنان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، جہاں عیسائی مزارع دروز زمینداروں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ برطانیہ اور فرانس دونوں فریقوں کی پشت پناہی کر رہے تھے، برطانیہ دروزوں کے پیچھے تھا اور فرانس مارونی عیسائیوں کے ساتھ تھا۔ یوں فتنے کی آگ پھیلتی گئی یہاں تک کہ پورے کا پورا لبنان اس آگ میں جلنے لگا۔ دروز بلاتفریق عیسائیوں کو قتل کر رہے تھے، خواہ یہ پادری ہوں یا عام عیسائی۔ فسادات اس قدر پُرتشدد تھے کہ اس میں ہزاروں عام عیسائی قتل اور بے گھر ہو گئے۔ بالآخران فسادات نے پورے بلادِشام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جہاں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان حالات انتہائی کشیدہ ہو گئے۔ مسلمانوں نے جولائی 1860ء میں عیسائی علاقے پر خوں ریز حملہ کیا اور بڑے پیمانے پر لوگ ذبح ہوئے، ساتھ ساتھ تخریب کاری اور لوٹ مار کی وارداتیں بھی رونما ہوئیں، یہاں تک کہ اس خوں ریزی کو روکنے کے لیے ریاست کو فوجی قوت استعمال کرنا پڑی۔ باوجود کہ یہ فتنہ تھم گیا اور اپنے اختتام کو پہنچ گیا لیکن مغربی ممالک نے محسوس کر لیا تھا کہ یہی وہ چیز ہے جسے بہانہ بنا کر وہ شام میں داخل ہو سکتے ہیں، چنانچہ اُنہوں نے اپنے جنگی بیڑے شام کے ساحل پر بھیج دیئے۔ اُسی سال اگست میں فرانس نے اپنی زمینی فوجیں بھی بھیج دیں جو بیروت میں اُتریں اور انہوں نے بغاوت کو ختم کرنے کے لیے اقدامات شروع کیے۔ اس طرح مغربی ریاستوں نے ریاستِ عثمانیہ میں فتنے کی آگ بھڑکائی تا کہ یہ شام میں داخلے کا ذریعہ بنے۔ پس وہ شام میں داخل ہوئے اور خلافتِ عثمانیہ کو مجبور کیا کہ وہ شام کیلئے شریعت کے علاوہ کوئی مخصوص

نظام وضع کرے، اور شام کو دو مختلف صوبوں میں تقسیم کردے۔ اس طرح لبنان کو خصوصی مراعات دلائی گئیں اور لبنان شام کے دوسرے حصوں سے الگ ایک خودمختار صوبہ بن گیا، اس کا اپنا مقامی حکومتی نظام تھا جس کی سربراہی ایک عیسائی حاکم کے ہاتھ میں تھی۔ اس حاکم کی معاونت کیلئے ایک نفاذی کونسل بنائی گئی جس کے ارکان مقامی باشندے تھے جن کی حیثیت عوام کے نمائندوں کی تھی (اس وقت سے مغربی ممالک لبنان کے امور کو کنٹرول کررہے ہیں اور اسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہوا ہے) یوں مغربی ممالک نے ریاستِ عثمانیہ اور اسلامی علاقوں کے قلب میں داخل ہونے کے لیے لبنان کو سیڑھی کے طور پر استعمال کیا۔

اسی دوران مشنریوں کی سرگرمیوں نے ایک نیا روپ اختیار کیا جو پچھلی سرگرمیوں سے مختلف تھا۔ اب انہوں نے سکولوں، ہسپتالوں اور پرنٹنگ پریسوں سے بڑھ کر باقاعدہ تنظیمیں قائم کرنا شروع کردیں۔ چنانچہ 1842ء میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا کام امریکی مشن کے زیر نگرانی اس کے ایجنڈے کے مطابق سائنسی علوم پر مبنی تنظیموں کا قیام تھا۔ اس کمیٹی نے پانچ سال تک اپنے کام کو آگے بڑھایا یہاں تک کہ 1847ء میں اس نے ایک جمعیت بنائی جس کا نام ایسوسی ایشن آف آرٹس اینڈ سائنس (جمعیتِ علوم وفنون) رکھا گیا۔ اس تنظیم میں ناصیف الیازجی، بطرس البستانی کو، جو لبنان کے عیسائی تھے، عربی ہونے کے ناطے ممبر بنایا گیا، اس کے علاوہ دو امریکی یعنی ایلی سمتھ اور کورنیلیئس وان ڈائک اور ایک انگریز کرنل چرچل اس کے ممبر تھے۔ آغاز میں اِس ایسوسی ایشن کے مقاصد غیر واضح اور مبہم تھے، یہ جمعیت اونچے درجے کی کلاسوں کو سائنس پڑھاتی تھی اور کچھ بچوں کو سائنس کی تعلیم دے رہی تھی، اصل میں یہ ایسوسی ایشن اُن طلباء کو مغربی ثقافت سیکھنے کی ترغیب دیا کرتی تھی اور اپنے ایجنڈے کے مطابق بچوں اور بڑوں دونوں کی فکر کو متاثر کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔ ان کی اس بھرپور کوشش کے باوجود پورے بلادِ شام سے یہ لوگ کل پچاس ممبر ہی بنا پائے اور اس میں بھی اُنہیں دو سال کا عرصہ لگ گیا۔ یہ سارے کے سارے ممبر عیسائی تھے اور زیادہ تر بیروت شہر کے رہنے والے تھے، ان میں کوئی بھی مسلمان یا

دروز شامل نہیں ہوا تھا۔ پس ان کی کاوشیں رنگ نہ لاسکیں اور بالآخر یہ ایسوسی ایشن اپنے قائم ہونے کے پانچ سال بعد ہی ختم ہوگئی۔ لیکن مشنریوں میں اسی قسم کی اور ایسوسی ایشنز بنانے کا جذبہ ختم نہیں ہوا تھا۔ 1850ء میں فرانسیسی یسوعی مشنری ہنری دوبنیئر کی قیادت میں ایک اور ایسوسی ایشن شروع کی گئی جس کا نام جمعیت الشرقیہ رکھا گیا۔ یہ بھی جمعیتِ علوم وفنون کی طرز پر تھی اور یہ بھی طویل عرصہ چل نہ سکی۔ اِن کے علاوہ اس قسم کے اور تجربات کئے گئے، چنانچہ متعدد جمعیات قائم کی گئیں لیکن وہ سب کی سب لاحاصل رہیں۔ 1857ء میں ایک اور ایسوسی ایشن قائم کی گئی جو پچھلی تمام ایسوسی ایشنوں سے اس طرح مختلف تھی کہ اس کے تمام بانی اصلاً عرب تھے اور اس میں کسی بھی بیرونی شخصیت کو رکن نہیں بنایا گیا تھا اور اسی وجہ سے بعض مسلمانوں اور دروز نے اس کی رکنیت اختیار کر لی جنہیں عرب ہونے کی حیثیت سے اس جمعیت میں داخل کر لیا گیا۔ اس جمعیت کا نام '' الجمیعة العلمیة السوریة ''یعنی' سائنٹفک ایسوسی ایشن آف سیریا' رکھا گیا، چونکہ اس کے ظاہری خدوخال عربی تھے اور کوئی مغربی یا بیرونی شخص اس کا رکن نہیں تھا لہٰذا اس ایسوسی ایشن کو سابقہ تجربات کی بہ نسبت زیادہ قبولیت حاصل ہوئی اور اس نے عوام کو قدرے متاثر بھی کیا۔ اس کی سرگرمیوں کی نوعیت بھی مختلف تھی، پھر اس کی ساخت مقامی تھی، چنانچہ اس میں قریباً ایک سو پچاس افراد نے شرکت اختیار کی جن میں عرب کی نامی گرامی شخصیات بھی شامل تھیں مثلاً دروز میں سے محمد ارسلان، مسلمانوں میں سے حسین بیہم، ان کے علاوہ عرب عیسائیوں کے سبھی گروہ اس میں شامل تھے جن کے نمایاں لوگوں میں سے ابراہیم الیازجی اور ابنِ بطرس البستانی شامل تھے۔ یہ ایسوسی ایشن سابقہ ایسوسی ایشنوں کے مقابلہ میں زیادہ عرصہ تک چلی اور اس کی سرگرمیاں اس طرح ترتیب دی گئیں تھیں کہ ہر قبیل کے لوگوں کو اپنے اندر سمویا جائے اور اُن میں عرب قومیت کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ اس کا خفیہ مقصد استعماری اور مشنری تھا جس پر وہ علم کے فروغ کا پردہ ڈالے ہوئی تھی اور لوگوں میں مغربی تہذیب اور ثقافت کا شوق پیدا کر رہی تھی۔ 1875ء کے دوران بیروت میں ایک خفیہ ایسوسی ایشن بنائی گئی جو سیاسی فکر پر مبنی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں عرب قومیت کے جذبات ابھارے جائیں۔ اس کی بنیاد رکھنے والے

بیروت کے پروٹیسٹینٹ کالج سے فارغ التحصیل پانچ نوجوان تھے جنہیں مشنری اپنے رنگ ڈھنگ میں ڈھالنے میں کامیاب رہے تھے اور یہ سب کے سب عیسائی تھے، پھر اس خفیہ تنظیم نے چند اورلوگوں کو اس میں شامل کیا۔ یہ تنظیم اپنے جاری کردہ پمفلٹوں اور نشر کردہ تحریروں کے ذریعے عرب قومیت کا پرچار کررہی تھی اور عربوں کی بالخصوص شام اور لبنان کی سیاسی آزادی کی طرف دعوت دے رہی تھی۔ یہ تنظیم اُن لوگوں کو جو اس کے حلقۂ اثر میں آتے ایسی تربیت کرتی کہ اُن میں مصنوعی رجحانات اور عجیب خواہشات جنم لینے لگتیں۔ یہ تنظیم عربی قوم پرستی اور عربیت کی طرف دعوت دیتی تھی اور لوگوں کے دل میں خلافتِ عثمانیہ کے متعلق کدورت پیدا کرتی تھی۔ یہ مشنری تنظیم خلافتِ عثمانیہ کو اسلامی ریاست کی بجائے لوگوں میں اسے ''ترکی'' سے تعبیر کرتی۔ یہ تنظیم ریاست کے کاموں سے دین کو بے دخل کرنے اور اعمال کے لیے عرب قومیت کو بنیاد بنانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس تنظیم نے عربیت کا لباس پہن رکھا تھے لیکن اس کے بانی اپنے جاری کردہ لٹریچر میں ترکی کو نشانہ بناتے تھے اور ان پر خلافت کو عربوں سے غصب کر لینے، شریعت کے احکامات سے تجاوز کرنے اور دین سے غفلت برتنے کا الزام عائد کرتے تھے۔ یہ اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کے محرکات و مقاصد کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مقصد اسلامی ریاست کے خلاف بے چینی پیدا کرنا، دین کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنا اور ایسی سیاسی تحریکیں قائم کرنا تھا جن کی بنیاد غیر اسلامی ہو۔ ان تحریکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کسی بھی شخص پر یہ حقیقت قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ اِن تحریکوں کو مغربی ریاستوں نے ہی کھڑا کیا تھا، وہی اِن کے امور کی دیکھ بھال اور نگرانی کررہی تھیں، اور وہی ان تنظیموں کا لٹریچر اور نشریاتی مواد لکھتی تھیں۔ 28 جولائی 1880ء کو بیروت میں برطانوی قونصل نے اپنی حکومت کو ایک برقی تار بھیجا جس میں لکھا تھا: ''انقلابی پرچے نشر ہو گئے ہیں، لوگ اِن کے پیچھے مدحت کا ہاتھ سمجھ رہے ہیں، بہرحال حالات معمول پر ہیں، تفصیلات مراسلے کے ذریعے''۔ یہ تار اس وقت بھیجا گیا جب اس ایسوسی ایشن نے اپنا پمفلٹ چھاپ کر بیروت کی سڑکوں پر تقسیم کیا تھا اور اسے دیواروں پر بھی آویزاں کیا تھا۔ اس تار کے بعد بیروت اور دمشق کے قونصل خانوں نے کئی خطوط اپنی حکومتوں کو ارسال کیے جن میں

اِس پمفلٹ کی نقلیں بھی شامل کی تھیں۔ یہ تمام خطوط اُس ایسوسی ایشن کے کام پر رپورٹ کی مانند ہیں جسے بیروت کے پروٹیسٹینٹ کالج میں قائم کیا گیا تھا اور جس کی سرگرمیاں بلادِشام میں ہو رہی تھیں۔ گو کہ ان جمعیتوں کا کام سارے عرب علاقوں میں ہو رہا تھا، البتہ یہ بلادِشام میں سب سے زیادہ عیاں تھا۔ اس کا ثبوت جدہ میں برطانیہ کے کمشنر کا مراسلہ ہے جو اس نے اپنی حکومت کو لکھا تھا، جس میں درج ہے: ''میرے علم میں آیا ہے کہ مکہ میں بھی کچھ دانشور ایسے ہیں جو آزادی کی باتیں کر رہے ہیں، جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے مجھے لگتا ہے کہ اُن لوگوں کے پاس باقاعدہ منصوبہ ہے کہ علاقۂ نجد کو دونوں نہروں کے درمیانی علاقے (یعنی جنوبی عراق) کے ساتھ ملا کر اُس پر منصور پاشا کو حاکم بنا دیا جائے، نیز عسیر اور یمن کو متحد کر کے اس پر علی بن عابد کو بٹھا دیا جائے'' ان حالات میں دلچسپی رکھنے والا برطانیہ کوئی اکیلا ملک نہیں تھا، فرانس بھی ایسے معاملات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ جیسا کہ 1882ء میں بیروت میں بسنے والے فرانسیسیوں میں سے ایک کے مراسلے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ فرانس کو ان حالات کی کس قدر فکر اور دلچسپی تھی، یہ اس مراسلے سے ظاہر ہے: ''آزادی کے جذبات بہت زیادہ پھیل رہے ہیں، میں نے بیروت میں اپنے قیام کے دوران دیکھا کہ نوجوان بہت انہماک سے ایسی ایسوسی ایشنیں بنانا چاہتے ہیں جو ہسپتال، اسکول وغیرہ چلائیں اور اپنے علاقے کو ترقی دیں۔ یہ تحریک فرقہ واریت سے پاک ہے اور عیسائیوں کیلئے اس میں داخلہ کھلا ہے اور یہ اپنے قومی کام میں اُن پر انحصار کرتی ہے''۔ اسی طرح بغداد میں رہنے والے ایک فرانسیسی شہری نے لکھا: ''جہاں پر بھی میں گیا مجھے ترکوں سے نفرت دیکھنے کو ملی اور یہ سب جگہ ایک ہی پیمانے پر تھی۔ اور ایسی ناپسندیدہ حالت سے چھٹکارا پانے کیلئے اجتماعی سرگرمیاں شروع کرنے کی سوچ اب تشکیل کے عمل میں ہے۔ میں دور افق پر عربیت کی تحریک کو ابھرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ یہ لوگ جو اب تک مغلوب تھے، اب عالمِ اسلام میں اپنے قدرتی مقام اور اس علاقے کی قیادت کا مطالبہ کرنے والے ہیں''۔ سائنس اور مذہب کے نام پر مشنریوں کے اس حملے میں صرف امریکہ، برطانیہ اور فرانس ہی شامل نہیں تھے بلکہ اِن کے علاوہ بھی کئی غیر اسلامی ممالک ان حملوں میں شریک تھے۔ ان میں سے ایک 'زار' کی حکمرانی تلے روس تھا جس نے

اپنا مشن شام بھیجا ، اسی طرح جرمنی نے راہبات(Nuns of Carodt) کا وفد بھیجا جو دوسرے مشنریوں کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔ اپنے ریاستی مفادات کے لحاظ سے اِن مما لک کے مشنریوں اور مغربی وفود کے سیاسی نظریات اور لائحہ عمل میں اختلاف کے باوجود، ان کے مقاصد یکساں تھے۔ ان کے مقاصد یہ تھے: عالمِ اسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کرنا، مغربی تہذیب کو مشرق میں عام کرنا، مسلمانوں میں اُن کے دین کے بارے میں شکوک وشبہات کو پیدا کر کے اُن میں پھوٹ ڈالنا تھا، اور یہ کہ مسلمان اپنی ہی تاریخ کو حقیر جانیں اور مغرب اور مغربی تہذیب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ یہ تمام مشنری اسلام اور مسلمانوں سے شدید بغض وعناد رکھتے تھے، مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اِنہیں دقیانوس اور بربر قوم سمجھتے تھے اور یہی سارے یورپ کی بھی سوچ تھی۔ آج عالمِ اسلام میں ہر جگہ پھیلا کفر اور استعمار کا استحکام ان مشنریوں کے حاصل کردہ نتائج کی عکاسی کرتا ہے۔

باب نمبر 41

صلیبیوں کی نفرت

فرانس کا ایک مشہور سکالر، کاؤنٹ ہنری ڈِی کاسٹری اپنی کتاب ''اسلام'' جو 1896ء میں شائع ہوئی، میں لکھتا ہے: ''میں نہیں جانتا کہ اگر مسلمانوں کو قرونِ وسطیٰ کے ہمارے لکھے ہوئے قصوں کا علم ہو جائے اور وہ ہمارے عیسائی مقرروں کے اقوال اور اُن کی نظموں کو سنیں تو وہ کیا سوچیں گے؟ کیونکہ ہماری تمام نظمیں اور کہانیاں جن میں سے کچھ بارہویں صدی سے پہلے بھی لکھی گئیں وہ سب کی سب ایک ہی فکر کی پیداوار ہیں اور یہی فکر صلیبی جنگوں کا سبب بنی۔ یہ تمام نظمیں بس مسلمانوں کی نفرت سے بھری ہوئیں تھیں جو اُن کے دین کے بارے میں ہماری مکمل جہالت کی بناء پر تھی۔ اِن نظموں کے باعث اُن کے مذہب کی غلط تصویر اوران کے مذہب کے خلاف نفرت ہمارے ذہنوں میں بیٹھ گئی اور اس کا کچھ حصہ آج بھی ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے۔ ہر ایک نغمہ ساز مسلمانوں کو مشرک، کافر، بتوں کا پجاری اور بے دین سمجھتا تھا''۔ اس طرح قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے پادری، مسلمانوں اور اُن کے دین کی ایسی ہولناک اور ڈراؤنی منظر کشی کیا کرتے تھے کہ عوام کے دل مسلمانوں کے خلاف سخت بغض اور نفرت سے بھر جائیں۔ چنانچہ اس نفرت نے عیسائی دنیا کو ابھارا اور صلیبی جنگیں پھوٹ پڑیں۔ کئی صدیوں بعد جب صلیبی جنگیں ختم ہوئیں تو مسلمانوں نے 15 ویں صدی میں مغرب پر حملہ کیا اور اسلامی ریاست نے قسطنطنیہ فتح کرلیا۔ پھر 16 ویں صدی عیسوی میں اسلامی ریاست نے یورپ کے جنوبی اور مشرقی حصوں کو فتح کیا اور

اسلام کو وہاں پہنچایا، چنانچہ البانیہ، یوگوسلاویہ اور بلغاریہ وغیرہ میں لاکھوں لوگ اللہ کے دین میں داخل ہوئے۔ یورپ میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی نفرت پھر جاگ اٹھی اور مسئلہ شرق پیدا ہو گیا۔ اس وقت وہ مسئلہ یہ تھا کہ اسلامی افواج کی پیش قدمی کو روکا جائے، اسلامی فتوحات کے آگے بند باندھا جائے اور مسلمانوں سے لاحق خطرے کا سدِ باب کیا جائے۔ اہلِ یورپ کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے گہرے جذبات ہی اُن کی طرف سے اسلامی ممالک میں اسکولوں، ہسپتالوں، ایسوسی ایشنوں اور کلبوں کی آڑ میں مشنری بھیجنے کا سبب بنے، جس میں اُنہوں نے سخت محنتیں اور کثیر رقوم خرچ کیں اور مفادات کے اختلاف اور سیاسی نقطہ نظر کے مختلف ہونے کے باوجود اُنہوں نے اس منصوبے پر اتفاق کیا۔ مغربی اقوام اور مغربی ریاستیں مشنری کوششوں کے پیچھے جمع تھیں اور مشنری وفود کے ساتھ ساتھ اُن کے سفارت خانے اور قونصل خانے بھی یہی کام سرانجام دے رہے تھے۔

مسلمانوں سے یہ صلیبی نفرت جو پورے مغرب اور بالخصوص یورپ اور سب سے بڑھ کر برطانیہ کے دل میں پوشیدہ تھی، یہ گہرائی سے پیوست نفرت اور شر انگیز دشمنی ہی اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کے شیطانی منصوبے کی وجہ تھی اور ہماری ہی سرزمین پر ہماری ذلت ورسوائی کا موجب تھی۔ اور جنرل ایلن بی جب 1917ء میں پہلی عالمی جنگ کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوا تو اُس نے کہا: ''صلیبی جنگوں کا اختتام تو دراصل آج ہوا ہے''۔ یہ الفاظ اُس کے دلی جذبات کی سچی تعبیر تھے اور اس امر کی عکاسی کر رہے تھے کہ اُس کے دل میں مسلمانوں کیلئے کس قدر عناد اور نفرت بھری ہوئی تھی۔ فی الحقیقت ہر یورپی جو مسلمانوں کے خلاف اس جنگ میں شامل تھا، خواہ فوجی لحاظ سے یا ثقافتی لحاظ سے، اس کے سینے میں ایسا ہی بغض و عناد بھرا ہوا تھا۔ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ صلے وَمَا تُخْفِىْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾

''ان کا بغض تو ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے، اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ تو اس

سے بھی بڑھ کر ہے'' (ال عمران: 118)

کوئی شک نہیں کہ جو کچھ جنرل ایلن بائی کے منہ سے نکلا وہ اُس کا بغض تھا اور جو کچھ برطانیہ چھپا رہا تھا، اور جو کچھ ہر یورپی کے سینے میں تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ عناد و نفرت صلیبی جنگوں کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور آج بھی اس کی وہی کیفیت ہے۔ اور جس خوف و ہراس، تحقیر، استحصال اور علاقائی تسلط سے ہم آج دوچار ہیں، یہ سب وہ بدلہ ہے جو مغرب مسلمانوں سے لے رہا ہے اور بے شک یہ مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے۔

پروفیسر لیو پولڈ ویس (Leopold Weiss) اپنی کتاب ''اسلام دوراہے پر'' میں لکھتا ہے: ''یورپ کا نشاۃ ثانیہ یا یورپ میں سائنس اور فنون کا احیاء، اسلامی اور عرب مصادر کا مرہونِ منت ہے اور جو مشرق اور مغرب کے درمیان مادی رابطوں کی بنا پر ممکن ہوا۔ یورپ نے اسلامی دنیا سے بہت استفادہ حاصل کیا ہے لیکن اس نے مسلمانوں کی اس معاونت کو نہ کبھی تسلیم کیا اور نہ ہی وہ اس کے شکر گزار رہے، جبکہ مسلمانوں سے اپنی نفرت کی شدت میں کمی کر کے یورپی ایسا کر سکتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ہوا اور اِن کی نفرت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اور بعض اوقات بے قابو ہو گئی۔ اس عناد نے عوام کے جذبات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور فقط 'مسلم' نام لینے ہی سے یہ عناد سلگ اُٹھتا تھا۔ یہ عناد لوگوں کی وراثت کا حصہ بن گیا اور ہر مرد اور عورت کے سینوں کی گہرائیوں میں اُتر گیا، مزید حیرت اس بات پر ہے کہ ثقافتی ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد بھی یورپ میں یہ نفرت زندہ رہی۔ اس کے بعد مذہبی اصلاحات کا دور آیا اور یورپ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، ہر فرقہ دوسرے کے خلاف ہمیشہ پوری طرح مسلح اور لڑائی کیلئے مستعد رہتا، لیکن اِن دونوں فرقوں میں مسلمانوں سے عناد پھر بھی مشترک رہا۔ پھر وہ دور آیا جس میں مذہبی جوش ٹھنڈے پڑ گئے لیکن یہ نفرت پھر بھی قائم رہی، اس کی بہترین مثال فرانس کے فلسفی شاعر والٹیئر سے ملتی ہے جو اٹھارہویں صدی میں چرچ اور عیسائیت کا دشمن مانا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسلام اور نبی اسلام ﷺ سے بغض و نفرت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے کچھ دہائیوں

بعد ایسا وقت آیا کہ مغربی دانشوروں نے بیرونی تہذیبوں کا مطالعہ کیا اور قدرے کھلے ذہن سے بعض تہذیبوں سے ہمدردانہ رویہ اختیار کیا، لیکن جب بات اسلام کی آتی تو اُن کی روایتی نفرتیں دانشوروں کی اس علمی کاوش پر بھی متعصّبانہ طور پر اثر انداز ہو جاتیں اور تاریخ نے جو ایک اونچی دیوار یورپ اور اسلام کے مابین کھڑی کر رکھی تھی اُس کا تدارک نہ ہو پایا اور اسلام سے نفرت یورپی ذہنیت کا لازمی حصہ بن گئی"۔ جن مشنری جمعیتوں کا پیچھے ذکر ہوا وہ سب اسی بنیاد پر قائم کی گئیں تھیں۔ پس وہ عیسائی مذہب کی تبلیغ کیا کرتی تھیں اور مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کی کوشش میں رہتی تھیں۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کا احترام و وقار کمزور ہو اور وہ اسلام کو اپنی دنیاوی کمزوری کا سبب سمجھنے لگیں۔ اسی طرح اِن جمعیتوں کے سیاسی اہداف بھی تھے، اور دونوں ہی سطحوں پر خوفناک نتائج سامنے آئے جو اُن کے لحاظ سے اُن کی توقعات سے کہیں اچھے تھے۔ ان مشنریوں کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمان اپنے مسائل کیلئے اپنے دین کو موردِ الزام اور قصوروار سمجھیں اور اسلام سے دور ہوتے جائیں، اسلامی احکام کے عملی ہونے کے بارے اُن میں شبہات پیدا ہو جائیں تاکہ مسلمان اللہ کے راستے سے بھٹک جائیں۔ اِن مشنریوں کی معاونت کیلئے اِن کے پیچھے پیچھے مستشرقین اور استشراقی تھے جن کے اغراض و مقاصد بالکل یکساں تھے۔

پورا یورپ اس جنگ میں اکٹھا ہو گیا، جس کا پہلا حملہ ثقافتی تھا اور عقل پر کیا گیا تھا کہ اذہان میں اسلام کے احکام اور اس کی اعلیٰ اقدار مشکوک ہو جائیں اور اِن کی جگہ زہر بھر جائے اور اسلام اور اسلامی تاریخ کے بارے اپنی زہریلی باتوں کو علمی بحث و تحقیق کے نام پر مسلمان نسل کے ذہن میں انڈھیلا جائے۔ یہ ثقافتی زہر صلیبی جنگوں سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ ایک طرف مشنری مبلغین یہ زہر سائنسی و علمی بحث اور انسانیت کے نام پر پھیلا رہے تھے تو دوسری جانب مستشرقین یہی کام مشرقیت کے نام پر کر رہے تھے۔ پروفیسر لیو پولڈ ویس لکھتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی مستشرقین عیسائی مشنری ہی تھے جو اسلامی ریاست میں کام کر رہے تھے۔ اِن لوگوں

نے اسلامی تعلیمات اور تاریخ کے متعلق ایک منفی اور بگڑی ہوئی تصویر بڑی چالاکی سے وضع کی جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ یورپی اقوام کی 'مشرکین' (یعنی مسلمانوں) کے بارے میں رائے کو منفی طور سے متاثر کیا جائے۔ اگرچہ بعد میں مشرقیت مشنری اثر سے آزاد ہوگئی تھی اور استشراقیت مذہبی اور جاہلی تعصب سے بے پرواہ ہوگئی تھی، لیکن جہاں تک مستشرقین کی اسلام دشمنی کا تعلق ہے تو یہ ایک وراثتی جبلت اور فطری صفت تھی، وہی دشمنی جو فی الحقیقت صلیبی جنگوں کا سبب تھی''۔ مغرب کو ورثے میں ملنے والی یہ کدورت آج بھی اہلِ مغرب کے سینوں میں اسلام اور مسلم دشمنی کی آگ بھڑکائے ہوئے ہے۔ عالمِ اسلام سے باہر حتیٰ کہ اسلامی علاقوں میں مسلمانوں کے لیے بھی وہ اسلام کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ اسلام کوئی خوفناک دیو ہے اور انسانیت کیلئے ایک خطرہ ہے جو انسانیت کی اِس ''ترقی'' کو تباہ کردیگا۔ اُن کی بنائی ہوئی اسلام کی اس تصویر کی آڑ میں دراصل وہ خوف ہے جو اُنہیں لاحق ہے کہ اگر اسلام واقعی لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں راسخ ہوگیا تو استعماری کفار کا عالمِ اسلام میں تسلط زائل ہوجائیگا اور اسلامی ریاست پھر اُٹھ کھڑی ہوگی جو اسلام کی دعوت لے کر سارے عالم تک کما حقہ پہنچائے گی۔ تاہم یہ ریاست انشاءاللہ آ کر رہے گی، یہی انسانیت کے مفاد میں ہے اور خود مغرب کے بھی مفاد میں ہے اور عنقریب اِن مشنریوں کی ساری محنت دھواں ہوجائیگی اور وہ حسرت زدہ رہ جائیں گے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ﴾

''بے شک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لئے خرچ کررہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے روکیں سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہی رہیں گے، پھر یہ مال ان کے حق میں باعثِ حسرت ہوجائے گا۔ پھر یہ مغلوب ہوجائینگے'' (الانفال:36)

یقیناً اِن کی تمام اسلام دشمن تحریکوں اور سرگرمیوں کے پسِ پردہ یہی اسلام اور مسلمانوں سے بغض و عناد ہے، جو اِنہیں ورثے میں ملا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مغربی سکالر جب مجوسیت، ہندو

مذہب یا کمیونزم کے بارے میں اپنی علمی تحقیقات کرتے ہیں تو اس میں بغض اور تعصب نظر نہیں آتا اور جب وہی سکالر اسلام پر علمی تحقیق کرتے ہیں تو اُن کا بغض، عناد اور کراہیت ظاہر ہو جاتی ہے، اگرچہ مسلمان اُن سے شدید شکست کھا چکے ہیں اور استعماری کفار کے تسلط میں ہیں۔ اس کے باوجود مغربی چرچ اور اُن کی پشت پناہی کرتا استعمار، ہمیشہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کی توہین کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ اور اُن کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں گھٹیا باتیں کرتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اپنی تہمتیں شامل کر دیتے ہیں، یہ سب وہ انتقام کے طور پر اور استعمار کے قدم جمانے کیلئے کرتے ہیں۔

باب نمبر 42

مشنری حملوں کے اثرات

مشنری حملوں نے ہی یورپی استعمار کیلئے راستہ ہموار کیا تھا یعنی یورپ نے مسلمانوں کے خلاف سیاسی فتح اس وقت حاصل کی جب اس سے قبل اس نے مسلمانوں کو ثقافتی طور پر فتح کر لیا۔ اس سے قبل جب مسلمانوں نے استنبول اور بلقان کو فتح کر کے اسلامی فکری قیادت کو یورپ تک پہنچایا تھا اور اسلام کو یورپ میں داخل کیا تھا، تو اُس وقت سے ہی عالمِ اسلام مغرب کے لیے ہدف بن گیا۔ پس مغرب نے اپنی فکری قیادت، اپنی تہذیب اور زندگی کے بارے میں اپنے تصورات کا بیج اسلامی دنیا میں بودیا اور اس کے لیے کبھی سائنس، کبھی مذہبی تبلیغ اور کبھی انسانیت کے نام پر تمام وسائل استعمال کیے۔ اُس نے اپنی تہذیب اور نظریات کی تبلیغ پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی تہذیب اور زندگی کے متعلق اسلام کے تصورات کو اپنے طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا۔ اس طرح مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ، سیاسی شخصیات اور عام عوام سب کے ذہن اس سے متأثر ہو گئے۔

جہاں تک تعلیم یافتہ طبقے کا تعلق ہے تو استعمار نے اسلامی ریاست پر قبضے سے قبل مشنری سکولوں میں اور اسلامی ریاست پر قبضے کے بعد تمام سکولوں میں خاص تعلیمی پالیسی نافذ کی جو اُن کے فلسفۂ حیات، تہذیب اور تصوراتِ زندگی پر مبنی تھی۔ پھر استعمار نے مغربی شخصیت کو مسلمانوں

کے لیے ثقافتی رول ماڈل کے طور پر پیش کیا، اور مسلمانوں نے ان کی تاریخ، ارتقاء اور رہن سہن کے طور طریقوں سے اپنی عقلوں کو بھر لیا۔ انہوں نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے نظام تعلیم کی باریک تفصیلات میں بھی مداخلت کی تاکہ کوئی ایسی چیز چھوٹ نہ جائے جو اُن کے فلسفۂ حیات اور تہذیب سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ اسلامی دینی تعلیم اور اسلامی تاریخ میں بھی ایسا ہی کیا گیا کیونکہ تعلیمی پالیسی مغربی بنیادوں پر استوار تھی اور ان کے افکار و تصورات پر مبنی تھی۔ آج بھی اسلامی دنیا کے تعلیمی اداروں میں دینِ اسلام کی تعلیم ایک روحانی اور اخلاقی مذہب کے لحاظ سے دی جارہی ہے جو مغرب کے تصورِ دین کے مطابق ہے۔ اسلام کی تعلیم اس انداز سے دی جاری ہے جو زندگی کی حقیقت اور زندگی کے تصورات سے کوسوں دور ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے کام سے الگ کر کے پڑھایا جاتا ہے اور طالب علم اسے اس طرح پڑھتا ہے جیسے مثلاً نپولین یا بسمارک کی سوانح حیات ہو۔ اسی سبب ہمارے طلباء میں رسول اللہ ﷺ کی نسبت کوئی احساسات و افکار نہیں اُبھرتے۔ عبادات و اخلاق کے مضامین جو دینی تعلیم کا حصہ ہیں، وہ بھی اس نقطۂ نظر سے پڑھائے جاتے ہیں کہ یہ منفعت کا باعث ہیں۔ پس دینِ اسلام کی تعلیم بھی مغربی نظریات کے مطابق رواں ہے۔ اسلامی تاریخ کی تعلیم کو بھی بری نیت کے تحت بگاڑا گیا ہے اور تاریخ کے متعلق انصاف پسندی و عدم تعصب اور علمی بحث کے نام پر اسلامی تاریخ کی سیاہ تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم دانشوروں نے اسی نہج اور اسلوب پر اسلامی تاریخ کو مرتب کیا جو کہ مشنریوں کا تھا۔ یوں تمام کا تمام تعلیمی نصاب مغربی فلسفۂ حیات پر استوار کیا گیا اور اسے مغربی نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ اس کے نتیجے میں مسلم دانشوروں کی اکثریت مغربی ثقافت سے متاثر ہوگئی اور اس قدر متاثر ہوئی کہ یہ اُن کی زندگیوں پر چھا گئی، وہ اس سے محبت کرنے لگے اور اپنی زندگیاں اس ثقافت کے تصورات کے مطابق ڈھالنے لگے۔ یہاں تک کہ اگر کہیں اسلامی اور مغربی ثقافت میں تضاد نظر آتا تو وہ اسلامی ثقافت کو رد کر دیتے۔ یہ دانشور مغربی ثقافت اور مغربی نقطۂ نظر کو ہی فیصلے کی بنیاد بناتے۔ اس تعلیم یافتہ طبقے کو

مغربی ثقافت کے ساتھ اس قدر وفاداری اور مرعوبیت تھی کہ وہ مغربی شخصیت اور مغربی تہذیب پر فدا تھے۔ یہ لوگ اسلام اور اسلامی ثقافت کو اسی طرح حقیر سمجھتے تھے جیسے مغرب سمجھتا تھا اور اسلام اور اسلامی ثقافت کو اسی طرح نقصان دہ گردانتے تھے جیسے مغرب گردانتا تھا۔ اور جس طرح اُنہیں باور کرایا گیا تھا ٹھیک ویسے ہی لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اسلام ہے۔ یوں مشنری حملوں کو اپنے ایجنڈے میں بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی اور مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ہی دشمنوں کی صفوں میں کھڑا ہو کر اسلام اور اسلامی نظریات پر حملے کرنے لگا۔

یہ وبا محض یورپ یا یورپی تعلیمی اداروں کے تعلیم یافتہ افراد تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ پھیلتے پھیلتے وہ لوگ بھی اس کی زد میں آ گئے جو اسلامی ثقافت کے داعی تھے۔ جب استعماری مغربی نے اسلام پر تہمت لگانا شروع کی تو اِنہوں نے ہر طرح سے ان الزام تراشیوں کا جواب دینے کی کوشش کی خواہ یہ جواب صحیح تھا یا غلط۔اور خواہ جس بات کی تہمت لگائی جا رہی ہے وہ اسلام کا کوئی امتیازی پہلو ہے یا اسے اسلام سے جھوٹا منسوب کر دیا گیا ہے۔ اُن لوگوں کے ایسے جوابات سے یہ بات طے شدہ ہو جاتی ہے کہ اسلام ہی موردِ الزام ہے، پھر وہ اسلامی نصوص کی غلط تاویلیں کرتے تا کہ کسی طرح اسلام کو مغربی تصورات سے ہم آہنگ ثابت کیا جا سکے اور اُن کے کمزور جوابات سے مشنری حملے کو مزید تقویت مل رہی تھی، بجائے کہ یہ جوابات مغربی الزام تراشی کا رد ہوتے۔ اگرچہ مغربی تہذیب اسلام کی تہذیب سے یکسر مختلف ہے، انہوں نے مغربی تہذیب کے تصورات کو اختیار کر لیا اور دھکے سے اور غلط طور پر انہیں اسلام سے منسوب کرنے لگے کہ یہ اسلام ہی کے تصورات ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ یہ کہتے تھے کہ درحقیقت مغرب نے اپنی تہذیب اسلام اور مسلمانوں سے ہی اخذ کی ہے اور وہ اسلام کے احکامات میں ردوبدل کر کے انہیں مغربی تہذیب کے مطابق بنانے لگے، اگرچہ اسلام اور مغربی تہذیب ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یوں انہوں نے مغربی تہذیب کو بلا جھجک قبول کر لیا اور جب انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا عقیدہ اور تہذیب مغربی تہذیب کے موافق ہے تو وہ مغربی تہذیب پر مطمئن ہو گئے۔ یعنی ان لوگوں نے

مغربیت کو پوری طرح سے اختیار کرلیا تھا اور اسلامی تہذیب کو خیر باد کہہ دیا۔ اور یہی مشنریوں کی اور مغربی استعمار کی کامیابی اور اُن کے مقصد کی تکمیل بھی تھی۔ تعلیم یافتہ طبقے کے بیرونی ثقافت سے آراستہ ہونے اور اسلامی ثقافت کے متعلق سوءِفہمی رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگیوں میں مغربی تصورات رائج ہو گئے اور ان کی زندگی مغربی مادی تہذیب اور مغربی تصورات کے تابع ہوگئی۔ چنانچہ اکثر مسلمان اس بات سے واقف نہیں کہ حکومت میں جمہوریت کا نظام اور اقتصاد میں سرمایہ دارانہ نظام درحقیقت کفریہ نظام ہیں۔ اور جب مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے علاوہ قوانین کے ذریعے حکمرانی ہونے لگی تو مسلمانوں نے اس تبدیلی کو محسوس ہی کیا اور نہ ہی اُنہیں کوئی تشویش ہوئی۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو فراموش کر چکے تھے کہ:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾

''اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے ذریعے فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔'' (المائدہ: 44)

یہ اس وجہ سے تھا کہ مغربی تہذیب، جو اس بنیاد پر قائم ہے کہ دین کو ریاستی امور سے بے دخل رکھا جائے، وہ معاشروں میں غالب ہوچکی ہے اور مغرب کے مادی تصورات ماحول پر اثر انداز ہو چکے ہیں۔ مسلمان بس اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ اگر وہ محض اللہ ﷻ کی ذات پر ایمان رکھیں اور نمازوں کی پابندی کریں تو وہ دین کے فرائض کو پورا کر رہے ہیں، خواہ وہ اپنے دنیاوی معاملات اس طرح چلائیں جیسے بھی وہ مناسب سمجھیں اور جیسے اُنہیں پسند ہوں۔ اُن کی اِس سوچ کی وجہ مغربی تصورات سے متأثر ہونا ہے، جو یہ کہتے ہیں: ''جو قیصر کا حق ہے وہ قیصر کو دو اور جو اللہ کا حق ہے وہ اللہ کو دو''۔ اور اسلامی تصورات ان پر اثر نہیں رکھتے، جن کے مطابق قیصر اور جو کچھ قیصر کا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، اور جو یہ قرار دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی نماز، خرید و فروخت، لین دین، کرایہ داری، حکومتی نظام، تعلیم سبھی کے متعلق ہیں۔ مسلمانوں میں یہ تصورات اثر نہیں رکھتے، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو پڑھتے ہیں:

﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾(المائدہ: 49)

''اور یہ کہ آپ ﷺ ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ کریں''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقررمدت کیلئے آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو'' (البقرۃ:282)

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾

''اور جو شخص اس کے بعد بھی کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی ہے رسول ﷺ کی مخالفت کریگا، اور اہلِ ایمان کی راہ کے سوا کسی اور راہ پر چلے گا، اسے ہم اسی راہ پر چلتا کر دینگے جس کو اس نے اختیار کیا ہوگا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے، جو بدترین ٹھکانہ ہے'' (النساء: 118)

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾

''ایسا تو نہیں چاہیے تھا کہ اہلِ ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں؛ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اِن کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے تا کہ وہ دین میں سمجھ حاصل کرتے، اور تا کہ وہ اپنے لوگوں کو خبردار کرتے، جبکہ وہ ان کی طرف لوٹتے، تا کہ وہ بچتے'' (التوبۃ: 122)

گو کہ مسلمان ان آیات کی تلاوت تو کرتے تھے، لیکن انہوں نے ان آیات میں موجود تصورات کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے قرآن کو اس طرح نہیں پڑھا جس طرح پڑھا جانا چاہئے کہ یہ ایک جیتا جاگتا وجود ہے جس کے مطابق کارزارِ حیات میں عمل کرنا ہے اور اسے زندگی کے میدانِ عمل میں نافذ کرنا ہے، انہوں نے قرآن کو اس حال میں پڑھا کہ ان کے اذہان پر مغربی تصورات چھائے ہوئے تھے، مسلمان اِن آیات کی روحانیت سے تو متاثر ہوتے ہیں لیکن اِن آیات کے معانی ومفاہیم اور ان کے اذہان کے درمیان ایک آڑ بن گئی ہے کیونکہ مغربی تہذیب ان کے لیے

فیصلہ کن بن گئی ہے اوران کے ذہنوں پر مغربی افکار کا غلبہ ہے۔ عوام اور مغربی ثقافت زدہ اور دینی علوم سے آراستہ سبھی کا یہ حال ہے۔

جہاں تک سیاست دانوں کا تعلق ہے تو معاملہ اس بھی زیادہ سنگین اور نتائج اس سے بھی زیادہ مہلک ہیں۔ جب کافر استعمار نے اِن سیاسی لوگوں کو چھانٹ کر جمع کیا اور اُنہیں مال و دولت کے خواب دکھا کر خلافتِ عثمانیہ کے خلاف محاذ آراء کیا، تب سے ہی یہ لوگ استعماری کفار کے شانہ بشانہ چل رہے ہیں اور اُن کے بنائے ہوئے منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ کے دوران بھی یہ سیاست دان اسلامی ریاست کے خلاف بیرونی طاقتوں کی حمایت کر رہے تھے اور اپنی ہی ریاست کے خلاف ان کی مدد کر رہے تھے۔ باوجود یہ کہ اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں لیکن یہ گروہ اس کی پرواہ کئے بغیر ایسا کرتا رہا اور اپنے اِس عمل کو باعثِ افتخار سمجھتا تھا، اور ہر موقع ومناسبت پر اور ہر تقریب پر اس کا فخر یہ ذکر بھی کرتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اِن لوگوں کو چاہئے تھا کہ وہ ریاست کی اصلاح کے لیے حکمرانوں سے جدوجہد کرتے، لیکن اِن لوگوں نے اپنی ریاست کے خلاف کفار کا ساتھ دیا۔ اس کا کڑوا نتیجہ یہ ہوا کہ استعماری کافر کا ان کے علاقوں پر قبضہ ہو گیا۔ پھر انہوں نے یہ کیا کہ بجائے وہ اِن کفار پر غلبہ حاصل کرنے کیلئے عوام سے مدد حاصل کرتے، اِنہوں نے عوام پر غلبہ پانے کیلئے استعماری کفار سے مدد مانگی! سیاست دان ان استعماری کفار کے افکار ونظریات سے اس قدر متاثر ومرعوب تھے کہ اِن کی اپنی اسلامی شخصیت زائل ہو گئی، اوران کے افکار مخصوص سیاسی اور فلسفیانہ آراء کے داخل ہونے کے نتیجے میں زہر آلود ہو گئے، جس نے زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر اور جدوجہد کے تصور کو فاسد کر دیا، اور یوں پھیلتے پھیلتے ساری اسلامی فضاء فاسد ہو گئی اور زندگی کے مختلف معاملات سے متعلق افکار مبہم ہو گئے۔

پس جہاد کی جگہ مذاکرات نے لے لی اور وہ اس اصول پر یقین رکھنے لگے: ''جو کچھ مل سکتا ہے اسے جانے نہ دو اور پھر مزید کا مطالبہ کرو'' استعماری آقاؤں کی نظر میں یہ سوچ علاقے میں ایک بڑی فوج کو برقرار رکھنے سے زیادہ فائدہ مند تھی۔ اِن کی نظروں کا قبلہ وکعبہ استعماری

کفار تھے جن سے یہ مدد مانگتے تھے اور انہی پر انحصار کیا کرتے تھے، جبکہ اِنہیں یہ شعور ہی نہیں تھا کہ استعماری کفار سے کسی بھی قسم کی مدد طلب کرنا ایک کبیرہ گناہ ہے اور سیاسی اعتبار سے خودکشی کے مترادف ہے۔ اِن سیاست دانوں نے چھوٹے چھوٹے علاقوں کو اپنی کوششوں کا محور بنا لیا اور اُنھوں نے یہ نہیں سمجھا کہ علاقائیت پر مبنی سیاست کوششوں کو رائیگاں بنا دیتی ہے کیونکہ علاقائیت کی سوچ درست زندگی کے لیے درکار سیاسی وغیر سیاسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآء ہونے سے قاصر ہے، خواہ وہ علاقہ کتنا ہی وسیع وعریض ہو۔

سیاست دانوں نے اس پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ انہوں نے ذاتی مفادات کو اپنی توجہ کا محور بنا لیا اور ان کی عمومی توجہ کا محور بیرونی ریاستیں تھیں، جس کے باعث وہ اپنی توجہ کے فطری محور ومرکز یعنی آئیڈیالوجی سے دور ہوتے گئے، نتیجتاً کامیابی کی راہ مسدود ہوگئی، اب وہ خواہ کتنی بھی جدو جہد کرتے اور اُن کی کوششیں خواہ کتنی ہی مخلص ہوتیں، کامیابی کا کوئی امکان ہی باقی نہ تھا۔ اور اُن کی تمام سیاسی کوششیں بے ثمر ہوگئیں۔ اور امت میں شعور کی جانب کوئی بھی جنبش ایک ایسے چوپائے کی بے ہنگم اور متضاد حرکت کی مانند ہوگئی جس کی گردن پر چھری چلا دی گئی ہو، پس یہ کوششیں ناامیدی اور حالات کے سامنے سرنگوں ہونے کی صورت میں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ جب سیاسی جماعتوں کی قیادت کی توجہ اپنے طبعی مرکز (یعنی اسلامی آئیڈیالوجی) سے ہٹ گئی تو باقی امت بھی اس طبعی مرکز کے بارے میں غفلت کا شکار ہوگئی۔ اسلامی علاقوں میں قومیت، اشتراکیت، وطن پرستی، کیمونزم، روحانیت، اخلاقیات اور تعلیم وارشاد کی بنیاد پر تحریکیں کھڑی ہونے لگیں، اور یوں سیاست دانوں کے افکار غلط آراء سے زہر آلود ہوئے، جیسا کہ وہ بیرونی آئیڈیالوجیز سے زہر آلود ہوئے تھے۔ ان تحریکوں کا وجود مصیبت بالائے مصیبت تھا اور معاشرے کی مشکلات میں مزید اضافہ تھا جن کے نیچے معاشرہ پہلے ہی سسکیاں لے رہا تھا۔ یہ تحریکیں نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہوگئیں اور اپنے ہی گرد گھومنے لگیں کیونکہ انہوں نے مغربی تہذیب کے مفاہیم وتصورات سے ہم آہنگی اختیار کی نیز مشنری سرگرمیوں کے اثرات ان پر بھی پڑے۔ اور امت کا رخ زندگی کے متعلق مغربی تصورات

کے مطابق ہو گیا، علاوہ ازیں ان تحریکوں نے امت کے جذبات کو ایسی سرگرمیوں میں مصروف کر کے ٹھنڈا کر دیا کہ جن کا نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ ہی یہ سرگرمیاں خیر و بھلائی کا موجب تھیں۔ اور استعمار کو دوام واستحکام حاصل ہو گیا۔ پس مشنری حملے کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

باب نمبر 43

عالمِ اسلام پر سیاسی حملہ

اندلس پر حملے کا سبب انتقام کا وہ جذبہ تھا جو صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد مغرب کے دلوں میں بھرا ہوا تھا۔ ان جنگوں میں مغرب عالمِ اسلام سے ذلت آمیز شکست اٹھا کر بھاگا تھا اور اس رسوائی کے سبب ان کے دل انتقام کی آگ سے جل رہے تھی اور اُن کے سینے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت، بغض اور کراہت سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے مشرقی علاقے اتنے مضبوط تھے کہ وہ مغرب کے حملے کو روک سکتے تھے اور اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود مغرب کو منہ توڑ جواب دینے پر قادر تھے، پس مغرب نے اپنے انتقام کا نشانہ اندلس کو بنایا اور وہاں انتہائی وحشیانہ پن کا مظاہرہ کیا، اس نے گھر جلائے، لوگوں کے سر تن سے جدا کرنے کیلئے مشینیں (Guillotine) استعمال کیں اور لوگوں کو زندہ جلانے کے مرکز قائم کیے۔ درندوں سے بھی زیادہ وحشیانہ حرکتوں پر یورپ کو ذرا بھی ندامت نہیں ہوئی۔ یورپ نے اس انتقام کو جاری رکھا کیونکہ اس پر واضح تھا کہ باقی مسلمان اندلس کی مدد کے لیے نہیں آئیں گے، جبکہ اُس وقت مسلمانوں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اہلِ اندلس کی مدد کرتے تاہم اُنہوں نے اِس میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کی اِس کاہلی اور دستبرداری کے باعث اندلس دشمنوں کیلئے تر نوالہ بن گیا۔ یورپ کو تو مزید انتقام کی خواہش تھی، لیکن مسلمانوں کی قوت اور ریاستِ عثمانیہ کا یورپ کے مشرق میں حملے کر کے اس کے علاقوں کو فتح کر لینا، یہ وہ سبب تھا جس کی وجہ سے یورپ اسلامی ریاست

کے مزید حصوں پر حملہ کرنے سے باز رہا، اُسے خوف تھا کہ کہیں پھر وہ صلیبی جنگوں کی مانند شرمناک شکست سے دوچار نہ ہو جائے۔ یورپ اٹھارویں صدی کے نصف تک مزید حملوں سے رُکا رہا، اس وقت تک عالمِ اسلام جمود کا شکار ہو چکا تھا، مسلمان اسلام کی دعوت کو پھیلانے کی ذمہ داری سے دستبردار ہو چکے تھے اور ان کے نفوس میں اسلام کی حرارت ماند پڑ چکی تھی اور نتیجتاً دشمن کے دلوں سے مسلمانوں کی دہشت بھی زائل ہو چکی تھی۔ دوسری جانب مشنریوں کی تبلیغی اور ثقافتی مہم زوروں پر تھی۔ ان حالات میں سیاسی حملے شروع ہوئے جن کا ہدف اسلامی ریاست کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اُنہیں ہڑپ کر جانا تھا۔ عالمِ اسلام کو اس طرح فتح کر لینا یورپ کیلئے حقیقتاً شاندار فتح تھی۔

روس نے ملکہ کیتھرین (1762ء تا 1796ء) کے عہد میں عثمانیوں سے جنگ کی اور فتح یاب ہوا، روس نے کئی علاقے اپنے قبضے میں لے لئے جن میں آزوف کا شہر اور جزیرہ نمائے کریمیا اور بحر اسود کے شمالی کنارے کا تمام علاقہ شامل تھا۔ اس نے جزیرہ نمائے کریمیا میں سیواستاپول کا شہر قائم کیا اور بحیرۂ اسود کے کنارے اودیسیا کی تجارتی بندرگاہ قائم کی۔ روس خلافتِ عثمانیہ کی خارجہ سیاست کیلئے بڑی تشویش کا باعث بن چکا تھا کیونکہ اس نے رومی ولایتوں پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ خود کو ریاستِ عثمانیہ میں بسے عیسائیوں کا محافظ تصور کرتا تھا۔ 1884ء میں روس نے ترکستان کو ترکی سے چھین لیا اور پھر باقی علاقوں کو حاصل کر کے تمام وسط ایشیاء پر قابض ہو گیا۔

معاملہ صرف روس تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس میں تمام مغربی ممالک شامل تھے، چنانچہ یکم جولائی 1798ء کو نپولین نے مصر پر حملہ کر کے اُس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے فروری 1799ء میں شام کے جنوب پر حملہ کیا اور غزہ، رملّہ اور یافا پر قبضہ کر لیا اور وہ عکا کے قلعوں تک پہنچ گیا لیکن یہ حملہ کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے نپولین مصر لوٹ آیا اور بالآخر 1801ء میں اسے فرانس واپس جانا پڑا۔ گو کہ یہ حملے ناکام رہے لیکن ریاستِ اسلامی ان شدید حملوں سے لرز گئی تھی۔ اس کے بعد تو گویا کوئی بھی ملک ریاستِ عثمانیہ پر حملہ کرتا اور اُس کے علاقے پر قابض

ہو جاتا۔ 1830ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا اور تیونس پر چڑھائی کیلئے بڑھا اور یہاں تک کہ 1881ء میں اس نے تیونس کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد 1912ء میں وہ مراکش پر قابض ہو گیا۔ ادھر طرابلس 1911ء میں اٹلی کے ہاتھوں فتح ہو گیا تھا۔ اس طرح شمالی افریقہ مکمل طور سے اسلامی ریاست سے کٹ کر استعماری طاقتوں کی نو آبادیات بن گیا، جہاں اُن پر کفریہ نظام نافذ ہونے لگے۔

مغرب یہاں پر رُکا نہیں بلکہ وہ باقی علاقوں پر قبضے کے لیے بڑھا، چنانچہ برطانیہ نے 1839ء میں عدن پر حملہ کیا اور اپنے قبضے کو جنوبی یمن کے لحج سے لے کر جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں موجود یمن کے زیر انتظام نو علاقوں تک پھیلا دیا۔ اس سے کافی پہلے انگریز ہندوستان پر اپنا قبضہ جما چکے تھے اور مسلمانوں کے اقتدار کو مٹا کر خاص طور پر مسلمان آبادی کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنا رہے تھے کیونکہ انگریزوں سے قبل اقتدار مسلمانوں کے پاس تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی نو آبادی بنایا اور وہاں مسلمانوں کی قوت کو کمزور کرتے کرتے اسے بالکل ختم کر دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے 1882ء میں مصر اور 1898ء میں سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ ادھر ہالینڈ جنوب مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ پر اپنا اقتدار قائم کر چکا تھا۔ جبکہ افغانستان اور ایران ایک طرف سے برطانیہ اور دوسری جانب سے روسی حملے کے دباؤ میں تھے۔ یوں عالمِ اسلام کا ہر حصہ مغربی ممالک کے حملوں میں گھرا ہوا تھا اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب بس عالمِ اسلام مفتوح ہو کر اہلِ مغرب کے زیر اقتدار آنے ہی والا ہے اور صلیبی جنگیں پھر شروع ہو گئیں ہیں اور اس بار عیسائیوں کو ایک کے بعد دوسری فتح ملتی جا رہی ہے۔ ان مغربی حملوں کو روکنے اور ان کے دباؤ کو کم کرنے کیلئے کچھ اقدامات بھی کئے گئے۔ چنانچہ عالمِ اسلام کے کئی مقامات پر مزاحمتی تحریکیں اُٹھیں، الجزائر میں بغاوت کھڑی ہو گئی، ہندوستان کے مسلمان مزاحمتی عمل میں شریک ہوئے، سوڈان میں مہدیوں نے بھی مزاحمتی تحریک برپا کی اور سنوسی بغاوت نمودار ہو گئی۔ یہ مزاحمتیں اس بات کا مظہر تھیں کہ عالم اسلام میں تمام تر جمود اور کمزوری کے باوجود زندگی

کی رمق ابھی باقی ہے۔ البتہ یہ تمام کوششیں بالآخر ماند پڑ گئیں اور عالم اسلام کی حفاظت نہ ہو پائی۔ مغربی ممالک نے محض اپنے عسکری حملوں پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہ اسلام پر ثقافتی اور سیاسی یلغار بھی جاری رکھے ہوئے تھا اور مغرب نے صرف عالمِ اسلام کے علاقوں کو ہتھیانے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس نے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کرنے کے لیے اقدامات اس غرض سے شروع کیے کہ یہ اسلامی ریاست تھی جو مسلمانوں کی نمائندہ تھی۔ اس غرض سے انہوں نے عالم اسلام میں قومیت پرست تحریکوں کو آگے بڑھایا اور اسی پالیسی کے تحت یہ ممالک 1804ء سے ہی بلقان کے گروہوں کو انقلاب کیلئے اُکسا رہے تھے اور انہیں مدد فراہم کر رہے تھے، ان کی یہ کوششیں 1878ء میں رنگ لائیں، جب یہ انقلاب بلقان کی ریاستِ عثمانیہ سے آزادی پر منتج ہوا۔ اسی طرح مغربی ممالک نے 1821ء میں یونان میں شورش بھڑکائی اور آخرکار 1830ء میں یونان بیرونی مداخلت کے باعث خلافتِ عثمانیہ سے آزاد ہوگیا۔ اب خلافتِ عثمانیہ کا اقتدار قبرص، بلقان، کریٹ اور بحر روم کے اکثر جزیروں سے ختم ہو چکا تھا۔ اہلِ مغرب نے بلقان اور بحر روم کے جزیروں کے مسلمانوں کے ساتھ نہایت درندگی کا سلوک کیا اور بہت بڑی تعداد کو وہاں سے ملک بدر ہو کر عرب علاقوں میں پناہ لینا پڑی، اس حیثیت سے کہ یہ عرب علاقے اسلامی علاقے تھے اور اسلامی ریاست کا حصہ تھے۔ آج چیچنیا، بوشناک اور شیشان کے لوگ اُن جری جانبازوں کے فرزند ہیں جنہوں نے مغرب کے آگے اپنے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے اور خود کو کفر نظام کے ماتحت کرنے کی بجائے اپنے دین کی خاطر اسلامی حکمرانی تلے رہنے کے لیے اسلامی علاقوں میں ہجرت کر گئے تھے۔

مغربی ممالک اب اس سے اور آگے بڑھے اور خفیہ وسائل کے ذریعے اُنہوں نے مسلمانوں کے اندر موجود ایسی تحریکوں کی پشت پناہی کی جو اسلامی ریاست کو عربوں اور ترکوں میں تقسیم کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مغرب نے قوم پرست تحریکوں کو ابھارا بلکہ اس نے ترک اور عرب سیاسی جماعتوں کے قیام میں مدد فراہم کی مثلاً نوجوانانِ ترک پارٹی (Young

(Union and Progress Party) پارٹی برائے اتحاد وترقی، Turks)، تحریکِ آزادئ عرب، حزبِ عہد وغیرہ وغیرہ، جن سے ریاست میں افراتفری اور انتشار پیدا ہوا اور ریاست ایسے وقت میں عدم استحکام سے دوچار ہوگئی جب اسے بیرونی حملوں کا سامنا تھا۔ اسی اثناء میں پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوگیا۔ کافر قوتوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اسلامی ریاست سے اُس کے باقی علاقے بھی چھین لئے اور اسلامی ریاست کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹا کر اسلامی ریاست کا خاتمہ کردیا۔ خلافتِ عثمانیہ پہلی عالمی جنگ میں شامل ہوئی اور یہ جنگ اتحادیوں کی کامیابی اور اسلامی ریاست کی شکست پر منتج ہوئی اور فاتح مغربی ممالک نے پورے عالمِ اسلام کو آپس میں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کرلیا۔ اب اس ریاست کا صرف وہ حصہ بچا تھا جہاں ترک آباد تھے، جسے ترکی کا نام دیا گیا، جو 1818ء میں جنگ کے اختتام سے 1921ء تک مغربی ممالک کے رحم وکرم پر رہا اور پھر اتحادی ممالک نے اس ضمانت پر ترکوں کو 'آزادی' دے دی کہ وہاں دوبارہ اسلامی ریاست قائم نہیں کی جائیگی۔

باب نمبر 44

اسلامی ریاست کا خاتمہ

جنگ میں اتحادیوں کی واضح جیت کے بعد فریقین کے درمیان جنگ بندی معاہدے کا اعلان ہوا اور پہلی جنگِ عظیم اختتام کو پہنچ گئی جس کے بعد ریاستِ عثمانیہ کو توڑ کر اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا اور تمام عرب علاقوں پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ مصر، شام، فلسطین، عراق اور مشرقی اردن ریاستِ عثمانیہ سے کٹ چکے گئے اور ریاستِ عثمانیہ کے پاس ترکی کے علاقے کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا اور اُس میں بھی اتحادی داخل ہو چکے تھے۔ برطانیہ کے جہازوں نے آبنائے باسفورس پر قبضہ کر لیا تھا اور انگریزی فوج دارالخلافہ استنبول کے بعض حصوں میں اور دردنیل (Dardanelle) کے قلعوں کے ساتھ ساتھ پورے ملک کے ہر اُس حصے میں گھس آئی تھی، جو فوجی اعتبار سے اہمیت کا حامل تھا۔ استنبول کے باقی حصوں پر فرانس نے قبضہ کر لیا تھا اور اُس نے اپنے افریقی (سینیگالی) فوجیوں سے سڑکوں کو بھر دیا تھا۔ اِٹلی کے فوجیوں نے بیرا پر قبضہ کر لیا تھا اور تمام ریلوے لائنوں پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ اتحادی فوجی تمام پولیس، قومی گارڈز، بندرگاہوں کو کنٹرول کر رہے تھے۔ تمام قلعوں سے اسلحہ خالی کرا کر ترک فوج کی ایک تعداد کو برخاست کر دیا گیا تھا۔ جماعت برائے اتحاد و ترقی کو تحلیل کر دیا گیا تھا جبکہ جمال پاشا اور انور پاشا ملک چھوڑ کر فرار اور باقی اراکین روپوش ہو چکے تھے۔ توفیق پاشا کی قیادت میں ایک ناتواں سی حکومت بنا دی گئی جو ملک پر قابض دشمنوں کے حکموں کو نافذ کرنے لگی۔ اس وقت وحید الدین

خلیفہ تھے جو حقیقت وحالات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور اُن کا منشاء یہ تھا کہ ان احوال سے حکمت و دانائی سے نمٹا جائے، چنانچہ اُنہوں نے پارلیمنٹ کو برخاست کر کے اپنے نہایت مخلص دوست فرید پاشا کو وزیراعظم مقرر کیا۔ فرید پاشا نے خلیفہ کی پالیسی کی حمایت کی اور حلیف طاقتوں سے بجائے مزاحمتی رویہ کے بظاہر دوستانہ ہاتھ بڑھایا تا کہ وہ ملک کو تاراج کرنے سے باز رہیں کیونکہ جنگ کے خاتمے کے بعد اب اتحادیوں کیلئے یہ کام آسان ہوگیا تھا۔ فرید پاشا اپنے اس منصوبے پر عمل پیرا تھے، ترکی کے حالات بدستور ٹھنڈے تھے اور اتحادیوں کا غلبہ موجود تھا۔ یہ صورتحال 1919ء تک قائم رہی جب حالات تبدیل ہونا شروع ہوئے اور اتحادیوں کی پوزیشن کمزور پڑنے لگی۔ درحقیقت اس دوران فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے داخلی حالات سنگین ہوگئے تھے لہٰذا اُن کے مابین اختلاف ابھر آئے جو استنبول میں بھی ظاہر ہو رہے تھے جہاں وہ مالِ غنیمت کے بڑے حصے کو اپنے لئے مخصوص کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ہر ایک اہم ترین فوجی مراکز اور اقتصادی فائدوں کا سب سے بڑا حصہ حاصل چاہتا تھا۔ یہ ترکی کیلئے آخری موقع تھا کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھائے اور اپنے آپ کو ان سے چھڑا لے۔ ان ممالک کے آپسی اختلاف اور کمزوریاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ یہ ممالک اب ترکوں کو دوسرے اتحادیوں کے خلاف بھڑکانے اور مدد فراہم کرنے لگے تھے۔ اس وقت صلح کانفرنس منعقد نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی شرائط وضع کی گئیں تھیں، اس لئے عوام کو امید کی ایک کرن نظر آ رہی تھی اور وہ باور کر رہے تھے کہ اس وقت ایک مزاحمتی تحریک شروع کر دی جائے۔ انگریز نے اس صورتِ حال کو بھانپ لیا لہٰذا اُنہوں نے ایسی کسی ممکنہ تحریک کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کیلئے مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنے مہرے کے طور پر تیار کر لیا تھا جو اُن کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنائے اور ریاستِ خلافت کے خاتمے کے خواب کو پورا کرے۔ استنبول میں ہی دس سے بھی زیادہ خفیہ تنظیمیں بنیں جن کا مقصد دشمن فوجوں کے اسلحہ خانوں سے اسلحہ اور دیگر سامان چوری کر کے ملک بھر میں پھیلی خفیہ تنظیموں تک پہنچانا تھا۔ اس کام میں کچھ حکومتی عہدیدار بھی معاونت کر رہے تھے۔ وزارتِ دفاع کے ڈپٹی عصمت، افواج کے چیف آف اسٹاف فوزی، امورِ داخلہ کے وزیر فتحی اور وزیر برائے بحری افواج رؤف اس کام میں ان تنظیموں کی

مدد کررہے تھے۔ اس طرح متعدد تنظیمیں دشمن کی مزاحمت کرنے میں خفیہ طور سے برسرِ پیکار تھیں۔ جمعیتِ اتحاد وترقی پھر سے فعال ہوگئی تھی اوران تنظیموں میں کچھ فوجی سپاہی بھی شامل ہوگئے تھے۔ بعد میں یہ تمام تحریکیں اور تنظیمیں مصطفےٰ کمال پاشا کے زیرِ قیادت متحد ہوگئیں، جس نے حلیف طاقتوں کی مزاحمت اور اُنہیں ملک سے نکال باہر کرنے کیلئے ایک تحریک شروع کی تھی اوراس کے ساتھ ساتھ یہ طے کیا کہ اگر خلیفہ کی فوجیں ان کی راہ میں حائل ہوئیں تو وہ اُن سے بھی مقابلہ کریں گے۔ اس میں کمال پاشا کو بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی، یہ جواز بنا کر کہ استنبول میں مرکزی حکومت دراصل حلیف طاقتوں کے زیرِ اثر ہے، اُس نے اناتولیہ میں قومی حکومت بنالی۔

اسی نہج پر مصطفےٰ کمال نے اپنے انقلاب کو قومیت کا رنگ دے کر آگے بڑھایا، جو پھر خلافت کے خاتمے پر منتج ہوا اور ترکی اپنی ریاست کے دیگر تمام حصوں سے جدا ایک ملک بن کر رہ گیا۔ مصطفےٰ کمال کے انقلاب کے مطالعہ سے یہ بات بلا شک وشبہ واضح ہوجاتی ہے کہ یہ انقلاب انگریزوں ہی کے ایماء پر شروع کیا گیا تھا اوراُنہوں نے ہی مصطفےٰ کمال پاشا کو اس غرض کیلئے تیار کرکے کھڑا کیا تھا۔

مصطفےٰ کمال نے سیواس کے مقام پر ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں ترکی کی آزادی کو بچانے کے طریقوں پرغور وفکر کیا گیا، کچھ قراردادیں منظور کی گئیں اوراُن کے نفاذ کو یقینی بنانے کیلئے مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں ایک تنفیذی کمیٹی بنائی گئی۔ اس کانفرنس میں سلطان کو خبردار کیا گیا کہ وہ وزیرِ اعظم فرید پاشا کو برطرف کردیں اور ایک نئی پارلیمینٹ کیلئے آزادانہ انتخابات کرائیں۔ سلطان اس دباؤ میں آگیا اور فرید پاشا کو برطرف کرکے علی رضا کو وزیرِ اعظم نامزد کردیا۔ اس کانفرنس کے اراکین اِن انتخابات میں ایک جماعت کی حیثیت سے شامل ہوئے اور اپنے منشور میں ملک کو بچانے کے وعدے پر یہ لوگ بھاری اکثریت سے پارلیمینٹ میں آگئے۔

اس فتح کے بعد یہ کانفرنس اوراس کے اراکین انقرہ منتقل ہوگئے اور وہاں اپنا دفتر قائم کرلیا۔ یہاں اپنے اجلاس میں انہوں نے دوتجاویز رکھیں جن میں کہا گیا تھا کہ پارلیمینٹ استنبول میں منعقد کی جائے اوراس کانفرنس کو برخاست کر دیا جائے کیونکہ اس کے اراکین اب ممبرانِ پارلیمینٹ بن چکے ہیں۔ لیکن مصطفٰے کمال پاشا نے اِن دونوں تجاویز کی مخالفت کی اور کہا ''یہ ضروری ہے کہ کانفرنس بحثییت جماعت باقی رہے تاوقت یہ کہ پارلیمینٹ کی پالیسی کا درست اور قابلِ التزام ہونا ثابت نہ ہوجائے، چنانچہ پارلیمینٹ کودارالحکومت (استنبول) میں منتقل کردینا ایک بیوقوفی ہوگی، اگر آپ لوگ یہ کرتے ہیں تو آپ بیرونی دشمنوں کے رحم وکرم پر ہونگے۔ انگریزابھی بھی پورے ملک پر قابض ہیں اور وہاں حکام تمہارے معاملات میں مداخلت کرینگے اور ممکن ہے کہ آپ لوگوں کوگرفتار بھی کرلیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پارلیمینٹ کا اجلاس یہیں انقرہ میں ہی ہو، تاکہ اس کی خودمختاری کویقینی بنایا جاسکے''۔ مصطفٰے کمال پاشا نے اپنی رائے پر شدید اصرار کیا لیکن وہ اراکین کو قائل کرنے میں ناکام رہا، اراکین صدر مقام پہنچے اور خلیفہ سے اپنی وفاداری کا اعادہ کیااوراپنے کام میں لگ گئے، یہ احوال جنوری 1920ء کے ہیں۔

سلطان نے اراکین پارلیمینٹ کواپنی حکمتِ عملی کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی لیکن اراکین مُصِر تھے کہ وہ ہر حال میں اپنے ایجنڈے پر قائم رہ کر ہی ملک کی حفاظت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پھر جب اُن پر بیرونی طاقتوں کا دباؤ پڑا تو وہ سیواس میں منعقد اپنی کانفرنس میں منظور شدہ قراردادوں کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے لگے۔ اِن قراردادوں میں وہ شرائط تھیں جن پر اُنہیں امن قابلِ قبول تھا، جن میں سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ ترکی کی متعینہ حدود میں اسے مکمل خودمختاری اورسیادت حاصل ہو۔ حلیف طاقتیں اور خاص طور پر انگریز اس سے خوش تھے کیونکہ یہی اُن کا اصل مقصد تھااور وہ چاہتے تھے کہ ایسی آواز خودترک لوگ ہی اُٹھائیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو بھی علاقے خلافتِ عثمانیہ کے اسلامی ریاست ہونے کے ناطے اس کے زیرِسایہ تھے، جنگِ عظیم اول سے قبل ہی اِن حلیف ممالک نے قوم پرستی کی بنیاد پر اُنہیں

خلافتِ عثمانیہ سے الگ کرنے کا مسودہ تیار کرلیا تھا، مثلاً عراق، فلسطین، شام اور مصر وغیرہ، جنہیں حلیف ممالک اسلامی ریاست سے جدا کرنا چاہتے تھے اور قومیت یا وطنیت کی بنیاد پر آزادی دلانا چاہتے تھے۔ لہٰذا حلیف ممالک اور خاص طور انگریزوں کا ترک پارلیمنٹ کی ایسی قرارداد پر خوش ہونا فطری بات تھی کیونکہ یہ اُن کے منصوبے سے ہم آہنگ تھی۔ اُن کا منصوبہ یہی تھا کہ اسلامی ریاست کے اس قدر ٹکڑے ہو جائیں کہ اُن کا متحد ہونا ناممکن ہو اور وہ دوبارہ ایک مضبوط ریاست کی شکل اختیار نہ کرسکیں اور یوں مسلمانوں کی ریاست کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر اسلامی ریاست کی اِن ولایات میں آزادی کے مسودات منظور نہ ہوئے ہوتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی کیونکہ اسلامی ریاست ایک واحد ریاست تھی اور یہ تمام ولایات اس کا جزو تھیں، اور ان کا نظام وحدت پر مبنی تھا اور یہ علاقے وفاق کی شکل میں متحد نہ تھے، اس ریاست کی مختلف ولایات میں یکساں طور پر حکومت کی جاتی تھی، چنانچہ ترکی اور حجاز کے مابین کوئی فرق نہ تھا اسی طرح القدس اور اسکندریہ بھی برابر تھے کیونکہ پوری ریاست ایک ملک تھا۔ پہلی عالمی جنگ میں ترکی اور جرمنی حلیف تھے اور دونوں کو شکست ہوئی تھی، لہٰذا دونوں ممالک پر شکست کی شرائط کا یکساں طور پر اطلاق ہونا چاہیئے تھا۔ اور جس طرح جرمنی کے عوام نے اپنے ملک کی بالشت بھر زمین بھی چھوڑنے سے انکار کر دیا اور اُس کے ٹکڑے نہیں کیئے گئے، یہی سلوک ترکی کے ساتھ بھی ہونا چاہیئے تھا۔ حلیف طاقتیں اس حقیقت سے خوب آگاہ تھیں لیکن خود ترکوں نے ہی اپنے ملک کے ٹکڑے کر دینے کا مطالبہ کیا اور دوسری طرف عربوں نے بھی ایسی ہی بات کی تو ظاہر ہے کہ حلیف طاقتوں نے اِن مطالبات کو نہ صرف ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ اُن کی ہمت افزائی بھی کی، خاص طور پر ترکی میں کیونکہ اقتدار کی اکثریت کی نمائندگی وہاں موجود تھی۔

اسی لئے اتحادی طاقتوں نے ترک پارلیمنٹ کی اس قرارداد کو اپنی شاندار فتح سمجھا اور جوں ہی یہ قرارداد نشر ہوئی اور عوام تک پہنچ گئی تو اتحادی طاقتوں نے خود ہی ترکوں کو بیرونی افواج کے خلاف مزاحمت کی چھوٹ دیدی اور خود انگریز اور فرانس اپنی فوجوں کے انخلاء کے عمل میں لگ

گئے اور اپنی فوجیں واپس بلانے لگے۔ اس سے ترکوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اب انہوں نے اپنی مزاحمت کا رُخ اتحادی طاقتوں کی بجائے سلطان کی طرف کر دیا اور ان کا مقصد سلطان کے خلاف انقلاب لانا بن گیا، لہٰذا سلطان کو فوجیں بھیج کر اس تحریک کو کچلنا پڑا۔ انقرہ کے سوا تمام ترک عوام سلطان کے ساتھ تھے اور قریب تھا کہ انقرہ بھی فتح ہو جاتا جو کہ بغاوت کا مرکز تھا، کیونکہ انقراء کے اطراف کے علاقے یکے بعد دیگرے سلطان کے جھنڈے تلے آ کر خلیفہ کی فوج میں شامل ہو رہے تھے اور مصطفیٰ کمال اور اُس کے حامی ایک سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے۔ لیکن مصطفیٰ کمال خلیفہ کے خلاف مزاحمت پر مُصر رہا اور وطن پرستوں کو مسلسل اُکساتا رہا اور اُن کے حوصلے بلند رکھے۔ ترکی کے علاقوں میں یہ افواہ پھیلائی گئی کہ انگریز فوجوں نے صدر مقام پر قبضہ کر لیا ہے، وطن پرستوں کو گرفتار کر لیا ہے اور پارلیمینٹ ہاؤس کو بزورِ طاقت بند کر دیا ہے اور یہ کہ سلطان اور اُن کی حکومت اس کام میں انگریزوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ اِن افواہوں سے صورتِ حال پلٹ گئی اور عوام سلطان کا ساتھ چھوڑ کر انقرہ کے وطن پرستوں کا ساتھ دینے لگے اور ترکی کے دفاع کیلئے مرد و عورت انقرہ میں جمع ہونے لگے۔ خلیفہ کی فوج سے سپاہی فرار ہو کر مصطفیٰ کمال کی فوجوں میں شامل ہو رہے تھے جو اس وقت ترکوں کی امیدوں کا مرکز اور اُن کے خوابوں کی تعبیر بن چکا تھا، چنانچہ اس کی قوت مضبوط ہوتی گئی اور سارے کا سارا ملک اس کے ماتحت ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ایک پیغام نشر کیا جس میں ترک قومی نمائندوں کے انتخابات کا اعلان کیا گیا تھا اور بیان کیا گیا تھا کہ ان نمائندوں کا ہیڈ کوارٹر انقرہ ہوگا۔ جب انتخابات ہو گئے اور نئے نمائندے جمع ہوئے تو انہوں نے اپنی اس کونسل کا نام ''قومی اسمبلی'' رکھا اور خود کو ترکی کی قانونی حکومت قرار دیتے ہوئے مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا صدر منتخب کر لیا اور انقرہ کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ تمام ترک اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اب مصطفیٰ کمال نے خلیفہ کی رہی سہی فوج کا خاتمہ کر کے خانہ جنگی کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد اس نے یونان کا رخ کیا اور کئی معرکے ہوئے جن میں شروع شروع میں تو یونان کا پلڑا بھاری رہا لیکن پھر بازی پلٹ گئی اور اس نے اگست 1921ء میں یونان پر برق رفتاری سے حملہ

کیا۔ اس وقت یونان ازمیر اور ترک ساحل کے کئی علاقوں پر قابض تھا۔ اس حملے میں ترکی کو فتح حاصل ہوئی اور مصطفیٰ کمال نے پھر ستمبر 1921ء میں جنرل عصمت کو ہیرنگٹن سے ملاقات کر کے تفصیلات طے کرنے کیلئے بھیجا۔ اس اجلاس میں اتحادی یونان کو ٹاریس سے نکالنے اور خود استنبول اور ترکی کے باقی علاقوں سے انخلاء کیلئے بھی راضی ہو گئے۔ حالات و واقعات کو بغور اور تسلسل کے ساتھ دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ اتحادیوں نے مصطفیٰ کمال کے مطالبات کو تب تسلیم کیا جب اس نے اس کے عوض اسلامی حکومت کے خاتمے کی حامی بھری۔ یہ بات اس امر سے واضح ہو جاتی ہے کہ جب فتوحات حاصل کرنے کے بعد ترکی کے مستقبل کے متعلق قومی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس میں مصطفیٰ کمال پاشا نے یہ بیان دیا: ''میں تمام اسلامی ممالک کے ایک ہونے میں یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی اس بات کو مانتا ہوں کہ تمام عثمانی عوام ایک ہیں۔ ہم میں ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو مناسب سمجھے اپنی رائے رکھے، البتہ حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ حقائق پر مبنی ایک ٹھوس پالیسی اختیار کرے اور اس کا بس ایک ہی ہدف ہو کہ وہ ملک کی قدرتی سرحدوں کے اندر اپنے وطن کی آزادی کو برقرار رکھے۔ کوئی وہم یا جذبات ہماری پالیسی پر اثر انداز نہ ہوں۔ اور نہ ہی بوسیدہ خواب اور خیالی باتیں اسے متاثر کریں کہ جو ہمیں ماضی میں بہت مہنگی پڑیں''۔

اس طرح مصطفیٰ کمال نے یہ اعلان کیا کہ اسے لوگوں کی ترک عوام ہونے کی حیثیت سے آزادی مطلوب ہے نہ کہ امتِ مسلمہ کی حیثیت سے۔ بعض سیاست دانوں اور اسمبلی ممبران نے مصطفیٰ کمال سے مطالبہ کیا کہ وہ اس نئی حکومت کی شکل اور اس پالیسی کو واضح کر دے کیونکہ یہ بات عملی نہیں کہ ایک ہی ملک میں دو حکومتیں ہوں جیسا کہ اس وقت معاملہ تھا کہ ایک عبوری حکومت جو بااقتدار تھی اور انقرہ میں قائم تھی اور دوسری قانونی حکومت جو استنبول میں قائم تھی اور جس کی قیادت سلطان اور اس کے وزراء کر رہے تھے اور جو بس برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ مصطفیٰ کمال نے اپنی اصلی نیت کو چھپاتے ہوئے اِن سوالات کے جواب نہیں دیئے۔ اس کی بجائے وہ خلیفہ وحید الدین کے خلاف یہ رائے عامہ ہموار کرنے میں مصروف ہو گیا کہ خلیفہ

انگریزوں اور یونانیوں سے ملا ہوا ہے۔ عوام خلیفہ وحیدالدین کے خلاف غصے میں تھے۔ اپنے حق میں پائی جانے والی اس فضاء کے ہوتے ہوئے اُس نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا تاکہ اُس میں سلطان اوراس کی حکومت کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کرے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ اراکینِ اسمبلی کو خلیفہ کی برخاستگی اوراس کے اقتدار کے خاتمے پر آمادہ کرسکتا ہے لیکن وہ خلافت کو نشانہ بنانے کی جرٗات نہیں کرسکتا کیونکہ یہ ایک حسّاس معاملہ تھا اور عوام کے اسلامی جذبات بھڑک جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اُس نے خلافت کا خاتمہ کرنے یا اُسے چیلنج کرنے کی بات نہیں کہی، بلکہ یہ تجویز رکھی کہ حکومت اور خلافت علیحدہ علیحدہ کردی جائیں۔ اس تجویز سے عملاً خلافت ختم ہوجاتی اور خلیفہ وحید الدین حکومت سے بے دخل ہوجاتے۔ نمائندگانِ قومی اسمبلی نے جیسے ہی یہ تجویز سنی تو وہ سکتہ میں آ گئے اوراس تجویز کو منظور کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خطرات کو محسوس کرنے لگے۔ لہٰذا اُنہوں نے اس تجویز پر گفت وشنید کا مطالبہ کیا۔ مصطفیٰ کمال اس تجویز پر بحث سے ڈرتا تھا لہٰذا اُس نے کہا کہ اس پر براہِ راست رائے شماری کی جائے، اس میں اسے 80 نمائندگان کی حمایت حاصل ہوئی جو سب کے سب اسکے ذاتی وفادار تھے۔ قومی اسمبلی نے یہ تجویز مسترد کرتے ہوئے اس کو اپنی قانونی کمیٹی کے سپرد کردیا تاکہ قانونی کمیٹی اس پر بحث کرسکے۔ دوسرے دن جب قانونی کمیٹی اس موضوع پر غور کرنے بیٹھی تو مصطفیٰ کمال اُن کے اجلاس کے کمرے میں داخل ہوا اوراُن کے کام پر نظر رکھنے کیلئے وہیں بیٹھ گیا۔ چند گھنٹے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا، اس کمیٹی میں علماء اور قانونی وکیل تھے جو اس تجویز کو شریعت کے نصوص کی روشنی میں جانچ رہے تھے اوراُن کی یہ رائے قائم ہوئی تھی کہ یہ تجویز شریعت کے مخالف ہے! کیونکہ اسلام میں دینی اور دنیاوی اتھارٹی کی علیحدگی کا تصور نہیں ہے، لہٰذا خلافت و حکومت ایک ہی چیز ہے، یہ ممکن نہیں کہ ایک چیز ہو جسے دین کہا جائے اور ایک دوسری چیز ریاست یا حکومت ہو۔ یہاں صرف ایک نظامِ اسلام ہے اور ریاست اسی کا حصہ ہوتی ہے جس کا کام اس نظام کو نافذ کرنا ہے۔ چنانچہ اس کمیٹی کو کوئی ایسا جواز نہیں ملا جس کے مطابق خلافت وحکومت کو اس طرح علیحدہ کردیا جانا صحیح ہو، بلکہ اُنہوں نے جانا کہ اس موضوع پر بحث ومباحثہ کی کوئی گنجائش ہے

ہی نہیں کیونکہ اس موضوع میں شریعت کی نصوص صریح و قطعی ہیں۔ پس اُنہوں نے طے کیا کہ اس تجویز کو مسترد کر دیا جائے۔ لیکن اتحادی طاقتوں کے ایماء پر اور ریاستِ اسلامی کو ترکوں ہی کے ہاتھوں ختم کرنے کیلئے برطانیہ نے جو کردار مصطفیٰ کمال پاشا کو سونپا تھا، اُس کے تحت وہ یہی چاہتا تھا کہ پہلے حکومت کو خلافت سے علیحدہ کرے اور پھر خلافت کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ جب اُس نے دیکھا کہ یہ کمیٹی اُس کی منشاء کے خلاف راستہ اختیار کر رہی ہے تو وہ غضبناک ہو گیا اور غصے میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور کھڑے ہو کر نہایت غصے سے چیخ کر کمیٹی کے کام میں رخنہ ڈالا، وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ''اے صاحبان! خلیفہ نے لوگوں سے طاقت کے زور پر اقتدار غصب کیا تھا، اور عوام نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ اقتدار قوت کے زور پر ہی واپس لے لیا جائے۔ خلافت کو حکومت سے بے دخل کر کے اسے تو برخاست کرنا ہی ہے اور یہ ہو کر رہیگا خواہ تم لوگ اسے پسند کرو یا ناپسند! البتہ اس اثناء میں تم میں کئی لوگوں کے سر کٹ جائینگے''! مصطفیٰ کمال کے اس آمرانہ خطاب کے بعد کمیٹی کا اجلاس ختم ہو گیا اور فوراً قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا تا کہ وہ اس تجویز پر بحث کرے۔ اسمبلی کے اجلاس کے دوران مصطفیٰ کمال نے محسوس کیا کہ اکثریت کی رائے اُس کی تجویز کے خلاف ہے یعنی تجویز کا مسترد کر دیا جانا طے ہے لہٰذا اُس نے اپنے وفاداروں کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اس تجویز پر اب بغیر کسی مزید بحث کے فوراً ہاتھ اُٹھوا کر رائے شماری کرالی جائے۔ نمائندگان نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس تجویز پر بغیر بحث کے رائے شماری ہونا ہی ہے تو پھر یہ رائے شماری ہاتھ اُٹھا دینے سے نہیں بلکہ ہر نمائندے کے نام کے ساتھ اُس کے ووٹ کے ذریعے ہو گی۔ مصطفیٰ کمال کو منظور نہیں تھا، وہ غصے میں چلایا: ''مجھے یقین ہے کہ قومی اسمبلی کے ممبران کو یہ تجویز منظور ہو گی، لہٰذا یہ کافی ہے کہ رائے شماری محض ہاتھ اُٹھا کر لی جائے''۔ غرض یہ کہ تجویز رائے شماری کیلئے رکھی گئی اور چند کے سوا کسی نے اِس تجویز کی حمایت نہیں کی، اس کے باوجود اعلان کر دیا گیا کہ اس تجویز کو قومی اسمبلی کے ممبران نے اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا ہے۔ اس سے نمائندگان سکتے میں آ گئے اور بعض اپنی کرسیوں احتجاجاً یہ کہتے ہوئے اچھل پڑے کہ یہ صحیح نہیں ہے، ہم نے اسے منظور نہیں کیا ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے حامیوں نے اِن نمائندگان کو خاموش کرنے کی کوشش

کی اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف اہانت آمیز فقروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ بہر حال قومی اسمبلی کے صدر نے پھر اعلان کیا کہ اسمبلی نے اراکین کے اتفاقِ رائے سے سلطنت کو برخاست کرنے کا فیصلے کیا ہے! اس کے بعد اجلاس برخاست کر دیا گیا اور مصطفیٰ کمال پاشا اپنے حامیوں کے جلو میں باہر چلا گیا۔ خلیفہ وحید الدین کو جب یہ خبر ملی تو وہ ملک سے نکل گیا اور اپنی جگہ اپنے بھتیجے عبدالمجید کو مسلمانوں کا خلیفہ نامزد کیا، لیکن اُسکے پاس کوئی اختیارات نہیں رہے تھے، چنانچہ اب ریاست شرعی حاکم کے بغیر ہوگئی تھی۔

اب جبکہ سلطنت یا حکومت کو خلافت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا تو پھر حکمران کون ہوگا؟ مصطفیٰ کمال تو شروع سے ہی خلافت کو سلطنت سے جدا کر دینے کا شدید عزم رکھتا تھا اور ایسا کر دینے سے پہلے اُس نے یہ بھی واضح نہیں کیا تھا کہ اب ترکی پر نئی حکومت کی شکل یا نوعیت کیا ہوگی؟ سلطنت کو برخاست کر دینے کے بعد اس نئی شکل کی وضاحت ناگزیر ہوگئی تھی۔ کیا مصطفیٰ کمال پاشا اس نئی دستوری حکومت کا صدر ہوگا اور خلیفہ کو کسی حقیقی اقتدار کے بغیر محض برائے نام رکھے گا؟ اگر ایسا ہے تو سلطنت کو برخاست کر دینے کے اُس فیصلے کی کیا حیثیت ہوگی؟ مصطفیٰ کمال نے وزارتیں تشکیل دینے سے انکار دیا تھا اور وہ اپنا منشاء بھی ظاہر کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اسکے بعد اپنی طاقت و اقتدار اور عوام پر حاصل حاکمیت کے بل پر اُس نے ایک جماعت وضع کی جس کا نام عوامی پارٹی رکھا جس کا مقصد عوامی رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنا تھا کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ باوجود اسکی قوت کے، خلافت کو حکومت سے علیحدہ کرنے پر قومی اسمبلی کی بڑی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ اب وہ اس بات پر غور کر رہا تھا کہ حکومت کی جو شکل اُس نے طے کر رکھی تھی اس کا اعلان کیسے کرنا ہے، یعنی ترکی کے ایک جمہوریت ہونے اور خود کو اس جمہوریت کا صدر ہونے کا اعلان۔ اس نے قومی اسمبلی کے خلاف شدید پروپیگنڈا مہم شروع کی جس سے ایک سیاسی بحران کھڑا ہوگیا اور حکومت نے اپنا استعفیٰ قومی اسمبلی کے حوالے کر دیا اور قومی اسمبلی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی کہ کون حکومت کی ذمہ داری سنبھالے۔ جب بحران شدید ہوگیا تو کچھ افراد نے قومی اسمبلی کے سامنے

تجویز رکھی کہ مصطفیٰ کمال وزارت سنبھالے اور اس بحران کو حل کرے۔ پہلے تو اُس نے اپنی عدم رغبت ظاہر کی لیکن پھر حامی بھر لی اور قومی اسمبلی کو مخاطب کیا: ''اے صاحبان! آج اِس بحران کی گھڑی میں آپ لوگوں نے مجھے طلب کیا ہے جبکہ یہ بحران اصل میں آپ ہی لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔ یہ مسئلہ کوئی عبوری نوعیت کا نہیں بلکہ ہمارے نظامِ حکومت کے ایک بنیادی خلل کے باعث ہے۔ اس وقت قومی اسمبلی کے ذمہ بیک وقت دو کام ہیں، ایک قانون سازی اور دوسرا اس کا نفاذ۔ قومی اسمبلی کا ہر نمائندہ کسی بھی وزارتی فیصلے میں مداخلت کرنا چاہتا ہے، کسی بھی حکومتی ادارے پر انگلی اٹھانا چاہتا ہے اور کسی بھی وزیر کے فیصلے میں دخل دینا چاہتا ہے۔ اے صاحبان! ان حالات میں کوئی بھی وزیر نہ اپنی ذمہ داری کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے نباہ سکتا ہے اور نہ ہی ایسا کوئی منصب قبول کرسکتا ہے۔ آپ پر لازم ہے کہ آپ اس بات کو سمجھیں کہ اس بنیاد پر کوئی حکومت قائم نہیں ہوسکتی، اور جب حکومت نہیں ہوتی تو افراتفری ہوتی ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ اس صورتِ حال کو تبدیل کریں۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ترکی ایک جمہوری ریاست ہوگی جس کا صدر انتخابات کے ذریعے منتخب ہوگا''۔ اس خطاب کے فوراً بعد ایک فرمان جاری کیا گیا، جو پہلے سے ہی تیار تھا جس میں ترکی کو جمہوریت اور مصطفیٰ کمال پاشا کو اس جمہوری ترکی کا پہلا صدر بتایا گیا تھا۔ اس طرح اُس نے اپنے آپ کو خود ہی ملک کا قانونی حکمران بنالیا۔

البتہ معاملات اُس نہج پر نہیں چلے جو کمال پاشا چاہتا تھا، حقیقت یہ تھی کہ ترک عوام تو بہر حال مسلمان تھے جبکہ جو کچھ کمال پاشا کررہا تھا وہ اسلام کے خلاف تھا۔ لہٰذا پورے ملک پر یہ بات آشکار ہوگئی کہ مصطفیٰ کمال اسلام کو ہی مٹا دینے کا ارادہ کئے ہوئے ہے۔ خود مصطفیٰ کمال کی ذاتی زندگی کے افعال اور تصرفات اس اندیشے کو پختہ کررہے تھے کیونکہ مسلمانوں کو جو کچھ نہایت عزیز تھا اور جس کی وہ تقدیس کرتے تھے، مصطفیٰ کمال اُن کا مذاق اُڑاتا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت کو یہ یقین تھا کہ انقرہ کے نئے حکام قابلِ لعنت کافر ہیں اور وہ خلیفہ عبدالمجید کے گرد جمع ہونے لگے تاکہ اقتدار پھر خلیفہ کے پاس آجائے اور وہ عبدالحمید کو حاکم بنا کر ان مرتدوں کا خاتمہ

کریں۔ مصطفیٰ کمال اس خطرے کو بھانپ چکا تھا اور اسے یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ عوام کی اکثریت اب اُس سے نفرت کرتی ہے اور اُسے زندیق، ملحد اور کافر تصور کرتی ہے۔ کافی غور وفکر کے بعد اُس نے خلیفہ اور خلافت دونوں کو بدنام کرنے کی مہم بڑے زور وشور سے چلائی اور قومی اسمبلی کو جوش دلایا اور وہاں سے ایک قانون کی منظوری دلوائی جس کی رو سے جمہوریہ ترکی کی مخالفت یا سلطان کی طرف جھکاؤ رکھنا قانوناً جمہوریہ ترکی سے بغاوت کے مترادف ہوگا اور اِس کی سزا موت مقرر کی گئی۔ اس کے بعد وہ ہر مجلس اور ہر موقع پر خاص کر قومی اسمبلی میں، اپنی دانست میں، خلافت کے نقصانات بتانے لگا تا کہ خلافت کے خاتمے کے لیے فضاء تیار کر سکے۔ جب بعض اراکینِ اسمبلی نے بین الاقوامی تعلقات اور سفارتی پہلوؤں سے خلافت کے فوائد بتائے تو کمال پاشا نے اُن کی مخالفت کی اور قومی اسمبلی سے کہا: ''کیا محض خلافت، اسلام اور دینی طبقے ہی کے باعث پانچ صدیوں سے ترک دیہاتی لڑتے مرتے نہیں آ رہے ہیں؟ اب وقت آ گیا ہے کہ ترکی ہندوستانیوں اور عربوں کو چھوڑے اور صرف اپنے مفاد کو مدِّ نظر رکھے اور مسلمانوں کی قیادت سے خود کو بچائے رکھے''!

اس طرح مصطفیٰ کمال نے خلافت کیخلاف مہم چلائی، وہ ترکوں کے سامنے خلافت اور خلیفہ کے نقصانات بیان کرتا۔ اُس نے خلیفہ اور اُن کے ساتھیوں کو ملک کے غدار اور انگریزوں کی کٹھ پتلی کے طور پر پیش کیا۔ اس نے اس پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ اُس نے خلافت کے حامیوں کو دہشت زدہ کرنے کی مہم چلائی۔ قومی اسمبلی کے ایک رکن نے جب خلافت کو ناگزیر بتایا اور دین کی حفاظت کا فریضہ یاد دلایا تو مصطفیٰ کمال نے اپنے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ اسی رات اُسے قتل کر دے، چنانچہ جب وہ رکن قومی اسمبلی سے اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو مصطفیٰ کمال کے آدمی نے اسے قتل کر دیا۔ مجلس ملی کے ایک اور رکن نے ایک تقریر کی جو دینی نوعیت کی تھی، کمال پاشا نے اُسے طلب کیا اور خبردار کیا کہ اگر اُس نے اپنا منہ بند نہ رکھا تو اُسے پھانسی دے دی جائیگی! اس طرح اُس نے ملک کے طول وعرض میں دہشت پھیلائی۔ کمال پاشا نے استنبول کے والی کو حکم دیا

کہ خلیفہ جب جمعہ کی نماز ادا کرنے کیلئے جائے تو اُس کی سواری کے جلوس کی شان بان کو ختم کر دیا جائے۔ خلیفہ کے پیروکاروں کو دھمکیاں دیں کہ وہ خلیفہ کا ساتھ چھوڑ دیں اور پھر خلیفہ کا وظیفہ کم کر کے نہایت حقیر سی رقم رکھی۔ کمال پاشا کے بعض اعتدال پسند حامیوں نے یہ سب کچھ دیکھا تو اُن کی اسلامی حمیت کو جوش آیا اور اُنہیں خلافت کے خاتمہ کا اندیشہ ہونے لگا تو اُنہوں نے خود کمال پاشا سے گزارش کی کہ وہی مسلمانوں کا خلیفہ بن جائے لیکن اُس نے اسے قبول نہیں کیا۔ اُس کے پاس مصر اور ہندوستان سے دو وفد آئے اور دونوں نے بار بار یہی گزارش کی کہ وہ خود مسلمانوں کی خلافت سنبھال لے لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ اب وہ خلافت کے منسوخ کئے جانے کے اعلان کی تیاری کر رہا تھا۔ کمال پاشا نے استعماری طاقتوں کے خلاف عوام، فوج اور قومی اسمبلی میں خوب نفرت پھیلائی جو درحقیقت محض ایک ڈھونگ تھا تا کہ خلیفہ کو اُن بیرونی طاقتوں کی کٹھ پتلی بنا کر بدنام کیا جائے اور وہ خلافت سے ہمدردی نہ رکھیں۔ اس طرح پورے ملک میں افواہیں پھیلائی گئیں اور ماحول کو خلیفہ کے مخالف بنایا گیا۔ جب پورا ماحول ان زہر آلود افواہوں کا شکار ہو گیا تو کمال پاشا نے اپنا اگلا قدم اٹھایا اور 3 مارچ 1924ء کو قومی اسمبلی میں قرارداد رکھی جو خلافت کی منسوخی، خلیفہ کی برطرفی اور اسلام کی حکومت سے بے دخلی پر مشتمل تھی۔ اس قرارداد کو پیش کرتے وقت اُس نے قومی اسمبلی سے خطاب کیا اور کہا: ''کس قیمت پر جمہوریہ ترکی کو جو خطروں میں گھری ہے بچایا جا سکتا ہے اور اسے مستحکم بنیادوں پر استوار کیا جا سکتا ہے؟ خلیفہ اور آلِ عثمان کی باقیات کو اب جانا ہی پڑیگا۔ وقت آ گیا ہے کہ دقیانوسی عدالتیں ختم ہوں اور اُن کی جگہ جدید طرز کی عدالتیں لیں جن میں نئے قوانین ہوں اور مذہبی لوگوں کے بوسیدہ مدارس اب نئے غیر دینی حکومتی مدارس کے لیے جگہ خالی کر دیں''۔ پھر اس نے 'دین اور ان لوگوں کو نشانہ بنایا جنہوں وہ ''مذہبی لوگ'' کہتا تھا، اس کے بعد اُس نے ایک ڈکٹیٹر کی مانند یہ قرارداد کسی بحث و مباحثے کے بغیر قومی اسمبلی سے منظور کرائی۔ پھر اُس نے استنبول کے حاکم کو حکم بھیجا کہ خلیفہ اگلے روز فجر سے پہلے ترکی چھوڑ جائے۔ حاکمِ استنبول کچھ پولیس کے سپاہی اور فوج کو لے کر نصف شب کو خلیفہ کے محل پہنچا اور خلیفہ کو مجبور

کیا کہ وہ موٹر کار پر سوار ہوا اور پھر خلیفہ کو ترکی کی سرحد سے پار کر دیا اور ساتھ میں ایک صندوق کے سوا کچھ لے جانے نہ دیا جس میں خلیفہ کے کچھ کپڑے اور تھوڑی سی نقدی تھی۔

اس طرح مصطفیٰ کمال نے اسلامی ریاست اور اسلامی نظام کا خاتمہ کر کے ایک سرمایہ دارانہ ریاست قائم کی جہاں سرمایہ دارانہ نظام رائج کیا گیا۔ اور اس طرح کفار اسلامی ریاست کے خاتمے کا جو خواب صلیبی جنگوں کے زمانے سے دیکھ رہے تھے، اسے مصطفیٰ کمال نے پورا کر دیا!

باب نمبر 45

اسلامی ریاست کے دوبارا قیام کو روکنا

پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر اتحادی طاقتوں نے اسلامی ریاست کے ہر حصے پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ اُن کا مقصد اسلامی ریاست کو ختم کرنا تھا اور اس طرح ختم کرنا کہ دوبارہ یہ ریاست کبھی قائم نہ ہو سکے۔ چنانچہ ریاست کے خاتمے کے بعد انہوں نے ایسے اقدامات شروع کیے کہ یہ ریاست دنیا کے کسی بھی حصے میں نہ اُبھر سکے۔ اُنہوں نے کئی منصوبے بنائے اور ایسے اقدامات کیئے کہ اسلامی ریاست کے نہ اُٹھنے کو یقینی بنایا جائے اور وہ آج بھی وہ اسی مقصد پر قائم ہیں اور اپنے اقدامات کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اسلامی علاقوں پر قابض ہونے کے بعد استعماری کفار نے منصوبے کے مطابق پہلے دن سے ہی اِن علاقوں پر اپنی اتھارٹی کو مضبوط بنانے کے لیے اقدامات شروع کر دیے۔ 1918ء میں قابض ہونے کے بعد اُنہوں نے 1922ء تک ان علاقوں میں اپنی فوجی حکومت قائم رکھی پھر انہوں نے کچھ علاقوں میں نمائندہ حکومت کے نام پر اور دیگر علاقوں میں مقامی خودمختاری کے نام پر اپنے کنٹرول کو مضبوط بنایا یہاں تک کہ 1924ء آ گیا۔ جس میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنے آقاؤں کے براہِ راست ایماء پر خلافت کو منسوخ کر کے ترکی میں جمہوریت قائم کی اور یوں اسلامی ریاست کے لوٹ آنے کی آخری امید بھی ختم ہوگئی۔ اس سال دشمن خاص طور پر برطانیہ نے ایسے

کئی اقدامات کیئے کہ جہاں کہیں بھی اسلامی ریاست کے احیاء کا ذرا بھی امکان ہواُسے وہیں ختم کردیا جائے۔ اسی سال حسین بن علی کو حجاز سے نکال کر کے قبرص میں قید کردیا گیا کیونکہ اُس کی نظر خلافت پر تھی۔ اسی سال انگریزوں نے اپنے ایجنٹوں کی مدد سے قاہرہ کی خلافت کانفرنس کے انعقاد میں مداخلت کی تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ یہ کانفرنس منسوخ اور ناکام ہوجائے۔ اور اسی سال انگریزوں نے ہندوستان میں تحریکِ خلافت کو ختم کرنے اور اس تحریک کی کاوشوں کو رائیگاں کرنے کے لیے اقدامات کیے اور اس تحریک کو ایک قومی اور وطنی رخ دے دیا۔ 1924ء میں ہی استعماری کفار کے زیرِاثر الازہر کے بعض علماء نے ایسی کتابیں تالیف کیں جن میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ دین کو ریاست سے الگ ہونا چاہیے، اسلام میں ریاست کا کوئی تصور اور حکمرانی کا کوئی نظام ہے ہی نہیں اور اسلام محض ایک روحانی مذہب ہے۔ اس سال عرب ممالک میں ایک بحث چھیڑ دی گئی کہ آیا مسلمانوں کے حق میں عرب لیگ زیادہ مفید اور قابلِ عمل ہوگی یا اسلامی لیگ؟ اخباروں اور رسالوں میں سالوں یہ بحث ہوتی رہی، جبکہ عرب لیگ اور اسلامی لیگ دونوں ہی لاحاصل ہیں اور دونوں کا مقصد اصل موضوع یعنی اسلامی ریاست کے قیام، سے توجہ پھیرنا تھا۔ پس ان کوششوں سے استعماری کفار نے مسلم دنیا کے لوگوں کے اذہان کو خلافت اور اسلامی ریاست کی فکر سے دور کردیا۔

اپنے براہِ راست قبضے سے پہلے استعماری طاقتوں نے ترک نوجوانوں کو ترک قومیت پر مبنی نعرے دیے اور انہیں باور کرایا کہ ترکی بلاوجہ غیر ترکوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ غیر ترکی مسلمانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور ترکی کی سیاسی جماعتیں بھی اسی ترک قوم پرستی اور ترکی کو غیر ترک علاقوں سے الگ کرنے کے لیے سرگرمِ عمل تھیں۔ کافروں نے ایسے ہی افکار عرب نوجوانوں میں پھیلائے اور ان میں عرب وطن پرستی کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ اُنہوں نے عربوں میں ترکی کو ایک قابض طاقت کے طور پر پیش کیا اور عربوں کو اُکسایا کہ وہ ترکی کے اس قبضے سے خود کو نجات دلائیں۔ چنانچہ عرب میں بھی ایسی سیاسی

جماعتیں اُٹھیں جو عرب قوم پرستی اور ترکوں سے عربوں کی آزادی کی دعوت دیتی تھیں۔ اِن قوم پرستانہ افکار نے لوگوں کے اذہان کو گرفت میں لے لیا اور اسلامی افکار کی جگہ قوم پرستی کی افکار نے لے لی۔ نتیجتاً ترکی کو اسی وطن پرستی کی بنیاد پر ''آزادی'' حاصل ہوئی اور ادھر عرب بھی قوم اور وطن پرستی کی بنیاد پر ذاتی حکمرانی کے طالب ہو گئے اور فضاء قوم اور وطن پرستی کے نعروں سے گونجنے لگی اور مسلمان اِن نعروں کو اپنے لیے عزت وفخر کا باعث سمجھنے لگے۔ استعمار نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس نے اسلامی نظامِ حکومت اور بذاتِ خود اسلام کے بارے میں غلط مفاہیم وتصورات مسلمانوں میں پھیلانا شروع کر دیے جیسا کہ خلافت ایک قسم کی روحانی قیادت ہے بالکل اُسی طرح جیسے عیسائیوں میں پوپ ہوتا ہے اور خلافت تھیوکریسی ہے۔ چنانچہ مسلمان لفظ 'خلیفہ' سے ہی شرمسار ہونا شروع ہو گئے اور خلافت کے مطالبے سے ہچکچانے لگے۔ مسلمانوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ خلافت ایک قدیم دقیانوسی چیز ہے اور کسی تعلیم یافتہ شخص کو یہ نام نہیں لینا چاہیے اور ایک مفکر کو اس کی بات نہیں کرنی چاہیے۔

قوم اور وطن پرستی کی اس فضاء میں استعماری کفار نے اسلامی ریاست کو تقسیم کیا اور اسے چھوٹے چھوٹے ممالک میں بانٹ دیا اور ہر ملک کے عوام کو اسی ملک سے جوڑ کر اس تقسیم کو مستحکم کر دیا۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں کہیں ترکی بنا تو کہیں عراق، کہیں شام معرض وجود میں آیا تو کہیں مصر، کہیں فلسطین تو کہیں لبنان، اسی طرح مشرقی اردن، حجاز، نجد اور یمن بنائے گئے۔ اِن ممالک میں کافر استعمار کے ایجنٹ سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ کچھ مخلص سیاسی لوگ بھی ایسی کانفرنسیں منعقد کرتے جن میں دوسرے مسلم علاقوں کو چھوڑ صرف اس ملک کی آزادی کا مطالبہ کیا جاتا۔ اور انہی بنیادوں پر ترکی، عراق، شام اور مصر وغیرہ عالمی نقشے پر ابھرے۔ پھر فلسطین میں یہودیوں کو آباد کیا گیا جسے بعد میں ایک مستقل وجود بخش کر ریاست کا نام دے دیا گیا۔ اس کے قیام کے پیچھے مغربی طاقتوں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسرائیل نام کے اسی کانٹے میں الجھے رہیں اور اصل استعمار سے غافل ہو جائیں اور یہ صورتِ حال اسلامی ریاست کے قیام

کے کام کی طرف لوٹنے میں مستقل رکاوٹ بن جائے۔ یہ جغرافیائی سرحدیں اور زہر آلود سیاسی فضاء اس طرح تیار کی گئی کہ مسلمان کبھی بھی آزاد نہ ہو پائیں۔

اِن تمام ممالک کے معاشی امور میں سرمایہ داری نظام نافذ کیا گیا اور اِسی طرح حکومتی امور میں جمہوری نظام نافذ کیا گیا، جبکہ انتظامیہ اور عدلیہ مغربی طرز پر وضع کی گئیں۔ استعماری کفار نے زندگی کے بارے میں اپنی تہذیب اور تصورات کو مسلمانوں میں راسخ کر دیا تاکہ زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر مسلمانوں میں مضبوطی سے پیوست ہو جائے اور مسلمان اُن کے طرزِ زندگی کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کریں، اور اس میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔ انہوں نے پہلے پہل مصر میں سلطنت بنائی، پھر اسے پارلیمانی بادشاہت میں بدل دیا، یہی شکل عراق میں بھی اختیار کی گئی۔ شام اور لبنان میں جمہوری نظام رائج کیا گیا، جبکہ مشرقی اردن میں امارت قائم کی گئی۔ فلسطین کو پہلے عبوری حکومت کے تحت رکھا جسے بدل کر یہودیوں کیلئے پارلیمانی جمہوریت کر دیا گیا اور فلسطین کے باقی حصے کو اردن کے مشرقی حصے سے جوڑ دیا گیا اور وہاں پارلیمانی بادشاہی نظام قائم کر دیا گیا۔ حجاز اور یمن میں جابرانہ بادشاہت قائم کر دی گئی، ترکی میں صدارتی جمہوریت قائم کی گئی جبکہ افغانستان میں موروثی بادشاہت قائم کی گئی اور ایران کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ شہنشاہیت کو برقرار رکھے، ہندوستان کو اپنی نوآبادیات ہی بنائے رکھا پھر اسے دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس طرح کافر استعمار نے اسلامی ریاست کے ہر حصے پر اپنا نظام قائم کیا اور اپنے نظام کے نفاذ کے ذریعے اسلامی کی حکمرانی کے دوبارا قیام کی فکر کو مسلمانوں کے ذہنوں سے محو کر دیا۔ اور پھر انہوں نے اس پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ ہر ملک کے عوام کو اس بات کی طرف ابھارا کہ وہ خود ہی اب اِس نئے نظام کے محافظ بنیں کیونکہ وہ اپنے اِس حصے کو ہی اپنا ملک تصور کرنے لگے تھے جسے وہ باقی اسلامی علاقوں سے علیحدہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اب ایک عراقی ترکی کے لیے اجنبی ہو گیا اور ایک مصری شامی کے لیے اجنبی ہو گیا۔ اب ان ممالک کے حکمران اس سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے اصل محافظوں سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرنے لگے۔

اِن حکمرانوں کی حیثیت استعماری کفار کے تنخواہ دار ملازموں کی سی تھی، جو اپنے آقا کے قائم کردہ نظام اور دستور کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس نظام اور دستور کو تبدیل کرنے کی کسی بھی کوشش کو وہ ایک قانونی جرم تصور کرتے تھے اور ایسے شخص کو استعمار کے نافذ کردہ قانون کے تحت سزا دی جاتی۔

استعماری کفار نے اپنے مغربی قوانین براہِ راست مسلمانوں پر نافذ کرنا شروع کیے، اس سے قبل وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ان قوانین کو مسلمانوں کے علاقوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ استعماری طاقتوں نے 19 ویں صدی کے اوائل میں مغربی قوانین نافذ کرنے کی کوشش شروع کی، انہوں نے مصر کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ شریعت کی جگہ فرانسیسی قوانین اختیار کرے اور وہ اس میں کامیاب ہوگئے، چنانچہ 1883ء میں مصر میں فرانسیسی قوانین اختیار کر لئے گئے۔ قدیم فرانسیسی عدالتی نظام کا ترجمہ کرکے اسے اختیار کیا گیا جس نے مصر میں شرعی قوانین کی جگہ لے لی۔ 1856ء میں ریاستِ عثمانیہ میں بھی ایسی کوششوں کا آغاز کیا گیا لیکن وہاں یہ اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ ریاستِ عثمانیہ ہی خلافت کا مرکز تھی۔ پھر بھی استعماری کفار مُصِر رہے اور اپنے ایجنٹوں اور ہمنواؤں کی کوششوں سے وہ پینل کوڈ اور تجارت اور حقوق کے غیر اسلامی قوانین نافذ کرانے میں کامیاب رہے، اس کے لیے اُنہوں نے ایسے فتوے حاصل کیے جن میں کہا گیا تھا کہ یہ قوانین اسلام کے منافی نہیں ہیں! اب کوڈیفیکیشن (Codification) کا تصور اپنی جڑیں پکڑ چکا تھا۔ شرعی قوانین کا ایک رسالہ تیار کیا گیا اور عدالتوں کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی شرعی عدالتیں جہاں شرعی احکام جاری تھے اور دوسری سِول عدالتیں جہاں مغربی قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور جس کے بارے میں علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ یہ اسلام سے ٹکراتے نہیں ہیں۔ مغربی قوانین کی مانند شرعی قوانین کو بھی نمبروار مرتب کیا گیا۔ یہ تو قوانین کے متعلق تھا، جہاں تک دستور کا تعلق ہے تو حکومت کیلئے ایک نئے دستور کی تدوین کی کوششیں شروع ہوئیں کہ جسے فرانسیسی دستور سے اخذ کیا جائے۔ قریب تھا کہ 1878ء میں یہ کوشش کامیاب ہو جاتی لیکن مسلمانوں کی شدید مزاحمت نے اسے روک دیا۔

استعماری کفار نے اپنی کوششیں جاری رکھیں، چنانچہ ان کفار کے ہمنوا اور مغربی ثقافت زدہ لوگوں کی مدد سے دستور کی تدوین کی تحریک دوبارا اُبھری اور اس مرتبہ کامیاب رہی۔ اور اس نئے دستور پر 1908ء میں عمل شروع ہوگیا۔ ان قوانین اور دستور کو اختیار کر لینے کے بعد جزیرہ نما عرب اور افغانستان کے سوا تمام مسلم ممالک پر مغربی قوانین کے مطابق حکومت کی جانے لگی۔ اب شرعی احکامات کو ترک کر کے مغربی قوانین اسلامی ریاست میں رواں تھے۔ استعماری کفار کا اسلامی علاقوں میں جہاں جہاں قبضہ ہوتا گیا وہ اپنے قوانین کی تنفیذ کرتے رہے، اس اعتبار سے کہ یہ سِول لاء (معاشرتی حقوق کا قانون) ہے اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا، اسلامی شرعی احکام متروک ہوگئے، کفر کی حکمرانی نے اپنے قدم جما لیے جبکہ اسلام کی حکمرانی مفقود ہوگئی۔ کفار کو اپنے قدم جمانے میں جس چیز نے انہیں مدد فراہم کی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنی سٹریٹجی کو اپنی وضع کردہ تعلیمی پالیسی اور تربیتی طریقۂ کار سے منسلک کیا، جسے اُنہوں نے مسلم علاقوں میں نافذ کیا تھا اور جو آج بھی سارے اسلامی ممالک میں جاری وساری ہے۔ آج مسلم ممالک میں اِس مغربی نصابِ تعلیم کے تربیت یافتہ اساتذہ کی بڑی فوج ہے جو اس پالیسی کی معاونت وحفاظت کر رہی ہے اور ان میں سے متعدد اہم ریاستی عہدوں پر براجمان ہیں، اور اس پالیسی کو بنانے والے استعماری کفار کی خواہش کے مطابق عمل پیرا ہیں۔ یہ نصابِ تعلیم اور اس کی پالیسی دو اہم بنیادوں پر استوار ہے: اِن میں پہلی بنیاد یہ ہے کہ دین کو زندگی کے معاملات سے بے دخل کر دیا جائے، جس کا براہِ راست نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین ریاستی امور سے بھی بے دخل ہو جاتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اِس نظام کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اپنے بیٹے ہی اسلامی ریاست کے بننے کے مخالف بنتے ہیں کیونکہ یہ اسلامی ریاست کا قیام اُس بنیاد سے ٹکراتا ہے جس پر ان کی حاصل کردہ تمام تر تعلیم کی عمارت کھڑی ہے۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ استعماری کفار کی شخصیت کو نوجوانوں کے لیے مثال ونمونہ بنایا جائے، تاکہ یہ نوخیز ذہن بارضا ورغبت کفار سے متعلق معلومات اور آگاہی حاصل کریں اور نتیجتاً استعماری کفار کا رعب اور تعظیم ان کے دلوں میں بیٹھ جائے اور وہ ان کی اتباع

کریں، امورِ زندگی کے لیے انہی کو رول ماڈل بنائیں اگر چہ ان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ استعماری کفار ہیں۔ اسی بنیاد کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو کمتر اور حقیر سمجھیں، اُن سے ذہنی طور پر دور ہو جائیں اور مسلمانوں سے کراہت محسوس کریں اور ایک مسلمان سے کچھ سیکھنے یا حاصل کرنے سے گریز کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اسلامی ریاست کو ایک دقیانوسی نظام سمجھ کر اس کے احیاء کی مخالفت کرتا ہے۔ استعماری کفار نے صرف اسکولوں میں اپنا نصاب رائج کر دینے پر ہی اکتفاء نہیں کر لیا، جن پر وہ خود اور اُن کی مقرر کردہ حکومتیں نظر رکھتی ہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اُنہوں مشنری اسکول کھولے جہاں تعلیم خالصتاً استعماری بنیادوں پر دی جاتی ہے۔ انہوں نے ایسے ثقافتی ادارے اور مراکز بھی کھولے جن کا مقصد سیاسی و ثقافتی رخ کو غلط سمت موڑنا تھا۔ چنانچہ ایسے سکولوں میں موجود اسلام سے متضاد فکری ماحول نے اور ان ثقافتی مراکز نے کہ جنہوں نے امت کو غلط ثقافت سے آراستہ کیا، امت کو اسلامی ریاست کی سوچ سے دور کر دیا اور یوں یہ سکول و مراکز اسلامی ریاست کے لیے کام کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

اس کے ساتھ ساتھ استعماری کفار نے تمام اسلامی ممالک میں ایک متعین سیاسی پالیسی وضع کی، جس کی بنیاد دین کی دنیاوی امور سے علیحدگی پر تھی۔ چنانچہ مفکرین کے درمیان دین کی دنیاوی امور سے علیحدگی ایک عام فکر بن گئی اور عام لوگوں میں دین کی سیاست سے علیحدگی کی سوچ پھیل گئی۔ اس فکر کے پھیلنے کے نتیجے میں مفکرین کا ایک گروہ یہ گمان کرنے لگا کہ مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی وجہ ان کا دین سے چمٹے رہنا ہے اور نشاۃِ ثانیہ کا واحد راستہ قومیت کو بنیاد بناتے ہوئے کوشش کرنا ہے۔ اسی طرح ایک گروہ یہ سمجھنے لگا کہ مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی وجہ ان کی اخلاقی گراوٹ ہے۔ پس ایسی جماعتیں وجود میں آئیں جو اپنی آپ کو سیاسی کہتی تھیں اور قومیت و وطنیت کی بنیاد پر سرگرمِ عمل تھیں۔ اور اسلام کی بنیاد پر عمل کو استعماری سازش گردانتی تھیں اور یہ سمجھتی تھیں کہ ایسا کرنا قدامت پسندی اور جمودیت ہے جو کہ زوال و انحطاط کی طرف لے جائے گی۔ اسی طرح اخلاق اور وعظ وارشاد کی بنیاد پر گروہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے لوگوں کو اخلاق

وفضائل کی طرف بلانا شروع کیا اور اپنے لیے یہ ضابطہ مقرر کیا کہ وہ سیاست سے دور رہیں گے۔ یوں یہ جماعتیں اور گروہ اسلامی ریاست کے قیام کی کوششوں کی راہ میں حائل ہو گئے۔ کیونکہ ان گروہوں نے لوگوں کے اذہان کو سیاسی کام سے پھیر دیا جو کہ شرعی طور پر واجب ہے اور یہ کام خلافت کے قیام کا کام ہے اور اُن کی توجہ صرف اخلاقی اعمال پر مرکوز کر دی، حالانکہ اخلاقیات اسلام کی حکمرانی کے نفاذ سے طبعی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں اور اخلاقیات ایک مسلمان کے اسلام کے احکامات پر عمل کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔

استعماری سیاسی پالیسی کے نفاذ کے ساتھ ساتھ اس کے تحفظ اور اس کے نفاذ کو یقینی بنانے کیلئے باقاعدہ قوانین وضع کیئے گئے۔ اِن قوانین میں ایسی کسی بھی سیاسی جماعت یا تحریک کے قیام کو ممنوع قرار دے دیا گیا جس کی بنیاد اسلامی سیاست ہو۔ اِن قوانین کی رُو سے مسلمانوں کی حیثیت ان ممالک میں یہ ہوگئی کہ وہ مختلف گروہوں میں سے محض ایک گروہ ہیں جبکہ دراصل مسلمان ہی ان ممالک کے حقیقی مالک تھے۔ اِن قوانین کی رُو سے وہاں قائم ہونے والی ہر سیاسی جماعت پر جمہوری نظم لازم کیا گیا یعنی وہ کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں تک اپنی ممبر شِپ محدود نہیں کرسکتیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب اسلامی ممالک میں اسلامی سیاسی جماعتیں بنانا جائز نہیں ہوگا کہ کہیں اسلامی ریاست واپس نہ لوٹ آئے۔ اب مسلمانوں کا حق صرف یہ تھا کہ وہ اسلام کے نام پر بس خیراتی ادارے بنائیں اور اسلام کی بنیاد پر کسی بھی سیاسی عمل سے باز رہیں۔ بعض ممالک کے قوانین میں تو اسلامی سیاسی جماعتوں کی تشکیل کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا۔ پس استعمار نے سیاسی پالیسی اور ان قوانین کے ذریعے اپنی دانست میں اسلامی ریاست کے قیام کو ناممکن بنانے کی کوشش کی۔

استعماری طاقتوں نے اسی پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو معمولی کاموں میں مشغول کر دیا اور ان کے ذہن کو اسلامی ریاست کے متعلق سوچنے سے دُور کر دیا۔ پس اسلامی کانفرنسیں منعقد کی جانے لگیں اور اُن کی حوصلہ افزائی کی گئی، تاکہ مسلمان اِنہیں منعقد کر کے اپنے

جذبات کو ٹھنڈا کرلیں اور اصل کام سے غافل رہیں، یعنی اسلامی ریاست کے سائے میں اسلامی زندگی کے احیاء کا کام۔ اِن کانفرنسوں میں قراردادیں منظور کی جاتیں اور انہیں اخباروں میں شائع کردیا جاتا اور ریڈیو پر نشر کردیا جاتا جس سے مقررین محسوس کرتے کہ انہوں نے فرض ادا کردیا ہے لیکن کبھی اِن قراردادوں میں سے کچھ بھی نافذ نہ کیا جاتا بلکہ ان قراردادوں میں مذکور کسی چیز کو نافذ کرنے کی سرے سے کوشش ہی نہ کی جاتی۔ پھر ایسے مصنفین اور مقرروں کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے خطرات سے عوام کو آگاہ کریں۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام میں کوئی حکومتی نظام ہے ہی نہیں۔ متعدد کتابیں اور رسالے منظرِ عام پر لائے گئے جنہیں لکھنے والے استعمار کے تنخواہ دار تھے۔ یہ کتابیں استعماری تصورات سے بھری ہوئی تھیں تاکہ مسلمانوں کو گمراہ کیا جائے، انہیں ان کے دین سے ہٹایا جائے اور مسلمانوں کو اسلامی احکامات کے مطابق زندگی کے احیاء سے باز رکھا جائے۔ اس طرح استعمار اسلامی ریاست کے خاتمے سے لے کر اب تک مختلف قسم کی رکاوٹیں ڈالے ہوئے ہے تاکہ جس ریاست کو وہ مٹا چکا ہے وہ اب دوبارہ قائم نہ ہو سکے۔

باب نمبر 46

مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اسلامی ریاست قائم کریں

اسلامی ریاست تیرہ اداروں پر قائم ہوتی ہے:(1)خلیفہ (2)معاونین(وزراءتفویض) (3)وزراءتنفیذ (4)والی (5)امیرِ جہاد (6)اندرونی سلامتی (7)خارجی امور (8)صنعت (9) عدلیہ (10)مفادِعامہ کی دیکھ بھال کا انتظامی ڈھانچہ (11)بیت المال (12)میڈیا (13)مجلسِ امت(شوریٰ اور محاسبہ)۔ جب یہ ادارے پوری طرح قائم ہوجاتے ہیں تو اسلامی ریاست کا ڈھانچہ تکمیل پا جاتا ہےاور اگر اِن میں سے کسی میں کمی ہوتو ریاست کا ڈھانچہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ لیکن بہرحال وہ اسلامی ریاست ہی رہتی ہے جب تک کہ خلیفہ موجود ہو کیونکہ خلیفہ ریاست کی اساس ہوتا ہے۔ جہاں تک حکمرانی کے اصولوں کا تعلق ہے،تو وہ چار ہیں:

1) اقتدارِاعلیٰ شریعت کو حاصل ہے،امت کو نہیں۔
2) اختیار(اتھارٹی)امت کے پاس ہے۔
3) ایک خلیفہ کا تقرر تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔
4) احکامِ شریعت کی تبنی کا حق صرف خلیفہ کو حاصل ہےاور وہی دستور اور مختلف قوانین جاری کرتا ہے۔

اگر اِن اصولوں میں سے ایک بھی اصول ناقص ہوتو حکومت غیر اسلامی ہو جاتی ہے،

اور یہ ناگزیر ہے کہ ان چاروں اصولوں کو مکمل کیا جائے۔ اسلامی ریاست کی بنیاد خلیفہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ جو بھی ہیں وہ یا تو اس کے نائب ہوتے ہیں یا پھر مشیر۔ اسلامی احکامات کو نافذ کرنے والا خلیفہ ہی اسلامی ریاست ہوتا ہے اور خلیفہ یا امام کو مسلمانوں کے تمام امور پر تصرف حاصل ہوتا ہے۔ خلافت اسلامی عقائد کا حصہ نہیں بلکہ شرعی احکام کا جزو ہے کیونکہ یہ بندوں کے افعال کی فروعات میں سے ہے۔

خلیفہ کو مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے اور مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ ان پر تین راتوں سے زیادہ عرصہ اس حال میں گزرے کہ ان پر خلیفہ کی بیعت موجود نہ ہو۔ اگر ان پر تین دن سے زیادہ عرصہ گزر جائے اور وہ خلیفہ کے بغیر ہوں تو وہ سب گناہ گار ہوں گے تاوقت یہ کہ مسلمان خلیفہ کو مقرر نہ کرلیں۔ اور ان سے یہ گناہ ساقط نہیں ہوگا جب تک کہ وہ خلیفہ کے تقرر کے لیے سر توڑ کوشش نہ کریں اور اس عمل میں لگے رہیں یہاں تک کہ خلیفہ کا تقرر ہو جائے۔ خلیفہ کے تقرر کے فرض ہونے کی دلیل اللہ کی کتاب، رسول ﷺ کی سنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ جہاں تک کتابُ اللہ کا تعلق ہے تو قرآنِ حکیم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو قطعی طور پر حکم دیا ہے کہ آپ ﷺ مسلمانوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے ذریعے حکمرانی کریں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾

''پس آپ ﷺ ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو حق آپ ﷺ کے پاس آ گیا ہے، اس کے مقابلے میں ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے گا'' (المائدہ: 48)

اور فرمایا:

﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾

''اور یہ کہ (آپ ﷺ) ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ

کریں اوران کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے گا۔ اوران سے محتاط رہیں کہ کہیں یہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ بعض (احکامات) کے بارے میں آپ ﷺ کو فتنے میں نہ ڈال دیں'' (المائدہ: 49)

رسول ﷺ کیلئے جوخطاب ہے وہ امت کیلئے بھی اسی طرح ہے جب تک کہ اس خطاب کے صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہونے کی کوئی دلیل موجود نہ ہواور یہاں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، لہٰذا یہ خطاب تمام امت کیلئے ہے کہ وہ حکومت قائم کریں، اور خلیفہ کومقرر کرنا حکومت واقتدار قائم کرنا ہی ہے۔ جہاں تک سنتِ رسول ﷺ کا تعلق ہےتو احمد اور طبرانی نے یہ حدیث روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((من مات وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية))

''اور جوکوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا طوق نہیں تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا''

اور مسلم نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

((مَن خَلَعَ يَدًا مِنْ طاعة لقي اللّٰه يوم القيامة ولا حجة له و من مات و ليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهليةَ))

'''''جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس (اپنے اس عمل کی) کوئی حجت نہیں ہوگی ور جوکوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا طوق نہیں تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا''

ہشام بن ابی عروہ نے ابی صالح سے اورانہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سيليكم بعدي ولاة فيليكم البرَّ بِبره و يليكم الفاجر بفجوره فاسمعوا لهم و أطيعوا في كل ما وافق الحق فإن أحسنوا فلكم وإن أساءوا فلكم و

علیھم))

''میرے بعد تمہارے معاملات کے والی ہونگے، نیک والی (حاکم) اپنی نیکی سے پیش آئیگا اور فاجر اپنے فجور سے پیش آئیگا، پس اُن کی سنو اور ہر حق بات میں اُن کی اطاعت کرو، اگر وہ اچھا کریں تو تمہارے لئے خیر ہوگی اور اگر وہ برا کریں تو یہ تمہارے حق میں اور اُن کی گردن پر ہوگا''

جہاں تک صحابہ کرام ؓ کے اجماع کا تعلق ہے، تو اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وصال کے بعد جس کام کو سب سے زیادہ اہم سمجھا وہ خلیفہ کا مقرر کیا جانا تھا، یہی بات دو صحیح احادیث سے ثابت ہوتی ہے جو سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعہ کے متعلق ہیں۔ نیز ہر خلیفہ کے انتقال کے بعد صحابہ نے نئے خلیفہ کے تقرر پر اجماع کیا۔ خلیفہ کو مقرر کرنے کے واجب ہونے پر صحابہ کا اجماع تواتر سے منقول ہے جو اس کام کو انتہائی اہم فرض بناتا ہے، اور یہ خلیفہ کے تقرر کی فرضیت کی قطعی دلیل ہے۔ یہ اجماع اس بات کا بھی ہے امت کا کسی بھی وقت ایک خلیفہ کے بغیر ہونا ممنوع ہے۔ چنانچہ امت پر فرض ہے کہ وہ خلیفہ کو مقرر کرے اور امت پر یہ فرض رسول اللہ ﷺ کی وفات سے لے کر قیامت تک کیلئے ہے۔

خلیفہ کے تقرر کی فرضیت کے حتمی ہونے کی شدت اور اس فرضیت کو صحابہ کرام ؓ کس طرح سمجھتے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کے افعال سے واضح ہوتا ہے۔ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تدفین کو اُس وقت تک انجام نہیں دیا جب تک کہ اسلامی ریاست پر ایک خلیفہ مقرر نہیں ہو گیا اور اس کی بیعت نہیں ہوگئی۔ یہی بات عمر بن خطاب ؓ کے فعل سے بھی ظاہر اور واضح ہوتی ہے جب وہ خنجر کے زخم کے باعث رحلت کے قریب تھے۔ مسلمانوں نے اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنا جانشین خلیفہ نامزد کردیں، آپ ؓ نے پہلے اس سے انکار کیا، مسلمانوں کے مزید اصرار پر آپ ؓ نے چھ اشخاص کو نامزد کیا، یعنی آپ نے چھ لوگوں کی حد بندی کردی کہ جن میں سے خلیفہ کا انتخاب ہونا تھا۔ آپ نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے اِن چھ افراد کیلئے تین دن کا وقت بھی طے کر دیا جس کے دوران اِن اصحاب کو اتفاقِ رائے سے ایک

شخص کوخلیفہ بنانا تھا۔ اور آپ ؓ نے یہ بھی حکم دیا کہ اِن چھ افراد میں سے جو کوئی بھی فیصلے کی مخالفت کرے وہ قتل کر دیا جائے اور اس کام کیلئے ایک شخص کو ذمہ دار بھی بنا دیا حالانکہ یہ چھ اشخاص اہلِ شوریٰ میں سے تھے اور جلیل القدر صحابہ تھے۔ یہ حضرات علی، عثمان، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ ؓ تھے۔ ان صحابہ کرام ؓ کو، اگر وہ ایک خلیفہ پر اتفاق نہیں کرتے، قتل کر دیا جانے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ کا تقرر کرنا فرض ہے۔

علاوہ ازیں متعدد شرعی فرائض کا انحصار خلیفہ پر ہوتا ہے، مثلاً شرعی احکامات کا نفاذ، حدود کا قائم کرنا، سرحدوں کی حفاظت، فوج کی تربیت اور اسے اسلحے سے لیس کرنا، لوگوں کے درمیان تنازعات کا فیصلہ کرنا، امن و امان کا قیام، لوگوں کے امور کی نگرانی کرنا وغیرہ۔ لٰہذا خلیفہ کا تقرر واجب ہے۔

خلافت کی طلب اور اُس میں مسابقت کوئی ناپسندیدہ فعل نہیں ہے۔ صحابہ کرام ؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں اس کے لیے مقابلہ آرائی کی، نیز عمرؓ کے مقرر کردہ چھ صحابہؓ نے بھی خلافت کے لئے مقابلہ آرائی کی۔ اس پر کسی بھی صحابی نے اعتراض نہیں کیا، بلکہ خلافت کی طلب اور اس کیلئے مقابلہ آرائی کے حق میں صحابہ کا اجماع واضح اور ثابت ہے کہ یہ جائز عمل ہے۔

مزید یہ کہ تمام مسلمانوں پر ایک سے زیادہ خلیفہ نہیں ہو سکتے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہی حکم دیا ہے، فرمایا:

((إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما))

''جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو'' (مسلم)

اور فرمایا:

((ومن بايع إماماً فأعطاه صفقة يده وثمرة قلبه ' فليطعه إن استطاع ' فإن جاء آخر ينازعه فاضربوا عنق الآخر))

''اور جو شخص کسی امام (خلیفہ) کی بیعت کرے تو اسے اپنے ہاتھ کا معاملہ اور دل کا پھل دے دے پھر اسے چاہیے کہ وہ حسبِ استطاعت اس کی اطاعت بھی کرے۔ اگر کوئی دوسرا شخص آئے اور پہلے خلیفہ سے تنازع کرے تو دوسرے کی گردن اڑا دو'' (مسلم)

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((فأضربوه بالسيف كائنا من كان))

''اسے تلوار سے مار دو، خواہ وہ کوئی بھی ہو''

اُس دوسرے شخص کو مار دینے کا حکم اس بات پر منحصر ہو گا کہ قتل کیے جانے کے سوا اس شخص کو ہٹانے کی کوئی صورت نہ ہو۔ اگر صورتِ حال یہ ہو کہ ایسے کئی لوگ ہوں جن میں خلیفہ کے لیے درکار صفات موجود ہوں تو خلافت کا منصب وہ سنبھالے گا جسے زیادہ لوگ بیعت دے دیں اور جو اس اکثریت کی مخالفت کرے وہ باغی ہو گا۔ یہ بات اُس وقت ہو گی جب تمام نامزدگان بنفس نفیس موجود ہوں اور ان میں سے کسی کی بیعت نہ کی گئی ہو، لیکن اگر ایک شخص، جس میں خلیفہ بننے کی شرائط موجود ہوں اور اسے بیعت دے دی جائے تو وہی خلیفہ ہو گا، اس کے بعد اگر مزید لوگ کسی دوسرے کو بیعت دے بھی دیں تو بھی وہی پہلا شخص ہی خلیفہ ہو گا اور دوسرے شخص کی بیعت قابلِ اعتبار نہیں ہو گی۔ وہ شرائط جو ایک خلیفہ میں ہونا لازمی ہیں وہ یہ ہیں: مسلمان ہونا، مرد ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا، عادل ہونا، قادر ہونا اور آزاد ہونا۔ خلیفہ کیلئے مسلمان ہونے کی شرط کی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ قول ہے:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مومنین پر ہر گز کوئی راستہ (اختیار یا غلبہ) نہیں دیا'' (النساء:141)

اسی طرح خلیفہ کیلئے مرد ہونے کی شرط اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث کی بنا پر ہے:

((لن يفلح قوم ولو أمرهم امرأة))

''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا حکمران بنا لے'' (بخاری)

اسی طرح خلیفہ کیلئے عاقل اور بالغ ہونے کی شرط بھی حدیثِ نبوی سے ماخوذ ہے، فرمایا:

((رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ،وعن الصبي حتى يحتلم،وعن المجنون حتى يعقل))

''تین قسم کے لوگوں سے قلم اُٹھالیا گیا ہے: ایک وہ جو سویا ہوا ہو جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے، دوسرے بچہ، جو سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو اور تیسرے مجنون، جب تک کہ اس کی عقل صحیح نہ ہو جائے''
چنانچہ جس شخص پر سے قلم اُٹھالی گئی ہو وہ شرعاً مکلّف نہیں ہوتا لہٰذا اس کا خلیفہ یا کوئی حاکم ہونا صحیح نہیں کیونکہ اُسے تصرفات کا اختیار نہیں ہے۔

اسی طرح خلیفہ کیلئے یہ لازم ہے کہ وہ عادل ہو اور یہ صفت اس میں ہمیشہ رہے، کیونکہ اللہ نے ایک گواہ کیلئے عادل ہونے کی شرط رکھی ہے، ارشاد فرمایا:

﴿وَّ اَشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ﴾

''اور اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمیوں کو گواہ بنالو'' (الطلاق:2)
پس خلیفہ کے لیے عادل ہونا بدرجۂ اولیٰ ہے کہ جو امت کے امور کے فیصلے کرتا ہے۔

جبکہ خلیفہ کیلئے آزاد ہونے کی شرط کا سبب یہ ہے کہ ایک غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے اور خود اُس کا اپنا کوئی تصرف نہیں ہوتا لہٰذا یہ بدرجہ اولیٰ ہوا کہ وہ کسی اور پر تصرف بھی نہیں رکھ سکتا، اور اسے لوگوں پر کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا۔

خلیفہ کیلئے قادر کی شرط ہونا اس لئے لازمی ہے کہ اگر وہ خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے تو یہ ذمہ داری بے معنی ہو جائے گی، اور یہ امر اسلام کے احکامات کے نفاذ میں کوتاہی اور حقوق کے ضائع ہونے کا باعث بنے گا اور اسلام نے اس بات کو جائز نہیں رکھا۔

ایک خلیفہ کیلئے یہی شرائط فرض کے طور پر ثابت ہیں۔ اِن کے علاوہ جن شرائط کا بعض

فقہانے ذکر کیا ہے مثلاً شجاعت، اہل علم میں سے ہونا، آل قریش یا آلِ فاطمہؓ میں سے ہونا وغیرہ تو یہ خلافت کے انعقاد کیلئے اور بیعت کے صحیح ہونے کیلئے لازمی شرائط نہیں ہیں، لہٰذا ان کا شرط ہونا معتبر نہیں ہے۔ ہر مسلم مرد، جو بالغ، عاقل، عادل، آزاد اور قادر ہو اسکے لئے یہ جائز ہے کہ اسے خلافت کی بیعت دی جاسکتی ہے اور اُس میں کسی دیگر شرط کا موجود ہونا لازمی نہیں ہے۔

لہٰذا تمام مسلمانوں پر یہ فرض کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماعِ صحابہؓ سے ثابت ہے کہ وہ اسلامی ریاست کو قائم کریں۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں پر کفر یہ احکامات کا نفاذ ہو رہا ہے اور مسلمانوں پر کفر کو اتھارٹی حاصل ہے، چنانچہ اُن کے ممالک دارالکفر بن چکے ہیں جبکہ وہ کبھی دارالاسلام ہوا کرتے تھے، یعنی مسلمانوں پر بالادستی اسلام کی نہیں ہے گو کہ اُن کے علاقے اسلامی علاقے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ دار اسلام میں رہیں اور اُن پر اسلام کو اتھارٹی حاصل ہو اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ جائے۔ مسلمان اُس وقت تک گنہگار رہیں گے جب تک کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کیلئے کوشش نہ کریں جس کے نتیجے میں اُن پر ایک خلیفہ مقرر ہو جو اسلامی قوانین نافذ کرے اور اسلام کی دعوت سارے عالم تک پہنچائے۔

باب نمبر 47

اسلامی ریاست کے قیام میں حائل مشکلات

اسلامی ریاست کا قیام کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ اسلامی طرزِ زندگی کا ازسرِ نو آغاز سیدھا سادھا معاملہ نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام میں کئی بلند و بالا رکاوٹیں موجود ہیں جنہیں عبور کیا جانا ہے اور اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء میں متعدد کٹھن مشکلات حائل ہیں جنہیں دور کرنا درکار ہے، کیونکہ یہ معاملہ بس کسی بھی ریاست کے قائم کر دینے کا نہیں ہے اور نہ ہی ایک ایسی ریاست کے قیام کا جس کا محض نام اسلامی ہو، بلکہ یہ اسلامی ریاست کے قیام کی مہم ہے جو اسلام کے نظام کو، جو اسلامی عقیدہ سے پھوٹتا ہے، مکمل طور پر اللہ کے حکم ہونے کی حیثیت سے نافذ کرے۔ اس ریاست کی سرحدوں کے اندر اسلامی طرزِ زندگی کا مکمل احیاء ہو جبکہ سرحدوں کے باہر وہ تمام عالم میں اسلام کی دعوت کو پیش کرے۔ اس اسلامی ریاست کے لیے لازمی ہے کہ اس ریاست کی بنیاد اسلامی عقیدہ پر ہو اور اس کے افکار اسلام پر مبنی ہوں یا اسلام سے ہی ماخوذ ہوں اور اسکے قوانین اور اس کا نظام بھی اسلامی عقیدہ سے ہی نکلتا ہو۔ تا کہ اسلامی طرزِ زندگی کے لیے محرکات ایک انسان کے اندر سے پھوٹیں اور یوں انسان میں اسلامی عقلیت اور اسلامی نفسیت اُبھرے جو اسلام کے نظام اور اس کے احکامات کی تنفیذ کو اپنے جذبے اور شوق سے قبول کرے اور ذہن ان احکامات پر مطمئن ہو۔ اور یہ صورتِ حال حاکم اور محکوم دونوں میں برابر موجود ہو۔ حکمران جو امت کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور رعایا، دونوں کی سطح پر اس ریاست کا

اسلامی ہونا ضروری ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہ ریاست مکمل طور پر اسلامی ہو جو اسلامی طرزِ زندگی کا اس طرح احیاء کرے کہ یہ احیاء اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں تمام لوگوں تک پہنچانے میں معاون بنے۔ اور غیر مسلم اس ریاست میں اسلام کی روشنی کو محسوس کر کے فوج درفوج اسلام کو اختیار کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء اور اسلامی ریاست کے قیام کی راہ میں بیشمار مشکلات اور رکاوٹیں حائل ہیں جنہیں جاننا نہایت ضروری ہے تا کہ اُن پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کام کیا جا سکے۔ اِن میں سے بعض مشکلات مندرجہ ذیل ہیں:

(1) عالمِ اسلام میں غیر اسلامی افکار وتصورات کی موجودگی اور عالمِ اسلام میں ان افکار کا غالب ہونا: اس کا سبب یہ ہے کہ عالمِ اسلام پستی سے دوچار ہے، اس کی فکر سطحی ہے، علم مفقود ہے اور انحطاط کے باعث عقلی ضعف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ عالمِ اسلام پر غیر اسلامی افکار حاوی ہیں، ایسے افکار جو اسلامی افکار سے متضاد ہیں اور جو زندگی سے ماقبل، زندگی کے دوران اور زندگی سے مابعد کے متعلق غلط فہم وفکر پر مبنی ہیں۔ ان افکار کو مسلمانوں کے ذہنوں میں بغیر کسی مزاحمت کے زرخیز زمین ملی اور وہ ان ذہنوں میں راسخ ہو گئے۔ مسلمانوں کی ذہنیت اور خاص طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ذہنیت اِن غلط افکار سے آلودہ ہوگئی۔ اِن میں ایک مخصوص عقلیت ابھری جو اِن افکار کی پیروکار تھی، اور یہ عقلیت تخلیقی صلاحیتوں سے عاری تھی، یہ نہ تو اسلامی آئیڈیالوجی کو سیاسی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار تھی، اور نہ ہی اِس میں اس آئیڈیالوجی کی فکر کی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت تھی، خاص طور پر اس کے سیاسی پہلو کی۔ لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ اسلامی دعوت، اسلام کی طرف دعوت ہو اور اسلامی زندگی کے احیاء کی دعوت ہو، یعنی غیر مسلموں کے سامنے اسلامی افکار کی وضاحت کر کے انہیں اسلام کی طرف بلایا جائے جبکہ مسلمانوں کو اسلامی زندگی کے احیاء کے کام کی دعوت دی جائے اور اُن میں اسلامی کا گہرا فہم وادراک پیدا کیا جائے۔ یہ امر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دیگر افکار کی غلطیوں اور اُن کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے۔ اور اس دعوت کو سیاسی طریقے سے دیا جائے اور امت کی اسلامی ثقافت میں تربیت کی جائے جس میں اس ثقافت کا

سیاسی پہلو عیاں ہو۔ اس طرح اس رکاوٹ پر غلبہ پایا جاسکتا ہے۔

(2) تعلیمی نصاب کا استعماری طاقتوں کی وضع کردہ اساس پر استوار ہونا اور وہ طریقہ جس پر یہ تعلیمی نصاب اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں نافذ کیا جاتا ہے: حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ حکومت، انتظامیہ، عدلیہ کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں یا طب اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کی ایک مخصوص ذہنیت تشکیل پاتی ہے جو استعمار کے ایجنڈے سے عین ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اس چیز کو ہم موجودہ نظامِ حکومت میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں جہاں استعمار ممالک کے بھیجے ہوئے ملازمین کو اِن ممالک کی ''آزادی'' کے بعد مسلمان ملازمین سے تبدیل کر دیا گیا، جن کا کام ان قوانین، نظام، ثقافت، پالیسی، نظاموں اور تہذیب وغیرہ کا تحفظ کرنا ہے جنہیں استعمار نے قائم کیا تھا۔ بلکہ وہ اس کی حفاظت استعمار سے بڑھ کر کرتے ہیں۔ اس رکاوٹ پر قابو پانے کا طریقہ یہ ہے کہ اِن حکام، ملازمین اور دیگر افراد کے ایسے افعال کی اصل حقیقت خود ان پر اور عوام الناس پر اس طرح واضح کر دی جائے کہ اُن کے سامنے اس کا غلیظ استعماری پہلو عیاں ہو جائے اور وہ ان نظاموں اور پالیسیوں کی حمایت و حفاظت ترک کر دیں تاکہ دعوت مسلمانوں تک پہنچائی جاسکے۔

(3) تعلیمی پروگرام کا استعماری طاقتوں کی طے کردہ اساس اور طریقۂ کار پر اب تک جاری رہنا جس کے سبب تعلیمی اداروں میں موجود اور فارغ التحصیل اکثر طلباء اسلام سے متضاد راہ پر گامزن ہیں۔ یہاں تعلیمی پروگرام سے مراد سائنسی یا صنعتی پروگرام نہیں ہیں، کیونکہ یہ علوم تو کسی مخصوص امت کے نہیں ہوتے بلکہ تمام انسانیت کیلئے یکساں ہوتے ہیں، یہاں ہماری مراد استعمار کے ثقافتی پروگراموں سے ہے جو زندگی کے نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ تعلیمی پروگرام اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء کی راہ میں رکاوٹ کی طرح کھڑے ہیں۔ ان میں تاریخ، ادب، فلسفہ اور قانون کے مضامین شامل ہیں۔ کیونکہ کسی قوم کی تاریخ دراصل اُس قوم کی زندگی کی عملی تفسیر ہوتی ہے، ادب اُس کی زندگی کی شعوری تصویر ہوتا ہے، فلسفہ وہ بنیادی فکر ہوتی ہے جس پر اس قوم کا زندگی کے متعلق نقطۂ نظر استوار ہوتا ہے جبکہ قانون زندگی کی مشکلات و مسائل کا عملی حل اور وہ آلہ

ہوتا ہے جس کے ذریعے افراد اور گروہوں کے آپسی تعلقات و معاملات کو منظّم کیا جاتا ہے۔ کافر استعمار نے ان تمام مضامین کو اس خاص ترتیب سے وضع کیا کہ مسلم طالب علم ایک مخصوص ذہنیت اختیار کر لیں پس اُن میں سے بعض تو اپنی اور امت کی زندگی میں اسلام کو ایک غیر ضروری چیز سمجھنے لگیں جبکہ بعض اسلام سے ایسا عناد رکھنا شروع کر دیں کہ وہ اس بات کا انکار کر دیں کہ اسلام میں زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کی اس عقلیت کو تبدیل کیا جائے۔ یہ اِن طلباء کو اسکولوں اور کالجوں سے باہر مرتکز اور اجتماعی شکل میں اسلامی افکار اور شرعی احکامات کی تَثْقِیف (culturing) کے ذریعے کیا جائے تاکہ اس رکاوٹ پر قابو پانا ممکن ہو سکے۔

(4) بعض ثقافتی علوم مثلاً علم عمرانیات (سوشیالوجی)، نفسیات (سائیکالوجی) اور ایجوکیشنل سٹڈیز کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے وہ کوئی سائنسی علم ہو کہ جس کے قواعد پوری دنیا کے لیے یکساں طور پر درست ہیں، جبکہ دراصل یہ محض مشاہدات پر مبنی نتائج ہوتے ہیں۔ اور اِن کے حاصل کردہ نتائج پر اس طرح انحصار کیا جاتا ہے کہ وہ کوئی مسلمہ، غیر متنازعہ اور عظیم حقائق ہیں جو زندگی کے امور حل کرتے ہیں اور اِنہیں اسی حیثیت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے معاملات میں انہیں نافذ (apply) کیا جاتا ہے اور امورِ حیات میں ان سے مدد لی جاتی ہے۔ اِن ثقافتی علوم کے ماہرین کی رائے کو اس طرح ریفرنس کے طور پر لیا جاتا ہے کہ گویا وہ قرآن وحدیث پر مقدم ہیں۔ لہٰذا اِن علوم کے طلباء میں اور ان علوم کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والوں میں اور انہیں زندگی کے معاملات میں نافذ کرنے والوں میں غلط افکار اور نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں اور وہ کوئی ایسی رائے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے جو اِن علوم کے مخالف ہو۔ پس یہ علوم دین کی زندگی کے امور سے جدائی اور اسلامی ریاست کے قیام کی مزاحمت کی طرف لے جاتے ہیں۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مضامین ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ سائنس نہیں ہیں کیونکہ

یہ مشاہدات اور اُن سے نتائج اخذ کرنے پر مبنی ہیں نہ کہ تجربات پر۔ اور لوگوں پر اِنہیں apply کرنا تجربات کے مترادف نہیں۔ یہ مختلف صورتوں اور حالتوں میں مختلف اشخاص کے ردِّعمل کا بار بار مشاہدہ ہے۔ اِن کی حیثیت تجربہ گاہوں میں ہونے والے تجربات جیسی نہیں ہوتی جہاں کسی چیز کا یا کسی چیز پر تجربہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اِن علوم کی حیثیت سائنس کی نہیں ہوسکتی جو تمام اقوام کیلئے یکساں ہوتی ہے بلکہ یہ ثقافت کے تحت آتے ہیں۔ پھر مزید یہ کہ اِن علوم سے حاصل نتائج ظنی ہوتے ہیں یعنی اُن کے درست یا غلط ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ علوم غلط اساس پر مبنی ہوتے ہیں کیونکہ یہ فرد اور معاشرے کو ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں جو کہ انفرادیت کا نقطۂ نظر ہے پس وہ خاندان سے لے کر جماعت اور جماعت سے لے کر معاشرے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ یہ محض افراد کا مجموعہ ہے، چنانچہ وہ گمان کرتے ہیں کہ معاشرے ایک دوسرے سے جدا اور آزاد ہیں، اور جو حل ایک معاشرے کیلئے مناسب ہے وہ ضروری نہیں کہ دیگر معاشروں کیلئے بھی موزوں ہو۔ جبکہ معاشرہ فی الحقیقت افراد، اُن کے افکار، اُن کے احساسات اور اُن پر نافذ نظاموں سے ترکیب پاتا ہے اور جو افکار اور حل ایک جگہ کے انسانوں کے لیے درست ہیں وہی کسی دوسری جگہ کے انسانوں کیلئے بھی موزوں ہوں۔ اس طرح تمام معاشرے افکار، جذبات اور نظام کی اصلاح سے ایک ہی معاشرے میں ڈھل سکتے ہیں۔ پس معاشرے کی حقیقت کے متعلق غلط افکار ایجوکیشنل سٹڈیز میں تعلیم وتربیت کے متعلق غلط تھیوریوں کی طرف لے گئے اور اسی طرح سوشیالوجی میں بھی یہ غلط تھیوریوں کا باعث بنے کیونکہ یہ اسی انفرادی نقطۂ نظر پر مبنی ہیں اور یہ نفسیات کے علوم سے بھی متاثر ہیں جبکہ نفسیات کے علوم دو اسباب سے غلط ہیں: اول یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ فکر کے لحاظ سے دماغ کئی حصوں میں تقسیم ہے اور اُن کے نزدیک ہر حصے میں ایک خاص قابلیت ہے اور بعض ذہنوں میں کچھ صلاحیتیں ہوتی ہیں جن سے بعض دوسرے اذہان محروم ہوتے ہیں۔ اسکے برعکس حقیقتِ حال یہ ہے کہ دماغ ایک ہی وحدت ہے اور افکار میں فرق دراصل چیزوں کے احساس، جنہیں وہ اپنی حِس کے ذریعے محسوس کرتا ہے، اور اُن کے بارے میں ذہن میں موجود سابقہ معلومات میں فرق ہونے کے سبب ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو قابلیت کسی ایک

دماغ میں ہے وہ کسی اور دماغ میں نہیں ہوتی، بلکہ ہر ذہن میں ہر نوعیت کی فکر کی صلاحیت ہوتی ہے جب اس ذہن کو قابلِ محسوس حقیقت، حواسِ خمسہ اور اُس چیز کے بارے میں سابقہ معلومات میسر ہوں۔ اذہان میں فرق حقیقت کو سابقہ معلومات سے ملانے کی قوت کے فرق ہونے اور حقیقت کے احساس کی قوت کے فرق کی وجہ سے ہوتا ہے جس طرح آنکھیں دیکھنے کی قوت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ لہٰذا کسی بھی فرد کو کسی بھی قسم کی معلومات فراہم کی جائیں تو اُس میں ان معلومات کو ہضم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ صلاحیتوں کے بارے میں ماہرینِ نفسیات کے دعوے بے بنیاد ہیں۔ دوم یہ کہ علمِ نفسیات کے مطابق جبلّتیں (instincts) متعدد ہیں جن میں سے بعض کی دریافت ہو چکی ہے اور بعض ابھی بھی پردۂ راز میں ہیں۔ ماہرینِ نفسیات نے جبلتوں کے اس تصور پر غلط نظریات وضع کر رکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسانی ردِّعمل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان میں زندگی کی ایک طاقت موجود ہے جس کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک وہ جسمانی حاجات ہیں جنہیں پورا کرنا ناگزیر ہے اور جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا جیسا کہ بھوک، پیاس، قضائے حاجت۔ جبکہ دوسری وہ جبلّتیں ہیں جنہیں پورا کیے بغیر انسان مرتا تو نہیں لیکن وہ بے چین اور مضطرب رہتا ہے۔ یہ جبلتیں تین ہیں: جبلتِ نوع، جبلتِ بقاء اور جبلتِ تَــــدَیُّـــنُ ۔ ان جبلتوں یعنی اپنی عاجزی وکمزوری کا احساس، اپنی نسل کو محفوظ رکھنے کے جذبات اور اپنی ذات کی بقاء کا جذبہ، کے علاوہ انسان میں کوئی اور جبلت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ انہی جبلتوں کے مختلف پہلو ہیں جیسے خوف، اتھارٹی کی خواہش اور ملکیت کی خواہش، یہ سب جبلتِ بقاء کے مظاہر ہیں اسی طرح تقدیس اور عبادت جبلتِ تدین کے مظاہر ہیں اور اولاد کی محبت اور بھائیوں سے محبت جبلتِ نوع کے مظہر ہیں۔ پس علم نفسیات انسانی جبلتوں کی سمجھ اور دماغ کی سمجھ کے اعتبار سے غلطی پر ہے لہٰذا وہ تھیوریاں جو اس اساس پر مبنی ہیں وہ بھی غلط ہیں اور نتیجتاً وہ ایجوکیشنل علوم جو علمِ نفسیات سے متاثر ہیں وہ بھی غلط نتائج تک پہنچاتے ہیں۔

پس علمِ عمرانیات، علمِ نفسیات اور ایجوکیشنل سٹڈیز ثقافتی علوم ہیں اور ان میں اسلام

سے متضاد افکار موجود ہیں نیز ان میں نمایاں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی تعظیم کرنا اور زندگی کے مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنا فی الحقیقت اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش میں رکاوٹ ہے۔ لٰہذا یہ ضروری ہے کہ اِن کی حقیقت سے لوگوں کو آ گاہ کیا جائے کہ یہ ثقافتی امور ہیں نہ کہ کوئی مستقل سائنس، اور یہ ظنی معلومات ہیں نہ کہ قطعی حقائق۔ اور یہ غلط اساس پر مبنی ہیں لٰہذا زندگی کے معاملات میں اِن کی طرف رجوع کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ زندگی کے معاملات کو حل کرنے کیلئے مرجع تو صرف اسلام ہی ہوسکتا ہے۔

(5) عالمِ اسلام میں معاشرے کی حیات غیر اسلامی ہے اور معاشرہ ایک ایسی طرز پر زندگی بسر کر رہا ہے جو اسلام سے متضاد ہے۔ اس لئے کہ ریاستی ڈھانچہ اور حکومتی نظام کہ جس پر یہ ڈھانچہ اور معاشرہ کھڑا ہے، اور زندگی کے وہ اصول جن پر معاشرے کے تمام اجزاء استوار ہیں، مسلمانوں کے جذبات جس نہج پر رواں ہیں اور وہ فکری بنیادیں جن کے مطابق مسلمان سوچتے ہیں، یہ تمام کے تمام زندگی کے بارے میں ایسے تصورات پر مبنی ہیں جو اسلامی تصورات کی ضِد ہیں۔ جب تک اس اساس کو تبدیل نہیں کیا جاتا اور اِن غلط تصورات کی تصحیح نہیں کر دی جاتی، معاشرے کی زندگی، ریاستی ڈھانچے اور معاشرے کی بنیاد کو بدلنے میں رکاوٹ برقرار رہے گی نیز وہ فکری اور نفسانی رُجحان جو مسلمانوں پر حاوی ہے، بھی برقرار رہے گا۔

(6) اسلامی حکمرانی اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، خاص طور پر حکومتی اور اقتصادی نظاموں کے میدانوں میں: اِس کی وجہ سے مسلمانوں کا اسلامی زندگی کے بارے میں تصور نہایت کمزور ہو گیا ہے جبکہ غیر مسلموں نے اسلامی زندگی کے بارے میں نہایت منفی منظر کشی کی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مسلمان ایک عرصے تک ایسے دور میں رہے جس میں اُن پر حکمرانوں کی جانب سے اسلام کا غلط نفاذ کیا جاتا رہا۔ پھر خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد سے اب تک مسلمان اپنے ہی دشمنوں کے محکوم ہو کر ایسے نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں جو ہر اعتبار سے اور خاص طور پر اقتصادی اور حکومتی پہلوؤں میں اسلام سے متضاد ہے۔ لٰہذا یہ ضروری ہے کہ مسلمان اس بری

حالت سے بلند ہو کر اُس زندگی کا تصور کریں جو اُنہیں جینی چاہیئے اور جس کی طرف اُنہیں اپنی موجودہ صورتِ حال کو تبدیل کر کے آنا ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ وہ اس بات کا ادراک کریں کہ اسلامی زندگی کی جانب اُن کا لوٹ آنا مکمل ہونا چاہیئے نہ کہ جزوی طور پر، نیز اسلامی احکامات کا نفاذ بیک وقت اور مکمل ہونا چاہیئے نہ کہ سلسلہ وار یا ٹکڑوں میں۔ اس طرح وہ اس زندگی کے تصور کے قریب ہو سکیں گے کہ جو اسلام کی وجہ سے باوقار ہوتی ہے۔

(7) عالمِ اسلام میں جمہوری بنیادوں پر قائم حکومتوں کی موجودگی جو عوام پر سرمایہ دارانہ نظام کو مکمل طور پر نافذ کر رہی ہیں۔ اِن حکومتوں کے مغربی ممالک سے گہرے رشتے ہیں اور ان حکومتوں کی عمارت مسلم علاقوں کو تقسیم کر کے ان کے اوپر کھڑی کی گئی ہے۔ یہ امر اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے کیونکہ اسلام اپنا کامل نفاذ چاہتا ہے اور اس میں اس بات کی اجازت نہیں کہ متعدد مسلم ممالک ہوں بلکہ یہ لازمی ہے کہ تمام مسلم علاقے ایک ہی اقتدار کے تحت اور ایک ہی ریاست ہوں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ اسکی دعوت، اسکے لئے عمل اور اس کا نفاذ جامع ہو اور اِن حکومتوں کی جانب سے ایسی دعوت کی شدید مزاحمت کی جائیگی چاہے یہ حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ یہ ناگزیر ہے کہ اسلامی دعوت مسلم دنیا کے ہر حصے میں لے جائی جائے خواہ یہ حکومتیں اس کی مزاحمت کریں اور خواہ اس راہ میں مشقتیں جھیلنا پڑیں۔

(8) عوام میں قومیت، وطنیت اور اشتراکیت کیلئے رائے عامہ کی موجودگی اور ایسی تحریکوں اور جماعتوں کا وجود جو قومیت، وطنیت اور اشتراکیت کی بنیاد پر کام کر رہی ہیں۔ مغرب نے جب اسلامی علاقوں پر قبضہ کیا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی اور اِن علاقوں میں سرمایہ دارانہ نظام نافذ کیا تو عوام میں اپنے دفاع کا رجحان پیدا ہوا اور ان میں اپنی زمین کے دفاع کے لیے وطنیت کے جذبات ابھرے اور اپنی، اپنے خاندان اور قبیلے کے دفاع کے لیے قبائلی و نسلی جذبے ابھرنے لگے اور لوگ اِن بنیادوں پر حکومت حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ پس وطن پرستی کے نام پر سیاسی تحریکیں ابھریں تا کہ دشمن کو اپنے ملک سے بھگایا جائے، اور اسی طرح قومیت کی بنیاد پر

تا کہ اقتدار اہلِ وطن کو سونپا جائے۔ اس دوران سرمایہ دارانہ نظام جو کہ نافذ العمل تھا، کا فساد اور مسائل کو حل کرنے میں ناکامی لوگوں پر واضح ہونے لگی اور متبادل کے طور پر اشتراکیت (سوشلزم) کی سوچ پھیل گئی اور اشتراکیت کے نام پر تحریکیں شروع ہو گئیں۔ ان تحریکات کے پاس محض وقتی ردِعمل کے سوا کوئی نظامِ حیات نہ تھا، اور اس کے نتیجے میں مسلمان اسلام کی عالمگیر آئیڈیالوجی سے دور ہو گئے۔

باب نمبر 48

اسلامی ریاست کیسے قائم ہوگی؟

اسلامی افکار کی طاقت اور ان افکار کو عمل میں لانے کا طریقہ اسلامی ریاست کو قائم کرنے اور اسلامی طرزِ زندگی کے ازسرِ نو آغاز کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ اسلامی افکار قلوب واذہان میں گہرائی سے اُتر جائیں اور مسلمان اس کے مجسم پیکر بن جائیں تو اسلام عملی زندگی میں زندہ ومتحرک ہوجائیگا۔ لیکن اِن سب کے باوجود اسلامی ریاست کے قیام سے قبل کچھ غیر معمولی افعال کو سرانجام دینا لازمی ہوگا جن سے اسلامی ریاست وجود میں آئے اور اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء کے آغاز کے لیے شدید کوششیں کرنا ہوں گی۔ اس کیلئے محض اسلامی ریاست کے خواب اور خوش امیدی کافی نہیں۔ اور نہ ہی محض جذباتیت اسلامی طرزِ زندگی کو ممکن بنانے کے لیے کافی ہے۔ ضروری ہے کہ اس اُمّ الفرائض کیلئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اُن رکاوٹوں کی شناخت کی جائے جو اِس راہ میں حائل ہیں تاکہ اُنہیں عبور کیا جاسکے۔ یہاں اُن مسلمانوں کو جو اِس عظیم الشان کام کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں، آگاہ کردینا بھی ضروری ہے کہ اُن کے سامنے کس قدر عظیم ذمہ داری ہے، اور وہ دانشور جو اس کام کیلئے تیار ہوں اُنہیں خبردار کردینا بھی ضروری ہے کہ اس کام کیلئے اُن کی آواز کے کیا ممکنہ نتائج ہوسکتے ہیں تاکہ اس راستے میں ان کا قول اور عمل، مکمل شعور، شوق، ارادے، دلیری اور استقامت کے ساتھ ہو۔ جو اِسلامی زندگی کے احیاء کی اس کٹھن راہ پر چلیں اُنہیں پورا شعور ہو کہ وہ ایک سخت چٹان میں اپنی راہ بنا رہے ہیں اور یہ اطمینان بھی ہو کہ

مضبوط ارادے اور مکمل اخلاص سے یہ بالکل ممکن ہے۔ اُنہیں یہ بھی معلوم ہو کہ وہ ایک نہایت نازک اور دقیق ذمہ داری نباہ رہے ہیں جس کے لیے نزاکت اور خوش اسلوبی درکار ہے۔ اُن کی راہ پُر خار ہے لیکن وہ اسے عبور کر سکتے ہیں۔ وہ جس راہ پر چلنے کی ٹھان چکے ہیں اُنہیں اُس سے بھٹکنا نہیں ہے کیونکہ یہ وہ راہ ہے جس پر اللہ کے رسول ﷺ چلے، اور یہ درست راہ ہے اور اگر اس راہ پر کما حقہٗ چلا جائے تو نتائج یقینی ہیں اور کامیابی میں ذرا بھی شک نہیں بشرطیکہ اس راہ پر رسول اللہ ﷺ کی مثال کو سامنے رکھا جائے اور اس سے ہرگز گریز نہ کیا جائے تا کہ راہ کی ٹھوکر سے بچا جا سکے کیونکہ اس راہ میں ہر ٹھوکر اور استنباط میں ہر غلطی اس کام کو بے اثر بنا دے گی۔ لہٰذا خلافت کے قیام کے لیے محض کانفرنسیں منعقد کر لینا یا مسلم ممالک کی فیڈریشن بنانے کی کوشش اسلامی ریاست کے قیام کا طریقہ نہیں ہے اور نہ ہی اسلامی ممالک کی کانفرنسیں منعقد کر لینے سے اسلامی طرزِ زندگی بحال ہو سکتی ہے۔ یہ اور اس جیسی تمام کوششیں اسلامی ریاست کے قیام کا طریقہ نہیں ہیں کیونکہ یہ محض مسلمانوں کے جذبات کو وقتی طور پر ٹھنڈا کرتی ہیں اور انہیں دلاسہ دے دیتی ہیں کہ انہوں نے کچھ کر لیا ہے اور اس کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اسلام کے طریقے کے منافی ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام کا واحد راستہ یہ ہے کہ اسلام کے پیغام کا علمبردار بنا جائے اور اسلامی طرزِ زندگی کی بحالی کیلئے کام کیا جائے اور ضروری ہے کہ ایک ایک کر کے تمام مسلم ممالک تک اس کام کو پھیلایا جائے کیونکہ تمام مسلمان ایک ہی امت ہیں، یہ انسانوں کی وہ جماعت ہیں جن کا ایک ہی عقیدہ ہے اور جس سے ایک ہی نظامِ حیات نکلتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی مسلم ملک میں کیا جانے والا عمل جو مسلمانوں کے افکار و جذبات کو متاثر کرے، اُس کے اثرات دوسرے مسلم ممالک میں بھی پہنچیں گے، لہٰذا یہ نہایت اہم ہے کہ تمام مسلم ممالک کو اس دعوت میں شامل کیا جائے تا کہ اس کے اثرات ہر جگہ ہوں۔ اس امت کی مثال ایک برتن میں پانی کی سی ہے، جب برتن کو نیچے سے حرارت فراہم کی جائے تو پانی گرم ہوگا اور اُس میں اُبال آئیگا اور پانی بھاپ میں تبدیل ہو کر حرکت میں آئیگا۔ یہی مثال اس معاشرے کی ہے جس میں اسلام کی آئیڈیالوجی کو اتار دیا جائے، تو آئیڈیالوجی کی حرارت سے اس میں گرمی پیدا ہوگی اور پھر وہ معاشرہ

اُبلنے لگے گا اور حرکت وعمل کے لیے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ یہ دعوت عالمِ اسلام کیلئے ہو، تا کہ عالمِ اسلام اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء کے لیے کوشش کرے۔ اس کام کیلئے دعوت دینے کے تمام ذرائع اور وسائل اختیار کئے جائیں جیسے کتابیں، پمفلٹ اور رابطے، خاص طور پر رابطے اہم ہیں کیونکہ یہ دعوت کا سب سے کامیاب اسلوب ہے۔ البتہ اس کھلے انداز سے دعوت امت میں موجود انجماد کو حرارت میں بدلنے کے لیے ہے۔ جبکہ اس حرارت کو ابال اور پھر حرکت تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ یہ عملی دعوت اپنے سیاسی رخ کے لحاظ سے کسی ایک ملک یا چند ممالک میں محصور ہو جو اس عظیم کام کا نقطہ آغاز بنے اور یہ دعوت تمام عالمِ اسلام میں پھیل جائے۔ پھر یہ ملک یا ایسے ممالک مل کر اس دعوت کا نقطہ ارتکاز بنیں اور اسلام کی دعوت پھر سارے عالم تک پہنچائی جاسکے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔ آپ ﷺ نے دعوت تمام لوگوں کو دی اور یہ دعوت عملی نہج پر تھی۔ یہ دعوت اہلِ مکہ کو دی گئی اور حج کے موسم میں سارے عرب کو اس کی طرف بلایا گیا اور یہ دعوت سارے جزیرہ نما عرب میں پھیل گئی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ﷺ نے جزیرہ نما عرب کے معاشرے کے نیچے آگ سلگا دی، جس سے سارے عرب میں حرارت پھیل رہی تھی۔ آپ ﷺ حج کے موسم میں عربوں سے رابطہ کرتے اور اُن کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرتے، آپ عرب قبائل کی جگہوں پر جاتے اور انہیں اسلام کی طرف بلاتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ اور کفارِ مکہ کے درمیان مخاصمت کی گونج سارے عرب میں پھیل گئی تھی اور یوں یہ مخاصمت اسلام کی دعوت کو بھی عام کر رہی تھی اور عربوں میں اس دعوت کیلئے تجسس پیدا ہو رہا تھا۔ گو کہ دعوت عربوں تک پہنچ رہی تھی لیکن دعوت کا مجال (میدان) مکہ میں لگا ہوا تھا۔ پھر یہ دعوت مدینہ پہنچی جہاں حجاز میں ایک اسلامی ریاست تشکیل پا گئی۔ تب ہی اس دعوت کی حرارت اور رسول اللہ ﷺ کی فتح نے عرب کو نقطہ ابال اور پھر حرکت تک پہنچایا، پس پورا عرب ایمان لے آیا اور یہ اسلامی ریاست سارے جزیرہ نمائے عرب پر پھیل گئی اور پھر اس کا پیغام ساری دنیا تک پہنچایا گیا۔ اس لئے ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم دعوتِ اسلام کے علمبردار بنیں اور اسلامی طرزِ زندگی کی بحالی کیلئے کام کریں اور اسے اسلامی ریاست کے قیام کا طریقہ بنائیں۔ اور ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم تمام مسلم

ممالک کوایک ہی وحدت سمجھیں اور اِنہیں اپنی دعوت کا ہدف بنائیں۔ لیکن بہرحال اس کام کے میدان کوایک یا کچھ ممالک میں محصور کر کے وہاں کے لوگوں کواسلامی افکار کی تربیت دی جائے تاکہ اُن میں یہ افکار زندہ ہوجائیں اور وہ اس دعوت کی خاطر اُٹھ کھڑے ہوں اور وہاں عام بیداری (الوعی العام) پیدا کریں اور رائے عامہ (الرأی العام) کو ہموار کریں۔ یہاں تک کہ دعوت کے علمبرداروں اور معاشرے کے درمیان قبولیت کا ردِعمل پیدا ہوجائے جوفعال اور موثر ہوگا اور دعوت کوتفاعُل (اِنٹرایکشن) اور نتائج کی طرف لے جائے گا، یہ تفاعل جدوجہد کا باعث بنے گا جس کا مقصد اسلامی ریاست کا قیام ہوگا۔ یوں یہ ریاست اس ملک یا ممالک میں امت میں سے جنم لے گی۔ اور یوں یہ دعوت ایک فکر سے معاشرتی وجود میں اور پھر عوامی تحریک سے ایک ریاست میں تبدیل ہوجائیگی۔ اور یہ دعوت مختلف ادوار سے گزرے گی، پس یہ نقطۂ ابتدا سے نقطۂ انطلاق کو پہنچے گی اور پھر نقطۂ ارتکاز پر جہاں یہ ریاست میں مرتکز ہوگی اور اس ریاست میں تمام ریاستی عناصر موجود ہوں گے اور دعوت کوپیش کرنے کی قوت وصلاحیت بھی ہوگی۔ یہاں سے اس دعوت کے عملی دور کا آغاز ہوگا، جسے شریعت نے اس ریاست پر اور ان مسلمانوں پر فرض کیا ہے جو اس ریاست کے دائرۂ اقتدار سے باہر ہیں۔ جہاں تک ریاست پر عائد فرض کا تعلق ہے، تو وہ یہ ہے کہ ریاست اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکمرانی کرے اور اسلام کومکمل طور پر نافذ کرے، پھر وہ باقی اسلامی ممالک کو اِس ریاست میں ضم کرنے کو اپنی داخلی پالیسی کا حصہ بنائے، اور وہ اسلامی طرزِ زندگی کے از سرِ نو آغاز کی دعوت کوتمام اسلام ممالک میں شروع کرے خاص طور پر ان ممالک میں جو اس ریاست کے پڑوسی ہوں۔ پھر وہ اُن مصنوعی سرحدوں کوختم کرے جو کافر استعمار نے اِن ممالک کے درمیان کھینچ رکھی ہیں اور اُن ممالک کے حکمرانوں کو اِن سیاسی سرحدوں کا محافظ مقرر کر رکھا ہے۔ ریاست پر لازم ہوگا کہ وہ اِن سرحدوں کوختم کرے چاہے اِس کے اردگرد کے ممالک ختم نہ بھی کریں۔ وہ اِن سرحدوں سے گزرنے کیلئے ویزے اور کسٹم ٹیکس کے ناکے بند کردے گی اور اپنے دروازوں کو دیگر اسلامی ممالک کے شہریوں کے لیے کھول دے گی۔ اس سے اُن ممالک کے عوام کو یہ تاثر جائیگا کہ یہ حقیقتاً ایک اسلامی ریاست ہے

اور وہ بذاتِ خود اس ریاست میں اسلام کے نفاذ کا مشاہدہ کر لیں گے۔ اُن مسلمانوں پر جو اس ریاست کی سرحدوں سے باہر ہوں، یہ واجب ہے کہ وہ اپنے ممالک کو جو دارلکفر ہیں کیونکہ وہاں اسلام نافذ نہیں ہو رہا، دارالاسلام میں بدلنے کی کوشش کریں، یہ کام اُس ملک کو دارالاسلام میں ضم کرنے کی دعوت وتشہیر کے ذریعے ہوگا۔ اس سے عالم اسلام کے تمام ممالک کا معاشرہ اُس نقطۂ کھولاؤ کو پہنچ جائے گا اور امت کو صحیح سمت میں حرکت کی طرف دھکیلے گا اور تمام مسلمانان عالم کو ایک ریاست کی شکل میں وحدت بخش دے گا۔ اس طرح ایک عظیم اسلامی ریاست وجود پائیگی جو ایک عالمگیر فکری قیادت کی نمائندہ ہوگی اور ایسا وزن اور پوزیشن حاصل کر لے گی کہ سارے عالم میں اسلام کی دعوت کو پہنچانے کی علمبردار بنے اور دنیا کو شر وفساد سے نجات دلائے۔

اگرچہ امتِ مسلمہ پہلے پہل صرف ایک ملک میں آباد تھی جس کی حدیں جزیرہ نمائے عرب سے آگے نہ تھیں اور مسلمانوں کی تعداد چند لاکھ سے زیادہ نہ تھی، اس کے باوجود جب اس امت نے اسلام کو اختیار کیا اور اس کی دعوت کو لے کر اُٹھی تو وہ اُس وقت کی دو عظیم طاقتوں کے درمیان ایک عالمی طاقت کی شکل میں اُبھری اور دونوں کا ایک ساتھ خاتمہ کیا اور اُن کے علاقوں کو حاصل کر کے وہاں کے بیشتر علاقوں میں اسلام کو پھیلایا، تو پھر آج کی امتِ مسلمہ کے بارے میں کیا توقعات ہونی چاہئیں جو کہ اب دنیا کا ایک چوتھائی ہے اور جس کے ممالک ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں کہ اِن کیلئے متحد ہو کر ایک ریاست میں شامل ہو جانا کوئی محال نہیں۔ یہ ممالک مغرب میں مراکش سے مشرق میں ہندوستان اور پھر انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ امتِ مسلمہ کے پاس وسائل کے اعتبار سے دنیا کا بہترین علاقہ ہے جو سٹریٹجک لحاظ سے بھی بہترین ہے، وہ امت جو دنیا کی واحد صحیح آئیڈیالوجی کی حامل ہے۔ یقیناً یہ امت آج کی بڑی طاقتوں کے مقابلے میں ایک عظیم قوت ہوگی۔ لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اس عظیم اسلامی ریاست کے قیام کے لیے فی الفور اُٹھ کھڑا ہو، جو ساری دنیا تک اسلام کا پیغام لے کر جائے گی۔ اور اسے چاہیے کہ وہ اس عمل کا آغاز اس طرح کرے کہ وہ اس ہدف کے تحت اسلام کی دعوت کا

علمبردار بنے کہ اس نے تمام اسلامی ممالک میں اسلامی طرزِ زندگی کا احیاء کرنا ہے۔ وہ اپنے کام کو عملی طور سے ایک ملک یا کچھ ممالک میں مرتکز کرے تاکہ وہ نقطہ ارتکاز تک پہنچ جائے یہاں تک کہ دعوت سنجیدہ عملی مرحلے میں داخل ہو جائے۔ اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کیلئے یہ عملی اور واضح طریقہ کار ہے اور ایک مسلمان کے لیے اس پر چلنا واجب ہے۔ اور وہ اس راستہ میں پیش آنے والی ہر مشقت کو جھیلنے کیلئے تیار ہو اور اپنی اس کوشش میں وہ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے۔ اس کارِ عظیم میں وہ اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرے اور اس کارِ خیر کے عوض وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کے سوا کسی انعام کا طالب نہ ہو ۔

مسودۂ دستور

عمومی احکامات

دفعہ نمبر 1: اسلامی عقیدہ ہی ریاست کی بنیاد ہے،یعنی ریاست کی ساخت،اس کے ڈھانچے، اس کا محاسبہ یا کوئی بھی ایسی چیز جو ریاست سے متعلق ہو، وہ اسلامی عقیدے ہی کی بنیاد پر استوار ہوگی۔ دستور اور شرعی قوانین کی بنیاد بھی یہی عقیدہ ہے۔ دستور اور قوانین سے متعلق صرف اس چیز کو قبول کیا جائے گا، جو اسلامی عقیدے سے اخذ کردہ ہو۔

دفعہ نمبر 2: دار الاسلام وہ ملک ہے جہاں اسلامی احکامات نافذ ہوں اور اس کا امن وتحفظ اسلامی قوت کے بل بوتے پر ہو۔ دار الکفر وہ ہے جہاں کفریہ نظام نافذ ہو یا اس کا امن وتحفظ اسلام کے علاوہ کسی اور قوت کے مرہونِ منت ہو۔

دفعہ نمبر 3: خلیفہ متعین شرعی احکامات کی تبنی کرے گا جو دستور اور قوانین ہونگے۔ خلیفہ جب کسی حکمِ شرعی کی تبنی کرے تو صرف یہی حکم وہ حکمِ شرعی ہوگا جس پر عمل کرنا عوام پر فرض ہوگا۔ یہ اس وقت سے ہی نافذ العمل قانون بن جائے گا جس پر عمل درآمد عوام میں سے ہر فرد پر ظاہراً اور باطناً فرض ہوگا۔

دفعہ نمبر 4: خلیفہ عبادات میں سے زکوٰۃ و جہاد کے سوا کسی متعین حکمِ شرعی کی تبنی نہیں کرے گا۔ نہ وہ اسلامی عقیدہ سے متعلقہ افکار میں سے کسی فکر کی تبنی کرے گا۔

دفعہ نمبر 5: وہ تمام افراد، جو اسلامی ریاست کی شہریت کے حامل ہوں، انہیں تمام شرعی حقوق حاصل ہونگے اور انہیں اپنے شرعی فرائض پورا کرنے ہوں گے۔

دفعہ نمبر 6: ریاست کے لیے بالکل جائز نہیں کہ وہ اپنے شہریوں کے مابین حکومتی معاملات، عدالتی فیصلوں، لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اور دیگر مسائل میں کسی قسم کا امتیازی سلوک برتے۔ بلکہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام افراد کو رنگ، نسل اور دین سے قطع نظر ایک ہی نظر سے دیکھے۔

دفعہ نمبر 7: ریاست ان تمام افراد پر، جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، حسبِ ذیل طریقے سے اسلامی شریعت نافذ کرے گی:

(ا) مسلمانوں پر بغیر کسی استثناء کے تمام اسلامی احکامات نافذ کرے گی۔

(ب) غیر مسلم جو بھی اعتقاد رکھیں اور جس طرح چاہیں عبادت کریں، ان سے اُس کے متعلق باز پرس نہیں کی جائے گی۔

(ج) ریاست مرتدین پر مرتد سے متعلق اسلامی احکامات لاگو کرے گی، بشرطیکہ وہ خود مرتد ہوئے ہوں۔ لیکن اگر وہ مرتدین کی اولاد ہوں اور پیدائشی غیر مسلم ہوں تو ان کے ساتھ غیر مسلموں کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ یعنی صورت حال کے مطابق کہ وہ مشرک ہیں یا اہل کتاب۔

(د) غیر مسلموں کے ساتھ کھانے پینے اور لباس کے معاملات میں شرعی احکامات کی حدود میں رہتے ہوئے ان کے دین کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

(ہ) غیر مسلموں کے درمیان شادی و طلاق کے معاملات ان کے ادیان کے مطابق نمٹائے جائیں گے اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے یہ معاملات اسلامی احکامات کے مطابق طے کیے جائیں گے۔

(و) باقی تمام شرعی احکامات اور شرعی امور مثلاً معاملات، عقوبات، بینات

(گواہوں)، نظامِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کو تمام رعایا پر، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، ریاست برابری کی بنیاد پر نافذ کرے گی۔ اسی طرح معاہدین (اہلِ معاہدہ)، مستامنین (اسلامی ریاست کی امان میں آنے والے) اور ہر اس شخص پر جو اسلامی ریاست کے زیر سایہ رہتا ہے، ریاست ان احکامات کو نافذ کرے گی، ماسوائے سفیر، ایلچی اور اسی نوعیت کے دیگر لوگ جنہیں سفارتی امان حاصل ہوگی۔

دفعہ نمبر 8: عربی زبان ہی چونکہ اسلام کی زبان ہے، اس لیے ریاست صرف عربی زبان استعمال کرے گی۔

دفعہ نمبر 9: اجتہاد فرضِ کفایہ ہے، ہر مسلمان کو اجتہاد کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ اس کے اندر اجتہاد کے لیے درکار شرائط پائی جاتی ہوں۔

دفعہ نمبر 10: اسلام کے بارے میں تمام مسلمان جوابدہ ہیں، اس لیے اسلام میں رجالِ دین کا طبقہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ریاست کا فرض ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے اندر اس قسم کے رجحانات محسوس کرے تو انہیں روک دے۔

دفعہ نمبر 11: ریاست کا اصل کام اسلامی دعوت کا علمبردار بننا ہے۔

دفعہ نمبر 12: کتاب اللہ، سنتِ رسول ﷺ، اجماعِ صحابہؓ اور قیاس ہی شرعی احکامات کے لیے معتبر ادِلّہ ہیں۔

دفعہ نمبر 13: (عدالتی معاملات میں) اصل بری الذمہ ہونا ہے۔ عدالتی حکم کے بغیر کسی (شخص) کو سزا نہیں دی جائے گی۔ کسی پر تشدد کرنا بالکل جائز نہیں اور جو اس کا مرتکب ہوگا، اسے سزا دی جائے گی۔

دفعہ نمبر 14: افعال کی اصل شرعی احکامات پر عمل کرنا ہے، لہٰذا شرعی حکم معلوم کیے بغیر کوئی کام

نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اشیاء میں اصل اباحت (جائز ہونا) ہے، یہاں تک کہ کسی چیز کے حرام ہونے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

دفعہ نمبر 15: حرام کا وسیلہ (ذریعہ) بھی حرام ہے جب غالب گمان ہو کہ یہ ذریعہ حرام تک لے جائے گا۔ اگر صرف خدشہ ہو کہ یہ ذریعہ حرام تک لے جائے گا تو وہ امر حرام نہیں ہوگا۔

نظامِ حکومت

دفعہ نمبر 16: حکومت کا نظام وحدت کا ہوگا اور یہ اتحادی نوعیت کا نہیں ہوگا۔

دفعہ نمبر 17: حکومت مرکزی ہوگی اور انتظامی امور لامرکزیت کی بنیاد پر ہونگے۔

دفعہ نمبر 18: حکمران چار ہیں: خلیفہ، معاونِ تفویض، والی اور عامل۔ ان کے علاوہ باقی سب ملازم ہیں، حکمران نہیں۔

دفعہ نمبر 19: حکومت یا حکومت سے متعلقہ امور (جنہیں حکومت میں شمار کیا جاتا ہو) چلانے والا شخص صرف آزاد، بالغ، عاقل، عادل، مرد، اور مسلمان ہی ہوسکتا ہے، اور یہ کہ وہ اس کام کو کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دفعہ نمبر 20: حکمرانوں کا محاسبہ مسلمانوں کا حق بھی ہے اور یہ مسلمانوں پر فرضِ کفایہ بھی ہے۔ رعایا کے غیر مسلم افراد کو حکمران کے ظلم یا اسلامی احکامات کو غلط انداز سے نافذ کرنے کی شکایت کے اظہار کا حق حاصل ہے۔

دفعہ نمبر 21: حکام کے محاسبہ یا امت کے ذریعے حکومت تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت ہے، بشرطیکہ یہ پارٹیاں اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر ہوں اور جن احکامات کی ان پارٹیوں نے تبنی کی ہو، وہ شرعی احکامات ہوں۔ پارٹی بنانے کے لیے کسی سے اجازت لینے کی

ضرورت نہیں ہوگی۔ غیر اسلامی بنیاد پر ہر قسم کی پارٹی سازی ممنوع ہوگی۔

دفعہ نمبر 22: حکمرانی کے یہ چار بنیادی اصول ہیں:

(1) اقتدارِ اعلیٰ شریعت کو حاصل ہوگا، نہ کہ عوام کو۔

(2) اتھارٹی (اختیار) امت کو حاصل ہوگی۔

(3) ریاست کے لیے ایک ہی سربراہ (خلیفہ) کا تقرر مسلمانوں پر فرض ہے۔

(4) صرف ریاست کا سربراہ (خلیفہ) ہی شرعی احکامات کی تبنی کرے گا اور وہی دستور اور تمام قوانین مرتب کرے گا۔

دفعہ نمبر 23: ریاست تیرہ ڈھانچوں پر مشتمل ہوگی:

(1) خلیفہ

(2) معاونین (وزراء تفویض)

(3) وزراء تنفیذ

(4) والی

(5) امیرِ جہاد

(6) اندرونی سلامتی

(7) خارجی امور

(8) صنعت

(9) عدلیہ

(10) مفادِ عامہ کی دیکھ بھال کا انتظامی ڈھانچہ

(11) بیت المال

(12) میڈیا

(13) مجلسِ امت (شوریٰ اور محاسبہ)

خلیفہ

دفعہ نمبر 24: خلیفہ ہی اختیار اور شریعت کے نفاذ میں امت کا نمائندہ ہوتا ہے۔

دفعہ نمبر 25: خلافت باہمی رضامندی واختیار کا عقد ہے۔ لہٰذا کسی کو خلافت قبول کرنے یا خلیفہ کے انتخاب پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 26: ہر عاقل وبالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے اور خلیفہ کی بیعت کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن غیر مسلموں کو خلیفہ کے انتخاب یا خلیفہ کی بیعت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

دفعہ نمبر 27: جن لوگوں کی بیعت سے خلافت کا انعقاد ہوتا ہے اگر وہ لوگ بطورِ خلیفہ کسی ایک شخص کی بیعت کرلیں تو باقی لوگوں کی طرف سے دی جانے والی بیعت، بیعتِ اطاعت ہوگی اور یہ بیعتِ انعقاد نہیں ہوگی۔ چنانچہ جس شخص کے اندر سرکشی کے امکانات نظر آئیں اور وہ مسلمانوں کی وحدت کو توڑنے کی کوشش کرے، تو اسے بیعت پر مجبور کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 28: صرف وہی شخص خلیفہ ہوسکتا ہے جسے مسلمان منتخب کریں۔ کسی بھی شخص کو خلیفہ کے اختیارات اس وقت حاصل ہوں گے جب دوسرے شرعی عقود کی طرح اس کی بیعت کا عقد شرعی طور پر مکمل ہوجائے۔

دفعہ نمبر 29: وہ ملک یا خطہ، جو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعتِ انعقاد کرے، کے لیے شرط ہے کہ اس ملک کا اقتدار اس کا اپنا ہو، جس کا انحصار صرف مسلمانوں پر ہو اور کسی کافر ریاست کا اس اقتدار میں

کوئی عمل دخل نہ ہو اور اس ملک کی داخلی و خارجی امان اور مسلمانوں کی امن و سلامتی اسلام کی وجہ سے ہو نہ کہ کفار کے بل بوتے پر۔ جو علاقے صرف خلیفہ کی اطاعت کی بیعت کریں ان کے لیے یہ شرط لازم نہیں۔

دفعہ نمبر 30: خلیفہ کے طور پر جس شخص کی بیعت کی جارہی ہو اس کے اندر انعقادِ خلافت کی تمام شرائط کا موجود ہونا لازم ہے۔ اگرچہ اس کے اندر شروطِ افضلیت نہ بھی ہوں، کیونکہ بنیادی چیز شروطِ انعقاد ہیں۔

دفعہ نمبر 31: خلیفہ کے لیے سات شرائط ہیں اور وہ یہ ہیں: وہ مرد ہو، مسلمان ہو، آزاد ہو، بالغ ہو، عاقل ہو، عادل ہو اور وہ خلافت کی ذمہ داری سے عہدہ برآء ہونے پر قادر ہو۔

دفعہ نمبر 32: اگر خلیفہ کی موت، اس کے معزول ہونے یا معزول کیے جانے کی وجہ سے منصبِ خلافت خالی ہو جائے تو جس تاریخ کو یہ منصب خالی ہو اس کے تین دن (بشمول ان کی راتوں) کے اندر اندر دوسرا خلیفہ مقرر کرنا فرض ہے۔

دفعہ نمبر 33: (نئے خلیفہ کے تقرر کے سلسلے میں) عبوری امیر کا تقرر کیا جائے گا جو کہ مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کرے اور منصبِ خلافت کے خالی ہونے کے بعد نئے خلیفہ کے تقرر کے عمل کا آغاز کرے، جو کہ یہ ہوگا:

(ا) سابق خلیفہ جب یہ محسوس کرے کہ اس کی موت کا وقت قریب ہے یا وہ استعفٰی دینا چاہتا ہو، تو اس صورت میں اسے حق حاصل ہے کہ وہ عبوری امیر کا تقرر کرے۔

(ب) اگر عبوری امیر کے تقرر سے قبل خلیفہ کا انتقال ہو جائے یا وہ استعفٰی دے دے یا خلیفہ کے انتقال یا استعفٰی کے علاوہ کسی اور وجہ سے منصبِ خلافت خالی ہو جائے تو وہ معاون جو معاونین میں سب سے عمر رسیدہ ہو گا، وہ عبوری امیر ہو گا۔ ماسوائے یہ کہ وہ معاون بذاتِ

خود خلافت کا امیدوار ہو۔ ایسی صورت میں وہ معاون عبوری امیر ہوگا جو عمر میں اس سے کم ہو، علیٰ ھذا القیاس۔

(ج) اگر تمام تر معاون خلافت کے امیدوار ہوں، تو پھر وزراء تنفیذ میں سے سب سے عمر رسیدہ معاون عبوری امیر ہوگا، علیٰ ھذا القیاس۔

(د) اگر تمام تر وزراء تنفیذ خلافت کے امیدوار ہوں، تو وزراء تنفیذ میں سے سب سے کم عمر وزیر عبوری امیر ہوگا۔

(ھ) عبوری امیر کو احکامات کی تبنی کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

(و) عبوری امیر اپنی پوری کوشش صرف کرے گا کہ وہ خلیفہ کے تقرر کے عمل کو تین دن کے اندر اندر مکمل کرے۔ اس مدت میں توسیع کی اجازت نہیں، ماسوائے یہ کہ محکمہ المظالم کسی شدید سبب کی بنا پر اس مدت میں توسیع کر دے۔

دفعہ نمبر 34: خلیفہ کے تقرر کا طریقہ بیعت ہے۔ خلیفہ کی تقرر اور اسے بیعت دینے کا عملی طریقہ یہ ہے:

(ا) **محكمة المظالم** منصبِ خلافت کے خالی ہونے کا اعلان کرے گا۔

(ب) عبوری امیر اپنی ذمہ داری سنبھالے گا اور فوری طور پر نامزدگیوں کے کھل جانے کا اعلان کرے گا۔

(ج) وہ درخواستیں قبول کی جائیں گی جو کہ انعقادِ خلافت کی شرائط پر پوری اترتی ہوں۔ اس کے علاوہ پیش کی جانے والی درخواستیں **محكمة المظالم** کے فیصلے کی بنا پر مسترد کر دی جائیں گی۔

(د) وہ امیدوار جن کی درخواستوں کو محکمة المظالم نے قبول کیا، مجلسِ امت کے مسلمان رکن ان امیدواروں کی فہرست کو دو مرتبہ مختصر کریں گے۔ پہلے اختصار میں وہ اکثریتی ووٹوں کی بنیاد پر چھ لوگوں کا انتخاب کریں گے۔ دوسرے اختصار میں وہ اکثریتی ووٹوں کی بنیاد پر دو امیدواروں کا انتخاب کریں گے۔

(ھ) ان دو امیدواروں کے نام کا اعلان کیا جائے گا اور مسلمانوں کو ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

(و) انتخاب کے نتیجے کا اعلان کیا جائے گا اور لوگوں کو آگاہ کیا جائے گا کہ دونوں میں سے کسے زیادہ لوگوں کے ووٹ حاصل ہوئے۔

(ز) وہ شخص جسے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے، مسلمان اسے قرآن وسنت پر عمل پر بیعت دیں گے۔

(ح) بیعت کے مکمل ہونے کے بعد عوام الناس کے لیے اس بات کا اعلان کیا جائے گا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ ہے یہاں تک کہ یہ خبر پوری امتِ مسلمہ تک پہنچ جائے۔ اور اس خبر میں خلیفہ کے نام کا اور ان شرائط کا اعلان کیا جائے گا جنہوں نے اُسے بات کا اہل بنایا کہ اس کی خلافت کا انعقاد کیا گیا۔

(ط) نئے خلیفہ کی تنصیب کے عمل کے مکمل ہونے کے بعد عبوری امیر کی اتھارٹی اختتام کو پہنچے گی۔

دفعہ نمبر 35: خلیفہ کے تقرر کا اختیار امت کو ہی حاصل ہے۔ لیکن جب شرعی طریقے سے خلیفہ کا انتخاب ہو جائے تو پھر امت اسے معزول نہیں کر سکتی۔

دفعہ نمبر 36: خلیفہ کے پاس درج ذیل اختیارات ہوتے ہیں:

(ا) خلیفہ ہی ان احکامات کی تبنی (یعنی احکامات کو اختیار) کرتا ہے، جو لوگوں کے

امور کی دیکھ بھال کے لیے ضروری ہوں، اور یہ تبنی کتاب وسنت سے صحیح اجتہاد کے ذریعے مستنبط کردہ احکامات کی ہوتی ہے۔ تاکہ یہ احکامات قوانین بن جائیں۔ ان قوانین پر عمل فرض ہوتا ہے۔ ان کی مخالفت جائز نہیں۔

(ب) خلیفہ ہی ریاست کی خارجی وداخلی پالیسی کے بارے میں جوابدہ ہوتا ہے۔ وہی فوج کا سربراہ ہوتا ہے۔ وہی اعلانِ جنگ، صلح یا جنگ بندی کا اعلان کرسکتا ہے اور تمام معاہدات کا اختیار اسی کو حاصل ہوتا ہے۔

(ج) خلیفہ ہی بیرونی سفیروں کو قبول یا مسترد کرسکتا ہے۔ اسی طرح وہ مسلمان سفیروں کو مقرر یا معزول کرسکتا ہے۔

(د) خلیفہ ہی معاونین اور والیوں کا تقرر یا انہیں سبکدوش کرسکتا ہے، جس طرح وہ مجلسِ امت کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں، اُسی طرح خلیفہ کے سامنے بھی جوابدہ ہوتے ہیں۔

(ہ) خلیفہ ہی قاضی القضاۃ اور دیگر قاضیوں کو مقرر اور انہیں معزول کرسکتا ہے، تاہم ایک صورت میں خلیفہ قاضی مظالم کو معزول نہیں کرسکتا، جب وہ خلیفہ یا معاون یا قاضی القضاۃ کے خلاف کیس کا جائزہ لے رہا ہو۔ اسی طرح خلیفہ ہی مختلف شعبوں کے ڈائریکٹروں، فوج کے کمانڈروں اور صوبوں کے والیوں کو مقرر یا معزول کرسکتا ہے۔ یہ سب خلیفہ کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ اور یہ مجلسِ امت کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔

(و) خلیفہ ہی ریاست کے بجٹ سے متعلق احکامِ شریعت کی تبنی کا اختیار رکھتا ہے اور وہی بجٹ کی مدات اور آمدن وخرچ سے متعلقہ رقموں کا تعین بھی کرتا ہے۔

دفعہ نمبر 37: خلیفہ قوانین کی تبنی میں احکامِ شریعت کا پابند ہے، چنانچہ کسی ایسے حکم کی تبنی کرنا اس کے لیے حرام ہے جس کا اس نے ''ادِلّہ شرعیہ'' سے صحیح طور پر استنباط نہ کیا ہو۔ وہ اپنے تبنی کردہ احکامات اور طریقہ استنباط کا بھی پابند ہے۔ چنانچہ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے حکم کی تبنی

کرے جس کے استنباط کا طریقہ اُس طریقے سے متناقض ہو جسے خلیفہ نے تبنی کیا ہوا ہو، اور نہ ہی اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کوئی ایسا حکم دے جو اس کے تبنی کردہ احکامات سے متناقض ہو۔

دفعہ نمبر 38: خلیفہ کو اپنی صوابدید اور اجتہاد کے مطابق لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرنے کا مکمل حق حاصل ہے اور اسے ان مباحات کی تبنی کرنے کا حق بھی حاصل ہے جو ریاست کے معاملات کو چلانے اور لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کو آسان بنانے کے لیے درکار ہوں۔ تاہم اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مصلحت کو دلیل بنا کر کسی حکمِ شرعی کی مخالفت کرے۔ مثلاً اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ غذائی قلت کو دلیل بنا کر لوگوں کو کثرتِ اولاد سے منع کرے یا وہ استحصال کو روکنے کے نام پر، یعنی اس کو دلیل بنا کر لوگوں کے لیے اشیائے صرف کی قیمتیں مقرر کرے یا وہ لوگوں کے امور کی دیکھ بھال یا مصلحت کو دلیل بنا کر کسی کافر یا کسی عورت کو والی مقرر کرے۔ اس کے علاوہ کسی بھی حالت میں اسے احکامِ شرع کی مخالفت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال قرار دینا اس کے لیے جائز نہیں۔

دفعہ نمبر 39: خلیفہ کے لیے کوئی محدود مدت مقرر نہیں ہے۔ جب تک وہ شرع کی حفاظت، شرعی احکامات کی تنفیذ اور ریاست کے معاملات کو چلانے پر قادر ہے، وہ خلیفہ ہے، جب تک کہ اس کی حالت میں کوئی ایسی تبدیلی رونما نہ ہو جائے جو اسے منصبِ خلافت سے خارج کر دے۔ پس جب اس کی حالت میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہو جائے تو اسے فوراً معزول کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

دفعہ نمبر 40: وہ امور، جن کی وجہ سے خلیفہ کی حالت بدل جاتی ہے اور وہ منصبِ خلافت سے معزول ہو جاتا ہے، وہ یہ تین امور ہیں:

(1) جب انعقادِ خلافت کی شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو جائے۔ جیسے مرتد ہونا، خلیفہ سے فسق کا ظہور ہو جانا، مجنون ہونا، یا اسی قسم کی کوئی دوسری صورت پیش آئے۔

کیونکہ یہ تمام شرائط خلافت کے انعقاد کی شرائط بھی ہیں اور خلافت کے دوام کی شرائط بھی۔

(2) خلیفہ کسی بھی سبب سے خلافت کے فرائض کی انجام دہی سے عاجز ہو جائے۔

(3) وہ اس قدر مغلوب ہو جائے کہ اپنی رائے سے شریعت کے موافق مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت نہ کر سکے۔ پس جب اس پر کوئی اس حد تک غالب آ جائے کہ وہ احکامِ شرع کی روشنی میں بذاتِ خود اپنے اختیار و ارادے سے، اپنی رائے کے مطابق رعایا کے مفادات کی نگرانی کرنے سے عاجز ہو جائے تو اسے حکماً فرائضِ خلافت کی ادائیگی سے عاجز سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ اس منصب کا اہل نہیں رہتا۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

پہلی صورت: اس کے حاشیہ برداروں میں سے کوئی ایک فرد یا ایک سے زائد افراد اس پر اس طرح مسلط ہو جائیں کہ اس پر اپنی رائے ٹھونس دیں۔ اس صورت میں اگر ان لوگوں سے چھٹکارا پانے کی امید ہو تو اسے ایک معینہ مدت تک مہلت دی جائے گی۔ پھر اگر وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اسے معزول کیا جائے گا۔ اگر شروع ہی سے چھٹکارہ پانے کی امید نہ ہو تو اسے اسی وقت معزول کیا جائے گا۔

دوسری صورت: وہ کسی زبردست دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے۔ یہ گرفتاری خواہ بالفعل ہو یا وہ دشمن خلیفہ پر تسلط حاصل کر لے۔ اس صورت میں اگر بچ نکلنے کی امید ہو تو اسے مہلت دی جائے گی ورنہ اسے معزول کیا جائے گا۔ اگر شروع ہی سے خلاصی کی کوئی امید نہ ہو تو خلیفہ کو فوراً معزول کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 41: صرف **محکمة المظالم** ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا خلیفہ کی حالت اس قدر بدل چکی ہے جس کی وجہ سے اب وہ خلافت کے منصب کا اہل نہیں رہا۔ صرف اور صرف **محکمة المظالم** ہی کو خلیفہ کے ہٹانے یا تنبیہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

معاونِ تفویض

دفعہ نمبر 42: خلیفہ اپنے لیے معاونِ تفویض مقرر کرے گا جو حکمرانی کی ذمہ داری اٹھائے گا۔ پس خلیفہ اسے اپنے رائے کے مطابق امور کی تدبیر کرنے اور اپنے اجتہاد کے مطابق معاملات نپٹانے کی ذمہ داری سونپے گا۔

جب خلیفہ کا انتقال ہو جاتا ہے تو معاونین کی ذمہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کام کو جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ عبوری امیر کا دور اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔

دفعہ نمبر 43: معاونِ تفویض کے لیے بھی وہی شرائط ہوں گی جو خلیفہ کے لیے ہیں۔ یعنی وہ ایک آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان اور مرد ہو۔ اس کے علاوہ اس کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دفعہ نمبر 44: معاونِ تفویض کو اختیارات سونپنے کی دو شرائط ہیں:

(1) اسے عمومی اختیار سونپا جائے۔

(2) اسے نیابت حاصل ہو۔ اس لیے خلیفہ کو لازماً یہ کہنا چاہیے کہ میں نے اپنے تمام اختیارات میں تمہیں اپنا نائب بنایا، یا وہ کوئی دوسرے الفاظ استعمال کرے جو عمومی اختیار اور نیابت کو ظاہر کرتے ہوں۔ یہ تقرر خلیفہ کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ معاونین کو مخصوص جگہوں کی طرف بھیجے یا انہیں ایک جگہ سے دوسرے جگہ یا دوسرے کام کی طرف بھیج دے، اس انداز سے جو خلیفہ کو اس کے کام میں مدد دے۔ اور یہ امر اس بات کا مقتضی نہیں کہ ان کی نئے سرے سے تقرری کی جائے کیونکہ یہ سب کام معاونین کے بنیادی تقرر میں شامل ہے۔

دفعہ نمبر 45: معاونِ تفویض پر لازم ہے کہ وہ جن امور کی تدبیر کرے یا جن احکام کو نافذ

کرے، ان سے خلیفہ کو باخبر رکھے، تا کہ اختیارات کے استعمال میں خلیفہ اور اس کے درمیان فرق ہو۔ اس کا کام خلیفہ کو باخبر رکھنا اور خلیفہ جن چیزوں کی تنفیذ کا حکم دے، انہیں نافذ کرنا ہے۔

دفعہ نمبر 46: خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ معاونِ تفویض کے اعمال اور تدابیر کا جائزہ لے، تا کہ ان میں سے صحیح کو برقرار رکھے اور غلط کا تدارک کرے۔ کیونکہ اُمت کے معاملات کی نگرانی خلیفہ کی ذمہ داری اور اس کے اجتہاد پر موقوف ہے۔

دفعہ نمبر 47: جب معاونِ تفویض کسی معاملے کی تدبیر کرے اور خلیفہ اس کی منظوری دے دے، تو معاون کو چاہیے کہ وہ اسے کسی کمی بیشی کے بغیر اسی طرح نافذ کرے جس طرح کہ خلیفہ نے منظوری دی تھی۔ اگر خلیفہ پھر اس معاملے کا جائزہ لے اور دیکھے کہ معاون نے اس امر کے خلاف عمل کیا ہے، تو دیکھا جائے گا کہ اگر یہ حکم کسی ایسے معاملے سے متعلق ہو جسے معاون نے خلیفہ کے نقطۂ نظر کے مطابق نافذ کیا ہو، یا یہ حکم کسی ایسے مال سے متعلق ہو جسے معاون نے خلیفہ کی طرف سے کر دیا ہو تو اس صورت میں معاون کی رائے نافذ العمل سمجھی جائے گی۔ کیونکہ یہ دراصل خلیفہ کی رائے تھی اور جو احکامات نافذ کیے گئے، یا جو اموال خرچ کیے گئے، خلیفہ اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اگر جس معاملے کو معاون نے نپٹایا ہو، اس کا تعلق ایسے امور کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ ہو، مثلاً کسی کو والی مقرر کرنا یا فوج تیار کرنا۔ تو اس صورت میں خلیفہ اس معاملے کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اس صورت میں خلیفہ ہی کی رائے نافذ ہوگی اور معاون کا فیصلہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایسے اعمال ہیں کہ اگر یہ خود خلیفہ سے بھی صادر ہوئے ہوں تو تب بھی وہ ان کا تدارک کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے معاملات میں خلیفہ اپنے معاون کے فیصلوں کی تلافی تو بطریقِ اولیٰ کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 48: معاونِ تفویض کو کسی خاص محکمے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی نگرانی عام ہے۔ کیونکہ جو لوگ انتظامی معاملات کو پورا کرتے ہیں وہ ملازم ہوتے ہیں نہ کہ حکمران۔ جبکہ معاونِ تفویض حکمران ہے۔ اور اسے کسی خاص عمل کی سرانجام دہی کے ساتھ

مخصوص کرنا درست نہیں کیونکہ اس کی تقرری عام ہے۔

معاونِ تنفیذ

دفعہ نمبر 49: خلیفہ احکامات کی تنفیذ کے لیے ایک معاون مقرر کرے گا۔ اس کا کام انتظامی امور سے متعلق ہوتا ہے اور اس کا کام حکمرانی کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے دفتر کا کام خلیفہ کی جانب سے داخلی اور خارجی امور سے متعلق صادر ہونے والے احکامات کو نافذ کرنا ہے۔ اور ان سے پیغامات کو خلیفہ تک پہنچانا ہے۔ گویا معاونِ تنفیذ خلیفہ اور دوسروں کے درمیان واسطے کا کام کرتا ہے۔ وہ خلیفہ کی طرف سے پیغام لاتا ہے اور خلیفہ کی طرف مندرجہ ذیل امور کے متعلق پیغام لے کر جاتا ہے:

ا) رعیت کے ساتھ تعلقات

ب) بین الاقوامی تعلقات

ج) فوج یا لشکر

د) فوج کے علاوہ دیگر ریاستی شعبوں کے متعلق

دفعہ نمبر 50: معاونِ تنفیذ مسلمان ہوتا ہے، کیونکہ وہ خلیفہ کے قریبی مصاحبین میں سے ہوتا ہے۔

دفعہ نمبر 51: معاونِ تنفیذ براہِ راست خلیفہ کے ساتھ ہوتا ہے، جس طرح کہ معاونِ تفویض ہوتا ہے۔ یہ صرف تنفیذ میں معاون ہوتا ہے، حکمرانی میں نہیں۔

والی

دفعہ نمبر 52: ان علاقوں کو، جو اسلامی ریاست کے زیرِ نگیں ہیں، کئی ایک اکائیوں میں تقسیم کیا

جاتا ہے اور ہر اکائی کو ولایہ (صوبہ) کہا جاتا ہے۔ پھر ولایہ کو کئی اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر اکائی کو عمالہ کہا جاتا ہے۔ ولایہ کے سربراہ کو والی یا امیر اور عمالہ کے سربراہ کو عامل یا حاکم کہا جاتا ہے۔

دفعہ نمبر 53: والیوں کا تقرر خلیفہ کرتا ہے۔ عمال کا تقرر خلیفہ بھی کرسکتا ہے اور والی بھی بشرطیکہ خلیفہ یہ اختیار والیوں کے حوالے کرے۔ والیوں اور عاملوں کے لیے وہی شرائط ہیں جو معاونین کے لیے ہیں۔ چنانچہ ان کا مسلمان، عاقل، بالغ، آزاد، عادل اور مرد ہونا لازمی ہے۔ جو کام ان کے حوالے کیے گئے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت بھی شرط ہے۔ ان لوگوں کا انتخاب تقویٰ اور قوت کی بنیاد پر ہوگا۔

دفعہ نمبر 54: والی کو خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے اپنے صوبے کے شعبوں کے تمام کاموں پر حکمرانی اور نگرانی کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ گویا والی کو اپنی ولایہ میں وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو معاونین کو ریاست میں حاصل ہیں، یعنی وہ اپنی ولایہ کا امیر ہے۔ مالیات، عدلیہ اور فوج کو چھوڑ کر ہر چیز پر اس کی نگرانی ہوگی، تاہم پولیس بطورِ تنفیذ اس کے ماتحت ہوگی اور بحیثیت ادارہ اس کے ماتحت نہیں ہوگی۔

دفعہ نمبر 55: والی اپنی امارت سے متعلقہ امور کے بارے میں جن فیصلوں یا احکامات پر دستخط کرے، ان کے بارے میں وہ خلیفہ کو مطلع کرنے کا پابند نہیں۔ ہاں! اختیاری طور پر اسے باخبر کرسکتا ہے۔ البتہ جب کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو وہ خلیفہ کے علم میں لائے بغیر اس کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ لیکن اگر تاخیر کی صورت میں کسی معاملے کے بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس معاملے کو طے کرے گا۔ پھر خلیفہ کو لازمی طور پر آگاہ کرے گا اور وہ اسباب بھی بتائے گا جن کی وجہ سے وہ معاملے کو طے کرنے سے قبل خلیفہ کو باخبر نہیں کرسکا۔

دفعہ نمبر 56: ہر ولایہ کے اندر ولایہ میں رہنے والوں میں سے ایک کمیٹی (مجلس) منتخب کی جائے

گی، جس کا سربراہ خود والی ہوگا۔ اس کمیٹی کو انتظامی معاملات سے متعلق رائے کے اظہار کا اختیار ہوگا، جبکہ حکومتی معاملات سے متعلق اس کے پاس یہ اختیار نہیں ہوگا۔ اس کی اغراض دو ہیں:

اول: مجلس والی کو ولایہ اور اس کی ضروریات کے متعلق معلومات پیش کرے گی اور ان امور پر اپنی رائے دے گی۔

دوم: والی کی حکمرانی پر اپنی رضامندی یا شکایت کے اظہار کے لیے۔

پہلے معاملے میں (والی کے لیے) مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازم نہیں، جبکہ دوسرے معاملے میں مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازم ہے۔ پس اگر مجلس شکایت کرے تو والی کو معزول کر دیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 57: ایک ولایہ پر ایک ہی شخص کا طویل مدت تک والی کے طور پر خدمات سرانجام دینا مناسب نہیں۔ خاص طور پر جب کسی ایک ولایہ میں وہ مرکزی شخصیت بن جائے یا اس کی وجہ سے لوگوں کے فتنے میں پڑنے کا خطرہ ہو۔

دفعہ نمبر 58: والی کا ایک ولایہ سے دوسری ولایہ میں تبادلہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اسے مخصوص جگہ پر عمومی اختیار سونپا جاتا ہے۔ البتہ اسے معزول کر کے پھر دوسری جگہ پر والی مقرر کیا جا سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 59: جب خلیفہ والی کو معزول کرنا مناسب سمجھے تو اسے معزول کر سکتا ہے۔ یا پھر مجلسِ امت اس پر عدم اعتماد کا اظہار کر دے، یا مجلس اس سے ناراضگی کا اظہار کرے، تو اسے معزول کیا جائے گا۔ والی کو صرف خلیفہ ہی معزول کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 60: خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ والیوں کے اعمال پر نظر رکھے اور ان کی کڑی نگرانی کرے۔ وہ ان پر نظر رکھنے کے لیے اپنے نائب مقرر کرے، ان کے بارے میں برابر تفتیش کرتا رہے، وقتاً

فو قتاً تمام والیوں کا ایک ساتھ یا الگ الگ اجلاس بلاتا رہے اور والیوں کے بارے میں رعایا کی شکایتوں سے انہیں باخبر کرے۔

امیرِ جہاد: شعبۂ حرب - افواج

دفعہ نمبر 61: شعبۂ حرب، مسلح افواج، پولیس، اسباب وذرائع، فوجی مہمات اور لڑائی کے ساز وسامان وغیرہ پر ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح عسکری کالج، کمیشن، فوج کی اسلامی تربیت اور عسکری تربیت اور جنگ یا جنگی تیاری سے متعلق ہر کام کی ذمہ داری بھی شعبۂ حرب کے ذمے ہے۔

دفعہ نمبر 62: جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔ چنانچہ فوجی تربیت لازمی ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان مرد جب پندرہ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس پر جہاد کی تیاری کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا فرض ہے۔ جہاں تک فوج میں بھرتی ہونے۔ کا تعلق ہے تو یہ فرضِ کفایہ ہے۔

دفعہ نمبر 63: فوج کی دو اقسام ہیں۔ اول: احتیاطی (ریزرو) فوج؛ اس سے مراد وہ تمام مسلمان ہیں جو اسلحہ اٹھا سکتے ہیں۔ دوم: مستقل فوج؛ مستقل فوج کی تنخواہیں دیگر ملازمین کی طرح ریاستی بجٹ سے مختص کی جاتی ہیں۔

دفعہ نمبر 64: فوج کے لیے اَلْوِیہ (علَم) اور رایات (جھنڈوں) کا تعین کیا جائے گا۔ ریاست کا سربراہ (خلیفہ) جسے فوج کا سربراہ بنائے گا، اسے علَم عطا کرے گا، جبکہ جھنڈے بریگیڈ کمانڈرز تقسیم کریں گے۔

دفعہ نمبر 65: خلیفہ فوج کا بھی قائد ہوتا ہے، اور وہی فوج کے کمانڈر انچیف کا تقرر بھی کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر بریگیڈ اور ہر ڈویژن کے کمانڈر کا تقرر بھی کرتا ہے۔ فوج کی باقی ترتیب اس کے امراء اور بریگیڈ کمانڈر کرتے ہیں۔ جہاں تک فوج کے سٹاف کمانڈرز کا تعلق ہے تو ان کا تقرر جنگی تربیت (ثقافت) کی بنیاد پر ہوگا اور انہیں کمانڈر انچیف مقرر کرے گا۔

دفعہ نمبر 66: پوری فوج ایک اکائی ہے اور اسے مختلف چھاؤنیوں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ چھاؤنیاں مختلف ولایات (صوبوں) میں ہوتی ہیں اور بعض چھاؤنیاں جنگی حکمت عملی کے مقامات پر ہوتی ہیں۔ اسی طرح کچھ چھاؤنیاں ہمیشہ متحرک رہتی ہیں اور یہ بے پناہ جنگی قوت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان چھاؤنیوں کو کئی ایک مجموعوں میں منظّم کیا جاتا ہے۔ پھر ہر مجموعے کا ایک خاص فوجی نام رکھا جاتا ہے اور اس کا ایک خاص نمبر ہوتا ہے۔ جیسے یونٹ نمبر 1، نمبر 2، نمبر 3 وغیرہ یا انہیں صوبوں اور شہروں کے نام کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے۔

دفعہ نمبر 67: فوج کے لیے اعلیٰ معیار کی عسکری تعلیم کو ممکن بنانا اور جس قدر ہو سکے اسے فکری طور پر بلند کرنا ضروری ہے۔ فوج کے ہر سپاہی کو اسلامی ثقافت سے بہرہ ور کیا جانا چاہیے، تاکہ اس کے اندر اسلامی بیداری ہو، خواہ یہ اجمالی شکل ہی میں کیوں نہ ہو۔

دفعہ نمبر 68: یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ ہر چھاؤنی میں ایسے کمانڈروں کی کافی وشافی تعداد موجود ہو، جو فوجی اور جنگی امور کے ماہر ہوں۔ جو جنگی منصوبہ بندی اور معرکوں کے بارے میں مہارت رکھتے ہوں۔ ایسے کمانڈروں کا تناسب فوج میں ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔

دفعہ نمبر 69: فوج کے پاس وافر مقدار میں اسلحہ، آلات، ضروری ساز وسامان اور لوازمات کا ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ ایک اسلامی فوج کے طور پر اس کے فریضے کی ادائیگی میں یہ چیزیں اس کے لیے مدد ومعاون ثابت ہوں۔

شعبۂ داخلی امن وسلامتی

دفعہ نمبر 70: شعبۂ داخلی امن وسلامتی، وہ شعبہ ہے جو امن وامان سے متعلق ہر چیز کا ذمہ دار ہے، اور ہر اس چیز کو روکنے کا ذمہ دار ہے جو کہ داخلی امن وسلامتی کے لیے خطرے کا باعث ہو۔

امن کی حفاظت پولیس کے ذریعے کی جائے گی۔ شعبۂ امن وسلامتی فوج کواس مقصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتا، ماسوائے خلیفہ اسے اس بات کی اجازت دیدے۔ اس شعبے کا سربراہ ''ڈائریکٹر برائے داخلی امن وسلامتی'' ہوگا۔ ہرصوبے میں اس شعبے کی شاخ ہوگی جو''داخلی امن و سلامتی کا ادارہ'' کہلائے گی اوراس کا سربراہ ''صاحبِ شُرطہ'' کہلائے گا۔

دفعہ نمبر 71: پولیس کی دوقسمیں ہیں: ملٹری پولیس جو کہ امیر جہاد یعنی شعبۂ حرب کے تابع ہو گی۔ پولیس کی دوسری قسم جو کہ امن وسلامتی کے تحفظ کے لیے عدلیہ کے ہاتھ میں ہوگی، اور یہ ''شعبۂ امن وسلامتی'' کے تابع ہوگی۔ پولیس کی ان دونوں قسموں کو خاص تربیت اور ثقافت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کرسکیں۔

دفعہ نمبر 72: داخلی امن وسلامتی کے لیے بنیادی خطرات، شعبۂ داخلی امن وسلامتی جن خطرات کی روک تھام کرے گا، وہ یہ ہیں: ارتداد، بغاوت اور حرابہ، لوگوں کی مال ودولت پر حملہ، لوگوں کی جان اور عزت پر دست درازی اور ان مشتبہ لوگوں سے نبٹنا، جو حربی کفار کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔

شعبۂ خارجہ

دفعہ نمبر 73: شعبہ خارجہ ان تمام خارجی امور کو سرانجام دیتا ہے، جن کا تعلق ریاستِ خلافت کے دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلق کے ساتھ ہے۔ خواہ یہ تعلقات سیاسی نوعیت کے ہوں یا اقتصادی یا صنعتی یا زرعی یا تجارتی نوعیت کے؛ یا ان تعلقات کی نوعیت مواصلاتی رابطہ کی ہو، خواہ یہ رابطہ ڈاک کے ذریعے ہو یا یہ ٹیلی کمیونیکیشن رابطہ ہو یا کوئی اور۔

شعبۂ صنعت

دفعہ نمبر 74: شعبۂ صنعت وہ محکمہ ہے جو صنعت سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہے۔ خواہ اس کا تعلق بھاری صنعت سے ہو جیسے انجن اور آلات سازی، گاڑیوں کے ڈھانچے، الیکٹرونک آلات اور دیگر اشیاء کی صنعت یا پھر یہ ہلکی (چھوٹی) صنعت ہو۔ وہ کارخانے جن کا حربی (جنگی) صنعت سے تعلق ہو، اس شعبے کے تحت آتے ہیں۔ خواہ ان کارخانوں میں تیار کردہ مال عام ملکیت سے تعلق رکھتا ہو یا انفرادی ملکیت سے۔ تمام کارخانے جنگی پالیسی کی بنیاد پر استوار ہونے چاہئیں۔

عدلیہ

دفعہ نمبر 75: عدلیہ کسی معاملے پر فیصلہ صادر کرتی ہے تاکہ اسے نافذ کیا جائے۔ عدلیہ کے ذریعے لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے یا ان چیزوں کا سد باب کیا جاتا ہے جو جماعت (معاشرہ) کے حق میں نقصان دہ ہیں یا رعایا اور حکمرانوں کے درمیان پائے جانے والے کسی بھی تنازع کو دور کیا جاتا ہے، خواہ وہ حاکم ہو یا سرکاری ملازم ہو یا خلیفہ ہو یا کوئی اور شخص۔

دفعہ نمبر 76: خلیفہ کسی ایسے شخص کو قاضی القضاۃ مقرر کرتا ہے، جو مرد، عاقل، بالغ، آزاد، عادل اور مسلمان ہو اور وہ فقیہ بھی ہو، پھر انتظامی قوانین کے اندر رہتے ہوئے دوسرے قاضیوں کو مقرر کرنا، ان سے باز پرس کرنا اور انہیں معزول کرنا قاضی القضاۃ کا کام ہے۔ جہاں تک محکمہ قضاۃ کے دیگر ملازمین کا تعلق ہے تو یہ ایک علیحدہ انتظامی ادارے کا کام ہے، جو ان کے معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔

دفعہ نمبر 77: قاضیوں کی تین اقسام ہیں:

(1) قاضی: جو لوگوں کے درمیان معاملات اور عقوبات سے متعلق جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے۔

(2) قاضی محتسب: اس کا کام ان اختلافات کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے جو جماعت

(معاشرہ) کونقصان پہنچاتی ہیں۔

(3) قاضی مظالم: اس کا کام عوام اور حکومت کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کا فیصلہ کرنا ہے۔

دفعہ نمبر 78: جس شخص کو قاضی کی ذمہ داری سونپی جائے اس کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان، آزاد، بالغ، عاقل، عادل، فقیہہ اوران واقعات سے متعلق اسلامی احکامات کا ادراک کرنے والا ہو۔ قاضی مظالم کے لیے ان شرائط کے علاوہ دواور شرائط بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ قاضی مظالم مرد اور مجتہد بھی ہو۔

دفعہ نمبر 79: یہ بات جائز ہے کہ قاضی اور محتسب کو ہر علاقے میں تمام فیصلے کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی خاص علاقے میں خاص قسم کے مقدمات کی ذمہ داری اس کے حوالہ کی جائے۔

دفعہ نمبر 80: عدالت صرف ایک ایسے قاضی پر مشتمل ہوگی جسے مقدمات کے فیصلے کا اختیار ہوگا۔ اس کے ساتھ دوسرے قاضی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن انہیں فیصلے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، بلکہ وہ صرف مشورہ اوراپنی رائے دے سکتے ہیں۔ ان کی رائے پر چلنا بھی قاضی پر لازم نہیں۔

دفعہ نمبر 81: قاضی کے لیے عدالت کے علاوہ کہیں اور فیصلہ کرنا جائز نہیں نیز گواہی اور قَسم بھی وہی معتبر ہوگی، جو عدالت میں دی گئی ہو۔

دفعہ نمبر 82: فیصلوں کی نوعیت کے اعتبار سے عدالتوں کی درجہ بندی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ بعض قاضیوں کو کچھ خاص نوعیت کے معاملات کے فیصلوں کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر امور کو دوسری عدالتوں کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔

دفعہ نمبر 83: اپیل کورٹ، سیشن کورٹس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کسی مقدمے کا فیصلہ ایک ہی

مرتبہ اور اٹل ہوتا ہے۔ جب قاضی کسی فیصلے کا اعلان کرے تو وہ اسی وقت نافذ العمل ہو جاتا ہے، کسی بھی دوسرے قاضی کا فیصلہ اس فیصلے کو ختم نہیں کرسکتا، ماسوائے جب وہ قاضی اسلام کے علاوہ کسی اور بنیاد پر فیصلہ دے یا کتاب وسنت یا اجماع صحابہ کی قطعی نص کے خلاف فیصلہ دے، یا اس کا فیصلہ واقعہ کی حقیقت کے خلاف ہو۔

دفعہ نمبر 84: قاضی محتسب وہ قاضی ہوتا ہے جو ایسے تمام مقدمات پر نظر رکھتا ہے جن کا تعلق حقوقِ عامہ سے ہو اور جن میں مدعی نہ ہو، بشرطیکہ وہ حدود اور جنایات میں داخل نہ ہوں۔

دفعہ نمبر 85: محتسب کو جیسے ہی کسی واقعہ کا علم ہو تو وہ فوراً اس کے بارے میں حکم صادر کرسکتا ہے، خواہ کسی بھی جگہ پر ہو۔ اسے فیصلہ صادر کرنے کے لیے مجلسِ عدالت کی ضرورت نہیں۔ اس کے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے اس کے ماتحت پولیس کے افراد ہوں گے اور اس کا حکم فوری طور پر نافذ العمل ہوگا۔

دفعہ نمبر 86: محتسب اپنے لیے ایسے نائب منتخب کرسکتا ہے جو محتسب ہونے کی شرائط پر پورا اترتے ہوں۔ وہ انہیں مختلف علاقوں میں پھیلا دے گا۔ ان نائبین کو اپنے اپنے علاقوں یا محلوں میں جن امور کے فیصلے سپرد کیے جائیں ان کے متعلق محتسب کا فریضہ سرانجام دینے کا مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔

دفعہ نمبر 87: قاضی مظالم وہ قاضی ہوتا ہے جس کا تقرر ریاست کے زیرِ سایہ زندگی گزارنے والے ہر شخص پر ہونے والے ریاستی ظلم کا تدارک کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ خواہ وہ شخص ریاست کی رعایا میں سے ہو یا نہ ہو۔ یہ ظلم خواہ ریاست کے سربراہ کی طرف سے ہو یا اس کے علاوہ کسی اور حاکم یا سرکاری ملازم کی طرف سے۔

دفعہ نمبر 88: خلیفہ یا قاضی القضاۃ، قاضی مظالم کا تقرر کرے گا۔ جہاں تک قاضی مظالم کے

محاسبہ، اس کی باز پرس یا اسے ہٹانے کا تعلق ہے تو یہ خلیفہ یا قاضی القضاۃ کرتا ہے، بشرطیکہ خلیفہ نے قاضی القضاۃ کو یہ اختیار دیا ہو۔ لیکن جب وہ خلیفہ، معاونِ تفویض یا مذکورہ قاضی القضاۃ کے ظلم پر غور کر رہا ہو تو اس وقت اسے سبکدوش کرنا درست نہیں۔ اس صورت میں یہ اختیار **محکمة المظالم** کو حاصل ہوگا۔

دفعہ نمبر 89: قاضی مظالم کوئی ایک شخص یا چند افراد نہیں بنتے بلکہ ریاست کا سربراہ مظالم کو ختم کرنے کے لیے حسبِ ضرورت جتنی تعداد مقرر کرنا چاہے، کرسکتا ہے۔ لیکن براہِ راست فیصلے کے دوران صرف ایک قاضی کو فیصلے کا اختیار ہوگا۔ فیصلے کی مجلس میں متعدد قاضی مظالم کا بیٹھنا جائز ہے۔ لیکن انہیں صرف مشورے کا اختیار ہوگا۔ اس (فیصلے کرنے والے قاضی) کے لیے ان کی رائے پر عمل کرنا بھی لازمی نہیں۔

دفعہ نمبر 90: **محکمة المظالم** کو ریاست کے کسی بھی حاکم یا ملازم کو معزول کرنے کا حق حاصل ہے، جیسا کہ اسے خلیفہ کو معزول کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے، جب اس ظلم کو دور کرنے کے لیے خلیفہ کو ہٹانا لازمی ہو جائے۔

دفعہ نمبر 91: **محکمة المظالم** کسی بھی قسم کے ظلم کا جائزہ لینے کا اختیار رکھتا ہے۔ خواہ یہ ظلم ریاستی ڈھانچے کے افراد سے متعلق ہو یا خلیفہ کی جانب سے احکامِ شریعت کی مخالفت کے حوالے سے ہو یا خلیفہ کے تبنی کیے ہوئے دستور و قانون یا دوسرے شرعی احکامات کے تعین کے سلسلے میں کسی شرعی نص کی مخالفت کے متعلق ہو، یا پھر اس کا تعلق ٹیکس کے نفاذ وغیرہ سے ہو۔

دفعہ نمبر 92: **محکمة المظالم**، میں نہ تو مجلسِ عدالت کا ہونا شرط ہے اور نہ ہی مدعی علیہ کو بلانے یا کسی مدعی کی موجودگی شرط ہے۔ بلکہ **محکمة المظالم** کو ظلم پر نظر رکھنے کا حق ہے، خواہ کوئی بھی دعویٰ نہ کرے۔

دفعہ نمبر 93: ہر انسان کو جھگڑے (خصومت) اور دفاع دونوں صورتوں میں کسی کو اپنا وکیل بنانے کا حق حاصل ہے۔ خواہ وہ (وکیل) مسلمان ہو یا غیر مسلم، مرد ہو یا عورت۔ اس معاملے میں وکیل اور مؤکل میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ وکیل کے لیے اپنی وکالت کی اجرت لینا جائز ہے۔ اجرت دونوں (وکیل اور مؤکل) کی رضامندی سے مقرر ہوگی۔

دفعہ نمبر 94: ہر وہ شخص، جو خاص اعمال کو انجام دینے کا اختیار رکھتا ہو، مثلاً وصی (نگران) اور ولی (سرپرست) یا اس کے پاس اعمالِ عامہ کی انجام دہی کا اختیار ہو، جیسے خلیفہ کا مقرر کردہ سربراہ، حاکم، ملازم، قاضی مظالم اور محتسب، تو وہ اپنے دفاع یا جھگڑے (خصومت) کے لیے کسی کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔ یہ وکالت بھی وصی، ولی یا خلیفہ یا حاکم یا ملازم یا قاضی مظالم اور محتسب کے اعتبار سے ہوگی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مدعی ہو یا مدعی علیہ۔

دفعہ نمبر 95: وہ معاہدات، معاملات اور مقدمات جو کہ خلافت سے قبل ہوئے اور ان کے متعلق فیصلوں کو خلافت کے قیام سے قبل نافذ کیا جا چکا، خلافت کی عدلیہ انہیں منسوخ نہیں کرے گی اور ان پر نظرثانی نہیں کرے گی، ماسوائے:

ا) اسلام کے خلاف ان کا اثر اب بھی موجود ہو۔ ایسی صورت میں ان پر نظرثانی واجب ہوگی۔

ب) جب کسی فیصلے کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے ہو، جو کہ گذشتہ حکمرانوں یا ان کے حواریوں سے وقوع پزیر ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوبارہ ان مقدمات کی سماعت کرے۔

انتظامی ڈھانچہ

دفعہ نمبر 96: ریاستی امور کو چلانے اور لوگوں کے مفادِ عامہ کا تحفظ کرنے کے لیے مختلف محکمے،

شعبے اور ادارے ہوتے ہیں، جن کی ذمہ داری ریاست کے مسائل کو حل کرنا اور لوگوں کی ضروریات پوری کرنا ہے۔

دفعہ نمبر 97: مفادِ عامہ کے محکمے، شعبے اور ادارے نظام میں سادگی، ذمہ داریوں کو جلدی نبٹانے اور اہلیت کی پالیسی کی بنیاد پر قائم ہوں گے۔

دفعہ نمبر 98: ہر اس شہری کو، جس کے اندر اہلیت ہو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا غیر مسلم، مفادِ عامہ کے کسی شعبے یا کسی ادارے کا سربراہ مقرر کیا جا سکتا ہے اور وہ اس ادارے میں ملازم ہو سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 99: ہر مصلحہ (محکمے) کا ایک منتظم اعلیٰ ہوگا اور ہر شعبے اور ادارے کا ایک سربراہ (ڈائریکٹر) ہوگا جو اس شعبے یا ادارے کے معاملات کو چلائے گا اور وہ اس پر براہِ راست ذمہ دار ہوگا۔ یہ ڈائریکٹرز اپنے کام کے متعلق، منتظمِ اعلیٰ کو جواب دہ ہوں گے جو کہ مختلف شعبوں، اداروں اور انتظامیہ پر ذمہ دار ہوتے ہیں جبکہ قوانین اور عمومی ضابطوں کے متعلق وہ ڈائریکٹرز والی اور عامل کو جواب دہ ہوں گے۔

دفعہ نمبر 100: مفادِ عامہ کے محکموں، شعبوں اور اداروں کے سربراہ صرف کسی انتظامی سبب کی بنا پر ہی معزول کیے جا سکیں گے۔ البتہ انہیں ایک کام سے فارغ کر کے دوسرے کام پر لگانا جائز ہے۔ انہیں کسی کام سے روکنا بھی جائز ہے۔ ان کا تقرر، ان کی تبدیلی، انہیں کام سے روکنا، ان کی باز پرس کرنا اور انہیں سبکدوش کرنا ان کے ادارے یا ان کے محکمے کے اعلیٰ انتظامی سربراہ (منتظمِ اعلیٰ) کا کام ہے۔

دفعہ نمبر 101: سربراہوں کے سوا جو ملازمین ہیں، ان کا تقرر، ان کی تبدیلی، انہیں کام سے روکنا، ان کی اصلاح اور انہیں ہٹانے کی ذمہ داری ان کے محکموں، شعبوں یا اداروں کے منتظمِ اعلیٰ کے سر ہے۔

بیت المال

دفعہ نمبر 102: بیت المال کا شعبہ حاصل ہونے والے اموال اوران کے تصرف کا انتظام احکامِ شریعت کے مطابق کرے گا، یعنی ان کا جمع کرنا، ان کی حفاظت اور انہیں خرچ کرنا۔ شعبۂ بیت المال کا سربراہ ''خازن بیت المال'' کہلاتا ہے۔ ہر ولایہ میں بیت المال کی شاخیں ہوں گی اور ہر شاخ کا سربراہ ''صاحبِ بیت المال'' کہلائے گا۔

میڈیا

دفعہ نمبر 103: میڈیا وہ شعبہ ہے جو ریاست کی میڈیا پالیسی وضع کرتا ہے اور اسے نافذ کرتا ہے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو پورا کیا جائے۔ داخلی طور پر یہ ایک قوی اور متحد اسلامی معاشرے کی تشکیل کرتا ہے، جو خباثت کو نکال باہر کرے اور طیب چیزوں کو فروغ دے۔ اور خارجی طور پر یہ اسلام کو امن اور جنگ کے دوران اس انداز میں پیش کرتا ہے، جو اسلام کی عظمت، اس کے عدل اور اس کی فوجی قوت کو ظاہر کرے، اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کے فساد اور ظلم کو بیان کرے اور ان کی افواج کی کمزوری کو آشکار کرے۔

دفعہ نمبر 104: وہ لوگ جن کے پاس ریاست کی شہریت موجود ہے، انہیں اپنا میڈیا کھولنے کی اجازت ہے۔ اس بات کے لیے انہیں ریاست کی اجازت کی ضرورت نہیں، بلکہ ''علم وخبر'' (یعنی میڈیا کے شعبہ کو اطلاع دے دینا) ہی کافی ہے کہ وہ کس نوعیت کا میڈیا کھولنا چاہ رہا ہے۔ اس میڈیا کا مالک اور ایڈیٹرز اس پر نشر ہونے والی ہر میڈیا خبر کے ذمہ دار ہوں گے۔ اور ریاست کے کسی بھی شہری کی مانند، میڈیا پر نشر یا شائع ہونے والی کسی چیز کے شریعت کے خلاف ہونے پر انکا بھی محاسبہ کیا جائے گا۔

مجلسِ امت

دفعہ نمبر 105: وہ افراد، جو رائے کے لحاظ سے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جن کی طرف خلیفہ رجوع کرتا ہے، انہیں مجلسِ امت کہا جاتا ہے۔ حکمرانوں کے مظالم کی شکایت یا اسلامی احکامات کو غلط طریقے سے نافذ کرنے پر شکایت کی غرض سے غیر مسلم بھی مجلسِ امت کا رکن بن سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر 106: ہر ولایہ میں رہنے والے لوگ اپنی مجلسِ ولایہ کے اراکین کا چناؤ براہِ راست انتخاب کے ذریعے کریں گے۔ ولایات کی مجالس کے ممبران کی تعداد ولایہ میں رہنے والے لوگوں کی تعداد کی بنا پر ہوگی۔ مجلسِ اُمت کے ممبران کا چناؤ ان مجالسِ ولایات سے براہِ راست کیا جائے گا۔ مجلسِ امت کے ابتدا اور انتہاء کی مدت وہی ہوگی جو کہ ولایات کی مجالس کی ہوگی۔

دفعہ نمبر 107: ہر عاقل و بالغ شخص، جو ریاست کا شہری ہو، کو مجلسِ امت کا رکن بننے کا حق حاصل ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا کافر، البتہ غیر مسلم رکن کا مشورہ حکام کے مظالم یا ان پر اسلامی احکامات کی غلط طریقے سے تنفیذ کی شکایت تک محدود ہوگا۔

دفعہ نمبر 108: شوریٰ اور مَشورہ کا مطلب مطلق انداز میں رائے لینا ہے اور جب عملی معاملات کے متعلق رائے لی جائے تو اس پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔ جبکہ قانون کو مرتب کرنا، قوانین کی تعریف، فکری امور جیسے حقائق سے پردہ اٹھانا اور فنی اور سائنسی امور کے متعلق مشورے پر عمل کرنا خلیفہ کے لیے لازم نہیں۔

دفعہ نمبر 109: شوریٰ صرف مسلمانوں کا حق ہے۔ اس میں غیر مسلموں کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اظہارِ رائے کا حق رعایا کے تمام افراد کو حاصل ہے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔

دفعہ نمبر 110: وہ مسائل جو عملی معاملات کے تحت آتے ہوں اور ان کے متعلق مشورہ لیا جائے

تو پھرایسی صورت میں اکثریت کی رائے کواختیار کیا جائے گا،قطع نظراس کے کہ وہ درست ہے یا غلط۔ وہ معاملات جن کاتعلق قوانین مرتب کرنے ،فکری امور،فنی امور یاتعریفات سے ہوان میں دیکھا جائے گا کہ درست کیا ہے۔ اوراس بات کونظرانداز کردیا جائے گا کہ یہ اکثریت کی رائے ہے یااقلیت کی۔

دفعہ نمبر 111: مجلسِ امت کو پانچ اختیارات حاصل ہوں گے:

1) (ا) خلیفہ مجلسِ امت سے مشورہ کرے گا اور مجلسِ امت خلیفہ کو عملی اقدام اوران عملی معاملات اورامور میں مشورہ دے گی ،جن کا تعلق لوگوں کے امور کی دیکھ بھال سے متعلق اندرونی پالیسی سے ہواور جس میں گہری نظراور جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ حکومت کو چلانا،تعلیم،صحت،تجارت،صنعت،زراعت وغیرہ۔ ایسی صورت میں خلیفہ کے لیے مجلس کی رائے پرعمل کرنالازم ہوگا۔

(ب) وہ معاملات جن کا تعلق فکری امور سے ہے،جن کے لیے گہری نظراور جانچ پڑتال کی ضرورت ہوتی ہے،اوروہ معاملات جوتجربہ اورعلم کےمحتاج ہیں،نیز سائنسی اورٹیکنیکل امور،مالیاتی امور،افواج اورخارجہ پالیسی سے متعلق امور،ان تمام معاملات میں خلیفہ مشورے کے لیے مجلسِ اُمت کی طرف رجوع کرے گااوران معاملات میں مجلس کی رائے پرعمل کرنا خلیفہ پرلازم نہیں۔

2) خلیفہ دستوراورقوانین کے لیے جن احکامات کی تبنی کاارادہ کرےتو اسے چاہیے کہ ان احکامات کومجلسِ امت کے سامنے رکھے۔ مجلسِ امت کے مسلم اراکین کوان کے بارے میں بحث ومباحثے کا حق حاصل ہے،اور یہ کہ وہ ان احکامات کے درست اور غلط پہلوؤں کو بیان کریں۔ اوراگروہ خلیفہ کے ساتھ اس امر میں اختلاف کریں کہ خلیفہ کا طریقۂ تبنی،احکامِ شریعت کی تبنی سے متعلق ریاست کے طریقہ کے مخالف ہے،تو یہ معاملہ **محکمة المظالم** کے سامنے پیش ہوگااوراس میں **محکمة المظالم** کی رائے لازم ہوگی۔

3) مجلسِ امت کوتمام معاملات میں ریاست کے محاسبہ کاحق حاصل ہے۔ خواہ ان

کا تعلق خارجہ امور سے ہو یا یہ داخلی امور ہوں یا یہ مالیات، فوج یا دیگر امور سے متعلق ہوں۔ اس سلسلے میں مجلس کی رائے کو اختیار کرنا لازمی ہوگا، اگر ان معاملات کا تعلق ایسے امور سے ہو جس میں اکثریت کی رائے کو اختیار کرنا لازم ہوتا ہے۔ اور اگر اس معاملے کا تعلق ان امور سے ہو جس میں اکثریت کی رائے پر عمل کرنا لازم نہیں ہوتا، تو مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازمی نہ ہوگا۔

اور اگر مجلس خلیفہ کے ساتھ کسی ایسے عمل پر شرعی نقطہ نظر کے لحاظ سے اختلاف کرے، جو کہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، تو پھر اس صورت میں **محکمة المظالم** کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور **محکمة المظالم** اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ یہ فیصلہ شرعی تھا یا نہیں اور **محکمة المظالم** کی رائے پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

4: مجلسِ امت والیوں اور معاونین اور عمال کے بارے میں ناپسندیدگی (عدمِ اعتماد) کا اظہار کرسکتی ہے۔ اس معاملے میں اس کی رائے پر عمل کرنا ضروری ہوگا اور خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ فوراً انہیں معزول کردے۔ اور اگر اس معاملے میں مجلسِ امت کی رائے اُس ولایہ کی مجلسِ ولایہ کی رائے کے خلاف ہو تو اس صورت میں مجلسِ ولایہ کی رائے مقدم ہوگی۔

5: مجلسِ امت کے مسلمان اراکین کو خلافت کے امیدواروں کی کانٹ چھانٹ کرنے کا حق حاصل ہے، جن کے متعلق **محکمة المظالم** نے فیصلہ دے دیا ہو کہ وہ شروطِ انعقاد پر پورا اترتے ہیں۔ اس معاملے میں مجلس کی رائے پر عمل کرنا لازم ہے اور مجلس کے کانٹ چھانٹ کردہ امیدواروں کے سوا کسی کا انتخاب درست نہ ہوگا۔

معاشرتی نظام

دفعہ نمبر 112: بنیادی طور پر عورت ماں ہے اور گھر کی ذمہ دار ہے۔ وہ ایک ایسی آبرو (عصمت) ہے، جس کی حفاظت فرض ہے۔

دفعہ نمبر 113: بنیادی اصول یہ ہے کہ مرد اور عورت الگ الگ ہوں اور وہ کسی ایسی ضرورت کے سوا اکٹھے نہیں ہو سکتے ہیں جس کی شریعت نے اجازت دی ہو اور جس (شرعی ضرورت) کے لیے اجتماع ناگزیر ہو، مثلاً تجارت کے لیے یا حج کے لیے۔

دفعہ نمبر 114: عورت کے بھی وہی حقوق ہیں جو مرد کے ہیں اور عورت پر بھی وہی فرائض ہیں جو مرد پر ہیں، ماسوائے جو اسلام نے اس کے ساتھ خاص کیے ہیں۔ اسی طرح مرد کے بھی کچھ خاص فرائض ہیں جو شرعی دلائل سے ثابت ہیں۔ چنانچہ عورت کو تجارت، زراعت اور صنعت کا حق حاصل ہے۔ وہ عقود اور معاملات کی نگرانی کر سکتی ہے۔ اسے ہر قسم کی ملکیت کا بھی حق حاصل ہے۔ وہ اپنے اموال کو خود یا کسی کے ذریعے ترقی دے سکتی ہے۔ زندگی کے تمام معاملات (مسائل) کو خود براہِ راست نپٹا سکتی ہے۔

دفعہ نمبر 115: سرکاری ملازمتوں پر عورت کا تقرر جائز ہے۔ **محکمة المظالم** کو چھوڑ کر عدلیہ کی باقی ذمہ داریاں سنبھالنا بھی اس کے لیے جائز ہے۔ عورت مجلسِ اُمت کے لیے اراکین منتخب کر سکتی ہے اور خود بھی اس کی رکن بن سکتی ہے۔ اسی طرح خلیفہ کے انتخاب اور اس کی بیعت میں بھی شریک ہو سکتی ہے۔

دفعہ نمبر 116: عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ چنانچہ وہ خلیفہ، **محکمة المظالم** کا قاضی، والی، عامل اور کوئی ایسا عہدہ قبول نہیں کر سکتی، جس پر حکمرانی کا اطلاق ہوتا ہو۔ اسی طرح عورت کے لیے قاضی القضاۃ بننا، **محکمة المظالم** کا قاضی بننا یا امیرِ جہاد بننا جائز نہیں۔

دفعہ نمبر 117: عورت کی زندگی دو دائروں میں ہے: پبلک لائف اور پرائیویٹ لائف۔ چنانچہ پبلک لائف میں وہ عورتوں، محرم اور غیر محرم مردوں کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس صورت میں اس کا چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا دوسرا کوئی عضو ظاہر نہ ہو، نہ اظہارِ زینت ہو اور نہ بے پردگی ہو۔ جبکہ پرائیویٹ لائف میں عورت کے لیے صرف عورتوں اور اپنے

محارم کے ساتھ زندگی گزارنا جائز ہے۔ اس صورت میں اجنبی مردوں کے ساتھ رہنا جائز نہیں۔ زندگی گزارنے کی ان دونوں صورتوں میں وہ احکامِ شریعت کی پابند ہے۔

دفعہ نمبر 118: عورت کے لیے غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں موجود ہونا ممنوع ہے۔ اسی طرح غیروں کے سامنے اظہارِ زینت اور اپنے ستر کو کھولنا بھی ممنوع ہے۔

دفعہ نمبر 119: مرد اور عورت دونوں کو ہر اس کام سے روکا جائے گا جو اخلاق کے لیے خطرناک ہو اور معاشرے کے فساد کا سبب ہو۔

دفعہ نمبر 120: ازدواجی زندگی اطمینان کی زندگی ہونی چاہیے اور زوجین کے درمیان رفاقت ہونی چاہیے۔ شوہر کے عورت پر قوام ہونے کا مطلب عورت کی دیکھ بھال ہے، نہ کہ عورت پر حکمرانی کرنا۔ بیوی پر شوہر کی اطاعت فرض ہے۔ مرد پر بیوی کے لیے مثل معروف نان ونفقہ کا بندوبست کرنا بھی فرض ہے۔

دفعہ نمبر 121: گھر کے کاموں میں میاں بیوی کو مکمل تعاون کرنا چاہیے۔ گھر سے باہر کے تمام کام خاوند کے ذمہ ہیں۔ گھر کے تمام اندرونی کام حسبِ استطاعت عورت کے اوپر ہیں۔ جن کاموں کو کرنے پر بیوی قادر نہ ہو تو ان کے لیے خادم مہیا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔

دفعہ نمبر 122: چھوٹے بچوں کی پرورش عورت کا فرض بھی ہے اور اس کا حق بھی، خواہ عورت مسلم ہو یا غیر مسلم۔ جب تک بچے کی پرورش کی ضرورت ہے، یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ جب بچے کو اس کی ضرورت نہ رہے تو دیکھا جائے گا کہ دودھ پلانے والی اور ولی دونوں مسلمان ہیں یا نہیں۔ اگر دونوں مسلمان ہوں تو چھوٹے بچے کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جس کے ساتھ رہنا چاہے، رہ سکتا ہے۔ چھوٹا بچہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر دودھ پلانے والی اور ولی میں سے کوئی ایک غیر مسلم ہو تو بچے کو اختیار نہیں ہوگا، بلکہ اُسے مسلمان کے حوالے کیا

جائے گا۔

اقتصادی نظام

دفعہ نمبر 123: اقتصادی پالیسی یہ ہے کہ ضروریات کو پورا کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ کن اشیاء پر معاشرے کا دارومدار ہے۔ چنانچہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس چیز کو بنیاد بنایا جائے گا جس پر معاشرے کا دارومدار ہے۔

دفعہ نمبر 124: (اصل) اقتصادی مسئلہ اموال اور منافع کو ریاست کے تمام افراد پر تقسیم کرنا اور عوام کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ کوشش کر کے ان اموال سے فائدہ اٹھا سکیں۔

دفعہ نمبر 125: تمام افراد کو فرداً فرداً تمام بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی ضمانت دینا لازمی ہے۔ اسی طرح اس بات کی بھی ضمانت دی جائے گی کہ ہر فرد ان ضروریات کو حاصل کر سکے جن کے ذریعے وہ اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنا سکے۔

دفعہ نمبر 126: مال صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اسی نے بنی نوع انسان کو مال میں اپنا جانشین بنایا ہے اور اسی عام جانشینی کی وجہ سے انسان کو ملکیت کا حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے فرد کو اس مال پر ملکیت کا اختیار (اجازت) دیا۔ چنانچہ اس اجازت کی وجہ سے انسان بالفعل مال کا مالک بن گیا۔

دفعہ نمبر 127: ملکیت کی تین اقسام ہیں۔ انفرادی ملکیت، عوامی ملکیت، ریاستی ملکیت۔

دفعہ نمبر 128: انفرادی ملکیت ایک شرعی حکم ہے۔ اس کا تعلق عین (اصل) یا منفعت سے ہے۔ اس ملکیت کا تقاضا ہے کہ صاحبِ مال کو مال سے یا مال کے عوض، فائدہ اٹھانے کا اختیار حاصل ہو۔

دفعہ نمبر 129: عوامی ملکیت سے مراد یہ ہے کہ معاشرے کو مشترکہ طور پر عین (اصل) سے فائدہ اٹھانے کی شرعی اجازت ہے۔

دفعہ نمبر 130: ہر وہ مال، جسے خرچ کرنا خلیفہ اور اس کے اجتہاد پر موقوف ہے، وہ ریاست کی ملکیت ہے، مثلاً ٹیکس، خراج اور جزیہ سے حاصل ہونے والے اموال۔

دفعہ نمبر 131: انفرادی ملکیت، خواہ وہ اموالِ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، وہ ان پانچ شرعی اسباب سے حاصل کی جاسکتی ہے:

(1) عمل (کام)

(2) میراث

(3) جان بچانے کے لیے مال حاصل کرنا

(4) ریاست کی جانب سے اپنے اموال میں سے رعایا کو دینا

(5) وہ اموال، جنہیں افراد کسی مال کے بدلے یا جدوجہد کے بغیر حاصل کریں

دفعہ نمبر 132: ملکیت میں تصرف شارع کی اجازت پر موقوف ہے۔ خواہ یہ تصرف مال کو خرچ کرنے سے متعلق ہو یا ملکیت میں اضافہ کرنے کے حوالے سے ہو۔ چنانچہ اسراف، نمود و نمائش، کنجوسی، سرمایہ دارانہ کمپنیاں، کوآپریٹو سوسائٹیز اور تمام خلافِ شرع معاملات ممنوع ہیں۔ اسی طرح سود، غبنِ فاحش، ٹھگی، ذخیرہ اندوزی اور جواء اور اس جیسے دیگر چیزیں سبھی ملکیت کے تصرف کے لیے ممنوع ہیں۔

دفعہ نمبر 133: عشری زمین وہ ہے جہاں کے رہنے والے (مالک) اس زمین پر رہتے ہوئے ایمان لائیں، مثلاً جزیرہ عرب کی سرزمین۔ خراجی زمین، عرب کو چھوڑ کر ہر وہ زمین ہے، جو جنگ یا صلح کے ذریعے فتح کی گئی ہو۔ عشری زمین اور اس سے حاصل ہونے والی منفعت دونوں

افراد کی ملکیت ہوتے ہیں۔ خراجی زمین ریاست کی ملکیت ہوتی ہے اور اس کا فائدہ افراد کی ملکیت ہوتا ہے۔ شرعی عقود کے تحت ہر فرد کو عشری زمین اور خراجی زمین کی منفعت تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسرے اموال کی طرح یہ زمین بطورِ میراث بھی منتقل ہوگی۔

دفعہ نمبر 134: بنجر زمین کی آبادکاری اور اس کی حد بندی کے ذریعے اس کا مالک بنا جاسکتا ہے۔ غیر بنجر زمین کی ملکیت صرف شرعی سبب یعنی میراث، خریداری اور کسی کی طرف سے ہبہ کرنے سے ہوگی۔

دفعہ نمبر 135: زمین خواہ خراجی ہو یا عشری، اسے کرائے پر دینا ممنوع ہے۔ جس طرح کہ مزارعت (زمین کو ٹھیکے پر دینا) ممنوع ہے۔ البتہ مساقات مطلقاً جائز ہے۔

دفعہ نمبر 136: ہر مالکِ زمین کو زمین سے فائدہ اٹھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ زمین سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے کسی قسم کی امداد کی ضرورت ہو تو بیت المال سے ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کی جائے گی۔ ہر وہ شخص، جو زمین سے تین سال تک کوئی فائدہ اٹھائے بغیر اسے بیکار چھوڑے رکھے، تو یہ زمین اس سے لے کر کسی اور کو دے دی جائے گی۔

دفعہ نمبر 137: تین طرح کی اشیاء عوامی ملکیت میں شامل ہیں:

(1) ہر وہ چیز جو جماعت کی ضرورت ہو، مثلاً شہر کے میدان۔

(2) ختم نہ ہونے والی معدنیات جیسے تیل کے کنوئیں۔

(3) وہ اشیاء جو طبعی طور پر افراد کے ساتھ مخصوص نہیں ہوسکتیں، مثلاً نہریں۔

دفعہ نمبر 138: کارخانہ بحیثیتِ کارخانہ انفرادی ملکیت ہوتا ہے۔ تاہم کارخانے کا وہی حکم ہے جو اس کی پیداوار کا ہے۔ چنانچہ کارخانے میں پیدا ہونے والی چیز انفرادی املاک میں سے ہو تو کارخانہ بھی انفرادی ملکیت میں ہوگا، مثلاً کپڑے کا کارخانہ۔ اگر کارخانے کی پیداوار ایسی شے ہو

جو عوامی ملکیت کے زمرے میں آتی ہو تو کارخانہ بھی عوامی ملکیت ہو گا، جیسا کہ لوہے کا کارخانہ۔

دفعہ نمبر 139: ریاست کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ انفرادی ملکیت کی کسی چیز کو عوامی ملکیت میں دے دے۔ کیونکہ عوامی ملکیت ہونا مال کی نوعیت پر منحصر ہے اور یہ مال کی صفت ہے، نہ کہ ریاست کی رائے۔

دفعہ نمبر 140: امت کے ہر فرد کو عوامی ملکیت میں داخل ہر چیز سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ ریاست کے لیے کسی خاص فرد کو عوامی ملکیت کے املاک کا مالک بنانا یا صرف اُس شخص کو اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دینا جائز نہیں۔

دفعہ نمبر 141: ریاست کے لیے رعایا کے مفادات کے لیے بنجر زمین یا عوامی ملکیت میں داخل کسی چیز کو (لوگوں کے لیے) ممنوع قرار دینا جائز ہے۔

دفعہ نمبر 142: مال کو جمع کر کے خزانہ بنانا ممنوع ہے، اگر چہ اس پر زکوٰۃ بھی کیوں نہ دی جائے۔

دفعہ نمبر 143: مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جائے گی۔ زکوٰۃ صرف اُن اموال پر لی جائے گی جن پر زکوٰۃ لینے کو شریعت نے متعین کر دیا ہے، مثلاً نقدی، تجارتی ساز و سامان، مویشی اور غلہ۔ جن اموال پر زکوٰۃ لینے کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو، اُن پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔ زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب سے لی جائے گی، خواہ وہ مکلّف ہو جیسا کہ عاقل بالغ انسان یا وہ غیر مکلّف ہو، جیسا کہ بچہ اور مجنون۔ پھر اس زکوٰۃ کو بیت المال کی ایک خاص مد میں رکھا جائے گا۔ زکوٰۃ کو قرآن کریم میں وارد آٹھ اصناف میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد اصناف کے علاوہ کہیں اور خرچ نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 144: ذمیوں سے جزیہ لیا جائے گا اور جزیہ ذمیوں کے بالغ مردوں سے ان کی

استطاعت کے مطابق لیا جائے گا۔ عورتوں اور بچوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 145: خراجی زمین پر خراج استطاعت کے مطابق لیا جائے گا اور عشری زمین کی پیداوار پر زکوۃ لی جائے گی۔

دفعہ نمبر 146: مسلمانوں سے وہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جس کی شرع نے اجازت دی ہو اور جتنا بیت المال کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہو۔ شرط اس میں یہ ہے کہ یہ ٹیکس اس رقم پر وصول کیا جاتا ہے جو صاحبِ مال کے پاس معروف طریقہ کے مطابق اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد زائد ہو اور یہ ٹیکس ریاست کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی کافی ہو۔

دفعہ نمبر 147: وہ تمام اعمال، جن کی انجام دہی کو شریعت نے امت پر فرض قرار دیا ہے، اگر بیت المال میں ان اعمال (ذمہ داریوں) کو انجام دینے کے لیے مال نہ ہو تو یہ فرض امت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ریاست کو اس امر کا حق حاصل ہے کہ وہ اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت پر ٹیکس لازم کردے۔ لیکن جن امور کی ادائیگی کو شریعت نے امت پر فرض قرار نہیں دیا ہے، ان کے لیے ٹیکس وصول کرنا ریاست کے لیے جائز نہیں۔ چنانچہ ریاست کورٹ فیس یا دفتری فیس یا عدالتی ٹیکس یا اس نوعیت کا کوئی بھی ٹیکس نہیں لے سکتی۔

دفعہ نمبر 148: ریاستی بجٹ کی اصناف دائمی نوعیت کی ہوتی ہیں، جنہیں احکامِ شرعیہ نے مقرر کردیا ہے۔ اس کی مزید ذیلی مدات ہوتی ہیں جن میں سے ہر مد کے لیے رقوم مختص کی جاتی ہیں۔ بجٹ کی مقدار اور جن مدات کے لیے رقوم مختص کی جاتی ہیں، یہ سب خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے۔

دفعہ نمبر 149: بیت المال کی آمدن کے دائمی ذرائع یہ ہیں۔ مالِ فے، جزیہ، خراج، رکاز کا پانچواں حصہ اور زکوۃ۔ ان اموال کو ہمیشہ وصول کیا جائے گا۔ خواہ ان کی ضرورت ہو یا نہ

ہو۔

دفعہ نمبر 150: بیت المال کی دائمی آمدنی ریاست کے اخراجات کے لیے ناکافی ہونے کی صورت میں ریاست مسلمانوں سے ضرائب (ٹیکسز) وصول کرے گی اور یہ ٹیکسز ان مدات کے لیے اکٹھے کیے جائیں گے:

(ا) فقراء، مساکین، مسافر اور فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لیے اور بیت المال کے ذمے فرض اخراجات کو پورا کرنے کے لیے۔

(ب) اُن اخراجات کو پورا کرنے کے لیے، جنہیں پورا کرنا بیت المال کے ذمہ بطورِ بدل واجب ہے، مثلاً ملازمین کے اخراجات، فوجیوں کا راشن اور حکام کے معاوضے۔

(ج) اُن اخراجات کو پورا کرنا، جو بیت المال پر مفادِ عامہ کے لیے بغیر کسی بدل کے واجب ہیں، مثلاً نئی سڑکیں بنانا، زمین سے پانی نکالنا، مساجد، مدارس اور ہسپتال بنوانا۔

(د) اُن نقصانات کا تدارک کرنا، جو بیت المال پر واجب ہیں، مثلاً کوئی ہنگامی حالت، قحط، طوفان اور زلزلے۔

دفعہ نمبر 151: وہ اموال بھی ذرائع آمدن میں شمار ہوتے ہیں جو ریاست کی سرحدوں پر کسٹم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں اور بیت المال میں جمع ہوتے ہیں۔ اس طرح عوامی ملکیت یا ریاستی ملکیت سے حاصل ہونے والے اموال اور وہ اموال جن کا کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بیت المال میں رکھا گیا ہو نیز مرتدین کا مال بھی ذرائع آمدن ہیں۔

دفعہ نمبر 152: بیت المال کے اموال کو ان چھ اصناف میں تقسیم کیا جائے گا:

(1) وہ آٹھ اصناف جو اموالِ زکوٰۃ کے مستحق ہیں، اُن پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جائے گا۔

(2) فقراء، مساکین، مسافر (ابنِ سبیل)، جہاد، مقروض (غارمین) پر خرچ کرنے کے لیے اموالِ زکوٰۃ میں سے کچھ مال موجود نہ ہو تو ان پر بیت المال کی دائمی نوعیت کی آمدنی کے ذرائع سے خرچ کیا جائے گا۔ لیکن اس میں بھی اگر کوئی مال نہ ہو تو قرض داروں (غارمین) پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن فقراء، مساکین، مسافر اور جہاد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ٹیکس لگایا جائے گا اور اگر ٹیکس لگانے میں کسی خرابی کا اندیشہ ہو تو ٹیکس کی بجائے بطورِ قرض اموال حاصل کیے جائیں گے۔

(3) وہ اشخاص جو ریاست کے لیے خدمات سرانجام دے رہے ہیں، جیسے ملازمین، حکام اور فوج، ان پر بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ لیکن جب بیت المال کا مال اس کے لیے کافی نہ ہو تو ٹیکس لگا کر ان کی ضروریات کو پورا کیا جائے گا اور اگر ٹیکس لگانے کی صورت میں کسی قسم کی خرابی کا خوف ہو تو اس مقصد کے لیے قرض لیے جائیں گے۔

(4) بنیادی مصالح (مفادات) اور ضروریات جیسے راستوں، مساجد، ہسپتالوں اور سکولوں پر بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ لیکن جب بیت المال میں اتنا مال نہ ہو تو ٹیکس وصول کر کے ان پر خرچ کیا جائے گا۔

(5) اعلیٰ سہولیات اور ضروریات پر بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ جب بیت المال میں ان پر خرچ کرنے کے لیے مال موجود نہ ہو تو ان پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ انہیں ملتوی کیا جائے گا۔

(6) ہنگامی حالات مثلاً زلزلہ اور طوفان وغیرہ کی صورت میں بیت المال سے خرچ کیا جائے گا۔ بیت المال میں مال نہ ہونے کی صورت میں ان کے لیے فوراً قرض لیا جائے گا۔ پھر ٹیکس جمع کر کے اسے ادا کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 153: ریاست اپنے ہر شہری کے لیے روزگار کی ضمانت دے گی۔

دفعہ نمبر 154: افراد اور کمپنیوں کے ملازمین تمام فرائض اور حقوق کے لحاظ سے ریاست کے ملازمین کی طرح ہیں۔ جو بھی اُجرت پر کام کرتا ہے وہ ملازم ہے، خواہ عمل اور عامل (کام کرنے والے) کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ چنانچہ جب اجیر (ملازم) اور مستاجر (کام کروانے والے) کے درمیان اجرت پر اختلاف ہو جائے تو اجرتِ مثل کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر اس (اجرت) کے علاوہ کسی اور چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ احکامِ شریعت کے مطابق ملازمت کے معاہدے کے تحت ہوگا۔

دفعہ نمبر 155: کام کے فائدے یا ملازم سے حاصل ہونے والے نفع کے لحاظ سے اجرت کو مقرر کرنا جائز ہے۔ ملازم کی معلومات یا اس کی علمی شہادت (اسناد) کے لحاظ سے اس کی اجرت مقرر نہیں کی جائے گی۔ ملازم کی تنخواہ میں کوئی سالانہ اضافہ نہیں ہوگا، بلکہ انہیں ان کے کام کی پوری اجرت دی جائے گی، جس کے وہ مستحق ہیں۔

دفعہ نمبر 156: جس شخص کے پاس مال نہیں یا وہ کام نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا رشتہ دار ہے جس پر اسے نفقہ دینا فرض ہو تو ریاست اسے نفقہ کی ضمانت دے گی۔ اس طرح عاجز و محتاج کو ٹھکانہ دینا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

دفعہ نمبر 157: ریاست ایسی تدابیر اختیار کرتی ہے کہ مال رعایا کے درمیان گردش کرتا رہے اور صرف خاص طبقے کے درمیان ہی گردش میں نہ رہے۔

دفعہ نمبر 158: ریاست رعایا کے ہر فرد کو اس قابل بنانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنے لیے اعلیٰ معیارِ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ ریاست درجِ ذیل طریقے سے معاشرے میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور جس کا انحصار اموال کی دستیابی پر ہے:

(ا) بیت المال میں جو اموال ہوں، خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ اور مالِ فے وغیرہ، ریاست ان میں سے رعایا کو عطا کرے گی۔

(ب) جن لوگوں کے پاس اتنی زمین نہ ہو جس سے ان کا گزارہ ہو سکے تو ریاست انہیں آباد زمین میں سے زمین دے گی۔ البتہ جن لوگوں کے پاس زمین تو ہے لیکن وہ اسے کاشت نہیں کرتے تو انہیں زمین نہیں دی جائے گی۔ جو لوگ زراعت نہیں کر سکتے انہیں مال دیا جائے گا۔

(ج) ایسے قرض دار، جو اپنا قرض چکانے سے عاجز ہوں، ریاست زکوٰۃ کے مال اور مالِ فے وغیرہ سے ان کا قرضہ چکائے گی۔

دفعہ نمبر 159: ریاست زرعی امور اور زرعی پیداوار کی نگرانی اِس زرعی پالیسی کی ضرورت کی بنیاد پر کرے گی کہ زمین سے اس طرح فائدہ اٹھایا جائے کہ زمین کی پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو۔

دفعہ نمبر 160: ریاست صنعت سے متعلق تمام امور کی خود نگرانی کرتی ہے اور عوامی ملکیت میں داخل تمام مصنوعات کی دیکھ بھال بھی براہِ راست خود کرتی ہے۔

دفعہ نمبر 161: بیرونی تجارت کا اعتبار تاجر کے ملک کے لحاظ سے ہوگا نہ کہ ساز و سامان کے لحاظ سے۔ چنانچہ حربی ملک کے تاجر کا ہمارے علاقوں میں تجارت کرنا ممنوع ہے، سوائے یہ کہ کسی خاص تاجر یا خاص مال کی تجارت کی اجازت دی گئی ہو۔ جن مما لک کے ساتھ ہمارے معاہدات ہیں تو ان کے تاجروں کے ساتھ ہمارے اور ان کے درمیان طے پانے والے معاہدے کی رو سے معاملہ کیا جائے گا۔ عوام میں سے جو تاجر ہوں گے انہیں اس چیز کو باہر لے جانے سے روکا جائے گا، جس کی ریاست کو ضرورت ہے یا جس سے دشمن کو فوجی، صنعتی یا اقتصادی قوت حاصل ہوتی ہو۔ البتہ انہیں اپنا مال ریاست میں لانے سے نہیں روکا جائے گا۔ ان احکامات سے وہ ملک مستثنیٰ ہوگا جس کے ساتھ ہم عملاً حالتِ جنگ میں ہیں، جیسا کہ اسرائیل، کیونکہ اس کے ساتھ تمام معاملات، خواہ وہ تجارتی ہوں یا کوئی اور اسے دار الحرب فعلاً سمجھتے ہوئے طے کیے جائیں گے۔

دفعہ نمبر 162: رعایا کے تمام افراد کو زندگی کے مسائل سے متعلق ریسرچ لیبارٹریاں بنانے کا

حق حاصل ہے اور خود ریاست کو بھی چاہیے کہ وہ اس قسم کی تجربہ گاہیں قائم کرے۔

دفعہ نمبر 163: افراد کو ایسی تجربہ گاہوں کی ملکیت سے روکا جائے گا، جو ایسا مواد پیدا کریں جس کا افراد کی ملکیت میں ہونا امت یا ریاست کے لیے ضرر رساں ہو۔

دفعہ نمبر 164: ریاست رعایا کے تمام افراد کو تمام طبی سہولتیں مفت مہیا کرے گی، لیکن وہ ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پریکٹس کرنے اور ادویات فروخت کرنے سے نہیں روکے گی۔

دفعہ نمبر 165: غیر ملکی سرمائے کا استعمال اور غیر ملکی سرمایہ کاری ریاست میں ممنوع ہوگی، اس طرح کسی غیر ملکی کو کوئی امتیازی رعایت نہیں دی جائے گی۔

دفعہ نمبر 166: ریاست اپنی ایک خاص کرنسی جاری کرے گی اور اسے کسی اجنبی کرنسی سے منسلک کرنا جائز نہیں ہوگا۔

دفعہ نمبر 167: ریاست کی کرنسی سونا اور چاندی پر مشتمل ہوگی، خواہ اسے ڈھالا گیا ہو یا نہ ڈھالا گیا ہو۔ سونا اور چاندی کے علاوہ کسی اور چیز کو نقدی کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔ ریاست کے لیے سونا اور چاندی کے بدل کے طور پر کوئی اور چیز جاری کرنا بھی جائز ہوگا۔ بشرطیکہ جو چیز جاری کی جائے اس کے مساوی اتنی مالیت کا سونا یا چاندی ریاست کی ملکیت میں موجود ہو۔ پس ریاست کے لیے جائز ہے کہ وہ پیتل، کانسی یا کاغذی نوٹ وغیرہ پر اپنے نام کا ٹھپہ لگا کر جاری کرے۔ بشرطیکہ اس کے پاس اتنی ہی مالیت کا سونا یا چاندی موجود ہو۔

دفعہ نمبر 168: برابری کے اصول پر جس طرح داخلی طور پر نقدی کا تبادلہ جائز ہے، اسی طرح اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں کی کرنسیوں کے مابین تبادلہ بھی جائز ہوگا۔ اور اگر ان دونوں کرنسیوں کی جنس الگ الگ ہو تو اس صورت میں ان کے مابین کمی بیشی بھی جائز ہوگی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ معاملہ دست بدست ہو، ادھار کی بنیاد پر ایسا کرنا جائز نہیں۔ جب دونوں کرنسیاں

مختلف ہوں تو بغیر کسی قید (شرط) کے کرنسیوں کے شرح تبادلہ میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ عوام کا ہر فرد اندرونی یا بیرونی کرنسیوں کو خریدنا یا بیچنا چاہے تو اسے اجازت ہوگی۔ اس کے لیے کسی کرنسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

تعلیمی پالیسی

دفعہ نمبر 169: تعلیمی پالیسی کا اسلامی عقیدے کی بنیاد پر استوار ہونا فرض ہے۔ چنانچہ تمام تدریسی مواد اور طریقہ ہائے تدریس کو اس طرح وضع کیا جائے گا کہ تعلیم میں اس بنیاد سے انحراف بالکل نہ ہو۔

دفعہ نمبر 170: تعلیمی پالیسی کا مقصد اسلامی عقلیہ اور اسلامی نفسیہ کی تعمیر ہے۔ لہٰذا وہ تمام مواد، جس کی تدریس مقصود ہو، اسی بنیاد پر ہوگا۔

دفعہ نمبر 171: تعلیم کا مقصد اسلامی شخصیت پیدا کرنا اور زندگی کے معاملات سے متعلق علوم و معارف سے لیس کرنا ہے۔ چنانچہ طریقۂ تعلیم کو اس طرح بنایا جائے گا کہ اس سے یہ مقصد حاصل ہو، اور ہر وہ طریقہ ممنوع ہوگا جو اس مقصد سے ہٹاتا ہو۔

دفعہ نمبر 172: علومِ اسلامیہ اور علومِ عربیہ کے ہفتہ وار پیریڈ مقرر کرنا ضروری ہے۔ اس طرح وقت اور تعداد کے اعتبار سے دوسرے علوم کے لیے بھی پیریڈ مقرر کیے جائیں گے۔

دفعہ نمبر 173: تعلیم میں تجرباتی علوم اور ان سے ملحق علوم مثلاً ریاضی اور ثقافتی علوم کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ تجرباتی علوم اور اس سے ملحقہ علوم بقدرِ ضرورت پڑھائے جائیں گے۔ مراحلِ تعلیم میں کسی بھی مرحلہ میں ان کی پابندی لازمی نہیں ہونی چاہیے۔ جہاں تک ثقافتی معارف کا تعلق ہے تو انہیں اعلیٰ تعلیم سے متعین تعلیمی پالیسی کے مطابق ابتدائی

مراحل میں اس طرح پڑھایا جائے گا کہ یہ اسلامی افکار واحکامات سے متناقض نہ ہوں۔ اعلیٰ تعلیمی مرحلہ کو فقط سائنس کے طور پر پڑھا جائے گا۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ یہ تعلیمی پالیسی اور تعلیمی مقصد سے ہٹ کر بالکل نہ ہو۔

دفعہ نمبر 174: تعلیم کے ہر مرحلہ میں اسلامی ثقافت کی تعلیم لازمی ہے۔ اعلیٰ مرحلہ میں مختلف اسلامی معارف کی فروعات مخصوص کی جائیں گی، جیسا کہ طب، انجینئرنگ، طبیعات وغیرہ کی تفصیلات مخصوص کی جاتی ہیں۔

دفعہ نمبر 175: فنون اور صنعت کا ایک پہلو سائنسی ہے، جیسا کہ تجارتی فنون، جہاز رانی، زراعت وغیرہ۔ اس پہلو سے انہیں بغیر کسی قید وشرط کے حاصل کیا جائے گا اور ان کا ایک ثقافتی پہلو بھی ہے، جب یہ کسی خاص نقطۂ نظر سے متاثر ہوں جیسا کہ تصویر، سنگ تراشی وغیرہ۔ چنانچہ اگر یہ فنون اسلامی نقطۂ نظر کے مخالف ہوں تو انہیں حاصل نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 176: منہج تعلیم ایک ہی ہوگا اور ریاست کے منہجِ تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے منہج کی اجازت نہیں ہوگی۔ پرائیویٹ سکولوں کی اس وقت تک اجازت ہوگی جب تک کہ وہ ریاست کے تعلیمی منہج، اس کی تعلیمی پالیسی اور اس کے مقصد کی بنیاد پر قائم ہوں گے۔ یہ بھی شرط ہوگی کہ ان میں مخلوط تعلیم (لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ساتھ پڑھنا) کی ممانعت ہوگی۔ مرد وزن کا اختلاط، معلمین اور طلبا دونوں کے درمیان ممنوع ہوگا۔ مزید برآں یہ شرط بھی ہوگی کہ تعلیم کسی خاص گروہ، دین یا مذہب یا رنگ ونسل کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔

دفعہ نمبر 177: وہ تعلیم جو زندگی کے میدان میں ہر انسان مرد یا عورت کے لیے ضروری ہے، فرض ہوگی۔ چنانچہ پہلے دو مرحلوں میں تعلیم لازمی ہوگی اور یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ مفت تعلیم کا بندوبست کرے۔ اعلیٰ تعلیم بھی ممکن حد تک مفت دینے کی کوشش کی جائے گی۔

دفعہ نمبر 178: ریاست سکولوں اور جامعات کے علاوہ بھی لائبریریاں، تجربہ گاہیں اور معارف کے تمام وسائل مہیا کرے گی، تاکہ وہ لوگ، جومختلف مباحث اور معارف، مثلاً فقہ، اصولِ فقہ، حدیث وتفسیر، طب، انجینئرنگ، کیمیا وغیرہ میں، اسی طرح ایجادات اور دریافتوں میں اپنی بحث و تحقیق کو جاری رکھنا چاہیں تو وہ اسے جاری رکھ سکیں۔ یوں امت کے پاس مجتہدین، موجدین اور اہل ندرت افراد کی ایک کثیر تعداد موجود ہوگی۔

دفعہ نمبر 179: تعلیم کے تمام مراحل میں تالیف سے غلط فائدہ اٹھانا ممنوع ہوگا، کوئی بھی شخص خواہ وہ مؤلف ہو یا کوئی اور، جب کوئی کتاب مطبع کرے گا اور اس کو شائع کرے گا تو پھر نشر واشاعت کے جملہ حقوق محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ البتہ اگر اس کے پاس ایسے افکار ہوں جن کی اب تک نشر واشاعت نہیں ہوئی تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کو یہ افکار دے کر اس کی اجرت لے، جیسا کہ وہ کسی شخص کو تعلیم دے کر اجرت لیتا ہے۔

خارجہ سیاست

دفعہ نمبر 180: سیاست امت کے اندرونی اور بیرونی معاملات کی دیکھ بھال کو کہتے ہیں۔ سیاست اُمت اور ریاست دونوں کی جانب سے ہوتی ہے۔ ریاست براہِ راست معاملات کی نگرانی کرتی ہے اور امت اس (کام) پر ریاست کا محاسبہ کرتی ہے۔

دفعہ نمبر 181: کسی فرد، حزب، گروہ یا جماعت کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس کے کسی اجنبی ملک کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات ہوں۔ دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات صرف ریاست کا کام ہے۔ کیونکہ صرف ریاست کو امت کے امور کی سرپرستی کا حق حاصل ہے۔ امت اور جماعتیں ان خارجی تعلقات کے بارے میں ریاست کا محاسبہ کرسکتی ہیں۔

دفعہ نمبر 182: کسی مقصد کا نیک ہونا اس کے ذریعے (وسیلے) کو نیک (جائز) نہیں

بناتا(اَلْغَایَۃُ لَا تبَرِرُ الْوَاسِطَۃَ) کیونکہ طریقہ،فکر کے ساتھ مربوط ہے۔ چنانچہ فرض یامباح تک پہنچنے کے لیے حرام کو ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ پس وسیلے کی پالیسی طریقے کی پالیسی سے کبھی بھی متناقض نہیں ہونی چاہیے۔

دفعہ نمبر 183: سیاسی چال چلنا خارجی سیاست میں ایک ضروری امر ہے، اس کی قوت کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اعمال (کاموں) کا اعلان کیا جائے اور اہداف (مقاصد) کو خفیہ رکھا جائے۔

دفعہ نمبر 184: سیاست کے اہم ترین اسالیب یہ ہیں: ریاستوں کے جرائم کو بے نقاب کرنے کی جرأت، جھوٹی پالیسیوں کے خطرات کو بیان کرنا، خبیث سازشوں کو بے نقاب کرنا اور گمراہ کن شخصیتوں کی حوصلہ شکنی کرنا۔

دفعہ نمبر 185: افراد، امتوں اور ریاستوں کے معاملات کی نگہداشت کے دوران اسلامی افکار کی عظمت کو ظاہر کرنا، خارجہ سیاست کا اعلیٰ طریقہ ہے۔

دفعہ نمبر 186: امت کا سیاسی قضیہ (موت وحیات کا مسئلہ) یہ ہے کہ اسلام اس امت کی ریاست کی قوت ہے، اور یہ کہ اسلامی احکامات کا بہترین طریقے سے نفاذ کیا جائے اور دنیا کے سامنے اسلامی دعوت کو پیہم طریقے سے پہنچایا جائے۔

دفعہ نمبر 187: اسلامی دعوت کو پیش کرنا ہی خارجی سیاست کے لیے محور ومدار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی بنیاد پر اسلامی ریاست کے تمام دوسری ریاستوں سے تعلقات قائم ہوں گے۔

دفعہ نمبر 188: اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات ان چار پہلوؤں پر مشتمل ہوں گے:

(1) عالمِ اسلام میں قائم تمام مملکتیں گویا ایک علاقے (ملک) میں قائم ہیں۔ یہ خارجی تعلقات کے ضمن میں داخل نہیں ہوں گی اور ان کے ساتھ تعلقات کو خارجہ سیاست نہیں سمجھا

جائے گا، بلکہ ان سب کو ایک ریاست کی صورت میں اکٹھا کرنے کے لیے کام کرنا فرض ہے۔

(2) وہ ریاستیں جن کے ساتھ ہمارے اقتصادی، تجارتی، ثقافتی یا اچھی ہمسائیگی کے معاہدات ہیں تو ان کے ساتھ معاملات کو معاہدات کے مطابق نپٹایا جائے گا۔ اگر معاہدہ اجازت دیتا ہو تو اس ریاست کے لوگ شناخت کے ساتھ، بغیر پاسپورٹ کے اسلامی ریاست میں داخل ہوسکیں گے۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ یہ معاملہ کریں گے۔ اس کے ساتھ اقتصادی اور تجارتی تعلقات محدود مدت اور مخصوص اشیاء کی بنیاد پر ہوں گے اور بشرطیکہ اس ریاست کی اشیاء کی اسلامی ریاست کو ضرورت ہو اور یہ کہ انہیں فروخت کی جانے والی اشیاء اُس ریاست کو مضبوط بنانے کا سبب نہ بنیں۔

(3) وہ ممالک، جن کے اور ہمارے درمیان کسی قسم کے معاہدات نہیں ہیں۔ اسی طرح استعماری ممالک، مثلاً برطانیہ، امریکہ، فرانس اور وہ ممالک، جو مسلمان ممالک پر اپنی نظریں جمائے بیٹھے ہیں، جیسا کہ روس، تو ان کے ساتھ حالتِ جنگ کا معاملہ کیا جائے گا۔ ان کے بارے میں مکمل احتیاط برتی جائے گی۔ ان کے ساتھ کسی قسم کے سفارتی تعلقات قائم کرنا درست نہیں۔ ان ممالک کے عوام ہماری ریاست میں اس وقت داخل ہوسکیں گے اگر ان کے پاس پاسپورٹ ہو، اور ہر فرد کو ہر سفر کے لیے مخصوص اجازت دی گئی ہو۔

(4) جو ممالک ہمارے ساتھ عملاً حالتِ جنگ میں ہیں جیسا کہ اسرائیل تو اس کے ساتھ تمام معاملات کو حالتِ جنگ کی بنیاد پر نپٹایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہمارا معاملہ عملی جنگ کا ہوگا، خواہ اس کے ساتھ عارضی جنگ بندی کا معاہدہ ہو یا نہ ہو، اور اس کے شہری ہمارے ملک میں داخل نہیں ہوسکتے۔

دفعہ نمبر 189: فوجی معاہدات اور اس نوعیت کے دیگر معاہدات یا اس سے منسلک دیگر معاہدات مثلاً سیاسی معاہدات، اڈے اور ائرپورٹ وغیرہ کرایہ پر دینے کے معاہدات، سب ممنوع

ہوں گے۔ البتہ اچھی ہمسائیگی، اقتصادی، تجارتی، مالیاتی، ثقافتی معاہدات یا عارضی جنگ بندی کے معاہدات کیے جا سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر 190: ریاست کے لیے ان تمام تنظیموں میں شرکت جائز نہیں ہوگی، جن کی بنیاد اسلامی نہیں یا جو اسلامی احکامات کو چھوڑ کر غیر اسلامی احکامات کی تطبیق کی بنیاد پر قائم ہیں، جیسا کہ بین الاقوامی تنظیم ''اقوامِ متحدہ'' ''عالمی عدالتِ انصاف'' ''عالمی مالیاتی فنڈ'' ''عالمی بنک'' اسی طرح علاقائی تنظیمیں جیسا کہ عرب لیگ وغیرہ۔